وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ (الانفال ۶۰)

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

نبیِ اکرم ﷺ بحیثیت سپہ سالار

سیرتِ نبویؐ کا جہادی پہلو



تالیف:

فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ

مکتبہ السلام

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (الانفال ۸/۶۰)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سپہ سالار

تالیف:
فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ

مکتبۃ السلام سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

نام کتاب .... نبی اکرم ﷺ بحیثیت سپہ سالار

زیر سرپرستی .... ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی

طبع دوم .... جون 2010ء

کمپوزنگ .... قائم گرافکس حبیب پارک منصورہ لاہور

تعداد 1100

طابع .... ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمٰن کیلانی

.... انجینئر حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی

زیر اہتمام .... پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی

قیمت .... -/150 روپے

ناشر:

مکتبة السّلام

گلی نمبر 20 دارالسلام وسن پورہ لاہور

فون: 37844157 - 0321-8869902

ڈسٹری بیوٹرز



دارُالسّلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

36۔لوئر مال سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 7240024 - 7232400 فیکس: 7354072

غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703

فہرست



پیش لفظ

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر آج تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ آدمی حیات مستعار ختم کر کے بھی اس سے مکمل طور پر استفادہ نہیں کر سکتا سیرت کے ان پہلوؤں میں سے ایک موضوع جہاد کا بھی ہے۔ یہ موضوع جتنا پرانا ہے اتنا ہی نیا بھی ہے۔ جتنا زیادہ اس پر لکھا جا چکا ہے اسی قدر یہ ابھی وضاحت کا محتاج ہے۔ دراصل جب تک یہ دنیا قائم ہے تب تک لوگوں کے لئے دین ہی نجات کا ضامن ہے اور جب تک اس دنیا کی احتیاج باقی ہے اس دین کو لانے والے پیغمبر کی سیرت بھی محتاج تفصیل رہے گی۔ کیونکہ اسوہ حسنہ پر چلنا ہی راہ نجات ہے۔ ہر لکھنے والا اپنے انداز سے لکھتا اور اپنے انداز سے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ سیرت کا فلاں فلاں پہلو نکھر کر سامنے آنا چاہئے۔

فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ اور اس پہلو پر کیوں قلم اٹھایا۔ اس بارے میں تو فاضل مصنف ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ مگر اتنا تو مجھے بھی علم ہے کہ فاضل مصنف کو جہاد اور مجاہدین سے خصوصی دلچسپی تھی۔ 1985ء میں پیرانہ سالی کے باوجود ایک قافلے کے ساتھ نورستان گئے۔ جہاں توحید و سنت کی حکمرانی ہے۔ حالانکہ ان دنوں سفر اتنا آسان نہ تھا۔ کئی گھنٹوں تک سخت سردی میں پیدل بھی چلنا پڑا۔ مگر انہوں نے ذرا بھی ہمت نہ ہاری۔ اس قافلے کے امیر بھی وہ خود ہی تھے۔ اس سفر میں مجھے بھی ان کی رفاقت کی سعادت حاصل ہے۔ اس سفر کی روئیداد انہوں نے اپنی کتاب "سفرنامہ نورستان" میں بیان کی ہے۔

آج کل ذہنی پسماندگی اور مرعوبیت اپنے عروج پر ہے۔ خواندگی کے نام پر فقط غلامی کا جو سبق پڑھایا جاتا ہے۔ اس نے اچھے اچھے مسلمان گھرانوں کا بیڑہ غرق کر رکھا ہے۔ وہ گھرانے کہ بھلے وقتوں میں اہل حدیث کی علمی و عملی قیادت جن کے ہاتھ میں تھی۔ آج کل ان کی اولادیں دین سے فقط اتنا تعلق رکھتی ہیں۔ کہ بے دین ان پر دین داری کی تہمت رکھ سکیں۔ اور وہ رواداری

اور لبرٹی کا اس بری طرح پرچار کرتے ہیں کہ ان کی کسمپرسی اور بے بسی پر محض ترس ہی کھایا جا سکتا ہے۔

جہاد کا موضوع مستشرقین کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہے۔ یورپ کا پروپیگنڈا کچھ اس طرح کا ہے کہ خواہ مخواہ اسلام کے نام لیوا اسلام کے پھیلنے پھولنے پر شرمندہ نظر آئیں۔ نعوذ باللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رحمت للعالمین نہیں بلکہ جلاد بنا کر بھیجے گئے ہوں۔ اور ہمارا جدید ذہن صفائیاں دیتا ہے۔ نہیں جی جہاد کا وہ مطلب تو نہیں جو یورپ والے بیان کرتے ہیں بلکہ جہاد تو جہد سے نکلا ہے۔ جس کا معنی ہے انتہائی کوشش یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو پھیلانے کے لئے اپنی انتہائی کوشش کی ہے جانی و مالی ہر قسم کی قربانی دی ہے۔ بس یہی جہاد ہے۔ اگر کبھی زیادہ جہاد کا پیچھا کرنا پڑ جائے۔ تو پھر جہاد کی اقسام بیان کی جاتی ہیں۔ جہاد بالنفس، بالمال اور باللسان۔ ویسے بھی افضل جہاد تو جہاد بالنفس ہی ہے۔ یعنی شیطانی خواہشات کو کچلنا، من کو مارنا اصل میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ہی تربیت دیتے رہے ہیں۔ اور اگر کبھی مجبوراً میدان جنگ میں ہونے والے جہاد یعنی قتال کے بارے بات کرنی پڑ جائے تو پھر اس قدر مجبوریاں اور معذرتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کہ جی ہم تو پھر بھی کبھی تلوار نہ اٹھاتے اگر قرآن میں حکم نہ آ جاتا۔ یہ بزدلانہ اور مرعوبانہ ذہن دراصل اپنی حالت پر مطمئن رہنا سکھاتا ہے۔ جس ذلت اور نکبت میں آج کل کا ایک ارب مسلمان گرفتار ہے۔ اس کو کاتب تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرنا سکھاتا ہے۔ اپنی موجودہ حالت کو بدلنے کی کوشش نہیں کرنے دیتا ہے۔

جہاد ایک وسیع المعنی لفظ ہے۔ امام ابن القیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں۔ جہاد کے چار مراتب ہیں۔

(۱) جہاد النفس۔ یعنی نفس کے خلاف جہاد۔

(۲) جہاد الشیطان، یعنی شیطان اور شیطانی اعمال کے خلاف جہاد۔

(۳) جہاد الکفار والمنافقین، کافروں اور منافقین کے خلاف جہاد۔

(۴) جہاد ارباب الظلم والمنکرات والبدعات، یعنی ہاتھ، زبان اور دل کے ساتھ ظلم اور بدعات کیخلاف جہاد۔

رسول ﷺ کو تورات میں نبی الملاحم والجہاد کہا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی مدنی زندگی ۲۷

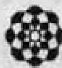
سے زائد غزوات اور تقریباً ۶۵ سرایا پر مشتمل تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کا جہاد سے کیا تعلق تھا۔ اور اسلام میں اس کی اہمیت و حیثیت بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

مصنف مرحوم جو کہ مترادفات القرآن' خلافت و جمہوریت' شریعت و طریقت' آئینہ پرویزیت' الشمس والقمر بحسبان جیسی شہرہ آفاق کتب کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اتنی تفصیل سے تمام شبہات اور اعتراضات پر بحث کی ہے کہ قاری کا ہر طرح سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ انہوں نے یہ کتاب اپنی وفات سے قبل لکھی۔ زندگی نے آپ کو مہلت نہ دی کہ وہ یہ کتاب خود چھپواتے۔ بہرحال یہ کتابیں ان کے لیے تاقیامت صدقہ جاریہ ہیں۔ مولانا نے مختصر وقت میں ایسی قابل قدر کتابیں لکھیں ہیں کہ دیکھ کر اور مطالعہ کے بعد عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ایک عدیم الفرصت آدمی نے جو ایک مدرسۃ البنات کے منتظم بھی تھے۔ کس طرح وقت نکال کر اتنی دقیق' ضخیم اور عام فہم کتب لکھیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک تفسیر قرآن ''تیسیر القرآن'' بھی ہے جو کہ چار جلدوں میں ہے۔ اور طبع ہو کر قارئین سے قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ دوران مطالعہ اگر آپ کتاب میں کوئی غلطی دیکھیں تو ضرور مطلع فرمائیں۔ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درست کی جا سکے۔ اور کتاب کے مطالعہ کے بعد مرحوم کے لئے دعائے خیر بھی ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کتب کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ (آمین)

والسلام

پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی

جامع مسجد الایمان' شاہ فرید آباد ملتان روڈ' لاہور



عرض ناشر

یہ کتاب محترم والد صاحب طبع کروانے کی کوششوں میں تھے کہ ان کے بارے اللہ تعالیٰ کا حکم آ پہنچا اور انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے اسے طبع کروایا۔ کتاب چھپ گئی تو قارئین نے کئی جگہ غلطیوں کے بارے مطلع کیا۔ اب جبکہ کتاب دوبارہ چھپوانے کا مرحلہ تھا تو میں نے سوچا کیوں نہ کتاب کی جدید انداز میں کمپوزنگ کروائی جائے۔ اب اس کی اغلاط بھی ممکنہ حد تک درست کر دی گئی ہیں۔ اس کا ٹائٹل بھی نیا بنوایا گیا ہے۔ اب یہ کتاب ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے امید ہے اب قارئین کو پسند آئے گی۔ آپ کی آراء وتجاویز کا انتظار رہے گا۔

والسلام

پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی

جامع مسجد الایمان' شاہ فرید آباد ملتان روڈ لاہور

محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

باب اوّل

جہاد اور اس کی غرض و غایت

جہاد کا لفظ جہد "بمعنی کوشش کرنا" سے مشتق ہے۔ جہاد کے لغوی معنی کسی کام میں اپنی انتہائی کوشش کرنا ہے۔ شرعی اصطلاح میں یہ لفظ خود کو برے کاموں سے بچنے اور دوسروں کو برے کاموں سے روکنے کے لئے سعی بلیغ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

برے کاموں یا ظلم و فساد سے بچنے اور دوسروں کو روکنے کی یہ کوشش انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی بھی۔ اس لحاظ سے جہاد کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کی گئی ہیں:۔

انفرادی جہاد کی قسمیں

انفرادی جہاد کو ہم پر امن ذریعہ تبلیغ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں:۔

جہاد بالنفس یا جہاد بالقلب:

جہاد کا دائرہ عمل سب سے پہلے انسان کی اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ اپنی ذات کی اصلاح یا اپنی خواہشات کو احکام و رضائے الٰہی کے تابع بنا دینے کے لئے جو کوشش کی جائے اسے جہاد بالقلب یا جہاد بالنفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ارشاد باری ہے:۔

﴿ارءيت من اتخذ الهه هواه﴾ (۲۵:۴۳) کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے خواہشات نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

گویا احکام خداوندی کے مقابلہ میں اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے لگ جانے کو اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ.)) (مشکوۃ کتاب الایمان) — اور مجاہد وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔

اس حدیث میں فی طاعۃ اللہ کے الفاظ اس گمان باطل کو رد کرنے کے لئے کافی ہیں۔ کیونکہ ان کے ریاضت ومجاہدہ میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو صریحاً کتاب وسنت کے منافی ہیں۔ مثلاً ترک نکاح، چلے کاٹنا اور اپنے جسم کی تعذیب اور اسے مختلف طریقوں سے مضمحل کر کے کمزور بنانا وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ایسے کام مجاہدہ نفس نہیں بلکہ نفس کشی ہوتی ہے۔ اور فی طاعۃ اللہ کی بجائے فی معصیۃ اللہ ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اسلامی نقطہ نگاہ سے ان چیزوں کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ بعض صوفیہ اسی ''جہاد بالنفس یا جہاد بالقلب'' پر اتنا زور دیتے ہیں کہ وہ اسے ''جہاد اکبر'' قرار دیتے ہیں ہمیں اس نظریہ سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ مندرجہ حدیث محض اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس میں جہاد کے اس ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تاہم جہاد بالنفس کی بنیادی اہمیت سے نہ کسی کو انکار ہے نہ اختلاف کی گنجائش۔

جہاد باللسان:

پھر جب انسان خود کو رضائے الٰہی کے تابع بنا لیتا ہے تو اسے برے کاموں اور ظلم و عصیان سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے حتیٰ کہ وہ دوسروں کو برے یا خلاف شریعت کام کرتے دیکھ نہیں سکتا اور یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہوتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو بھی ہر قیمت پر ایسے برے کاموں سے روک دے۔ اسی کیفیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا:۔

((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ۔)) (مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب کون النہی عن المنکر) — تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتا تو زبان سے روکے اور ایسا بھی نہیں کر سکتا تو دل سے (ہی برا جانے) اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

پھر جوں جوں اس کا ایمان پختہ تر ہوتا جاتا ہے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ کسی سرکش قوت کے سامنے حق بات کہنے سے نہیں چوکتا جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:۔

((اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ الْحَقِّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔)) — کسی ظالم قوت کے سامنے سچی بات کہہ دینا افضل الجہاد ہے۔

کسی ظالم قوت کے سامنے سچی بات کہہ دینا افضل الجہاد ہے۔ (نسائی۔کتاب البیعۃ۔باب فضل من تکلم بالحق)

اور یہ افضل الجہاد اس لحاظ سے ہے کہ کسی ظالم قوت کے منہ پر سچی بات کہہ کر اسے ظلم سے روکنا بڑی جرأت ایمانی کا ہی کام ہو سکتا ہے اور بسا اوقات یہ کام اپنی جان پر کھیلنے کے مترادف ہوتا ہے۔

جہاد بالقرآن:

جہاد باللسان کا طریقہ صرف یہی نہیں کہ انسان کسی کو برا کام کرتے دیکھے تو اسے روکے بلکہ یہ بھی ہے کہ شریعت کے احکام اور اوامر ونواہی سے عوام الناس کو آگاہ کرتا رہے۔ قرآن میں ہے:-

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ -﴾ (۴۵:۵۰) پس جو کوئی ہمارے (عذاب کے) وعید سے ڈرے اسے قرآن سے نصیحت کرتے رہو۔

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:-

((بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً -)) (بخاری کتاب بدء الخلق۔باب ماذکر عن اسرائیل) خواہ تم نے مجھ سے ایک آیت ہی سیکھی ہو تو اسے بھی دوسروں تک پہنچاؤ۔

بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ انفرادی جہاد پرامن ذریعہ تبلیغ خواہ کتنے ہی بہتر طریقہ سے سرانجام دیا جائے۔ جب مخاطب کے نظریات وعقائد سے ٹکراتا ہے۔ تو وہ اسے وقار کا مسئلہ بنا کر مخالفت پر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور مبلغ کے درپے آزار ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو مکی زندگی میں ایسے ہی مخالفین سے پالا پڑا تھا۔ جنہوں نے حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکاروں پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھائے۔ اور بالآخر انہیں اپنا گھر بار چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور خود ان صحابہ کرام کی جائیدادوں پر غاصبانہ قبضہ بھی کر لیا۔ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو پھر اپنے جان ومال کی حفاظت میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ گویا جب پرامن ذریعہ تبلیغ موثر ثابت نہ ہو تو متشددانہ طریقہ بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جسے عرف عام میں جہاد بالسیف اور شرعی اصطلاح میں جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔

جہاد بالقلم:

معاشرے میں بگاڑ اور بدکرداری کا سلسلہ صرف عملی طور پر واقع نہیں ہوا کرتا' بسا اوقات اس میں ایسے عقائد ونظریات بھی حلول کر جاتے ہیں۔ جو اسلام کے عقائد ونظریات سے یا تو مختلف ہوتے ہیں یا متصادم۔ اس صورت حال میں اہل علم اور اہل قلم حضرات کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ قلم کے ذریعہ غیر شرعی عقائد ونظریات کا دلائل و براہین کے ذریعہ ابطال پیش کر کے اسلام کی حقانیت کو ثابت کریں۔ اور اسلامی نظریات کا دفاع کر کے انہیں اس میدان میں شکست دیں۔ جہاد کی یہ قسم بھی گو جہاد بالقرآن میں شامل ہے۔ تاہم اس کا دائرہ جہاد باللسان سے وسیع تر ہے۔ کیونکہ معاشرہ میں بے عملی' بدکرداری اور فساد کی عام فضا کا پیش خیمہ عموماً یہی باطل نظریات ہوا کرتے ہیں۔ ایسے ہی مواقع کے لئے قرآن کریم نے کہیں تو یہ فرمایا:۔

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ﴾ (۹۶:۲۳)
اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔

اور کہیں فرمایا:۔

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔﴾ (۱۲۵:۱۶)
(اے پیغمبر ﷺ!) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے رب کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انداز تقریر وتحریر ہٹ دھرمی اور کج بحثی کے طور پر نہیں بلکہ مدافعانہ اور تفہیمانہ ہونا چاہئے۔ اور اپنے نظریات کو بہتر طور پر یعنی دلائل و براہین سے پیش کرنا چاہئے۔

جہاد بالمال:

یہ تو ظاہر ہے کہ جہاد بالقرآن اور بالخصوص جہاد بالقلم کے لئے بھی سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیونکہ اگر اس کام کو کاروباری ذہن کے تحت سرانجام دیا جائے تو اس کا دائرہ انتہائی محدود ہو جاتا ہے۔ اندریں صورت یہ ایک پاکیزہ کاروبار تو سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے جہاد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ جہاد اسی صورت میں ہوگا جبکہ نفع ونقصان سے بے نیاز ہو کر اعلائے کلمۃ الحق کے لئے یہ فریضہ سرانجام دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں جہاد بالنفس کا ذکر آیا

ہے تو ساتھ ہی جہاد بالمال کا ذکر بھی آیا ہے۔

اجتماعی جہاد اور اس کی اہمیت

جہاد بالسیف اور اس کی ضرورت:

پھر کبھی ایسا بھی وقت آ جاتا ہے۔ کہ معاشرہ میں بگاڑ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ جہاد کی انفرادی کوششیں اس بگاڑ کو درست کرنے کے سلسلہ میں غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ سمجھنے سمجھانے کی تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ اور بقول شاعر

وَفِی الشَّرِّ نَجَاتٌ حِیْنَ لَا یُنْجِیْکَ اِحْسَانٌ

''اور جب بھلائی سے کام نہ چلے تو لڑائی کے ذریعہ نجات حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔''

انسان فطرتاً جنگ جو اور لڑائی پسند پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ امن اور صلح کا خواہاں ہوتا ہے۔ اور اسلام بھی چونکہ فطری مذہب ہے لہذا اپنی اصلیت کے لحاظ سے جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے...... امن پسند اور صلح جو واقع ہوا ہے۔ مگر جب معاشرہ میں فتنہ وفساد کا دور دورہ ہو تو اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے ایسے سرکش لوگوں سے ٹکر لینا ہی پڑتی ہے۔ بالفاظ دیگر مسلمان کو یہ ناگوار فریضہ اس لئے سرانجام دینا پڑتا ہے کہ دنیا میں پھیلا ہوا فساد ختم ہو کر امن وآشتی کی فضا پیدا ہو۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ وَعَسٰۤی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ﴾ (۲:۲۱۶)

تم پر جنگ فرض کی گئی ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو لیکن وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ انسان کو یا کسی دوسرے جاندار کو زخم لگانا اور اسے چیر پھاڑ کر رکھ دینا کسی درندہ صفت انسان کا کام ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہی جراحی کا عمل جب ایک ڈاکٹر کسی ایسے پھوڑے پر کرتا ہے۔ جس کا زہر تمام جسم میں پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تو ڈاکٹر کی یہی چیر پھاڑ اور فاسد گوشت کو کاٹ کر جسم سے الگ پھینک دینے کا عمل شفقت، رحم دلی اور ہمدردی پر محمول سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے اس عمل سے مریض کی زندگی بچ جاتی ہے۔ اسلام میں ایسے ہی ناگزیر

حالات کے لئے جنگ فرض قرار دی گئی ہے۔

اس کی دوسری مثال یوں سمجھیے کہ ہر ملک میں فتنہ اور قتل وغارت کو ختم کرنے کے لئے عدالتیں قائم کی جاتی ہیں۔ یہ عدالتیں مجرموں کو قتل' قید' جرمانہ' بدنی سزا' غرض ہر طرح کی سزائیں دیتی ہیں۔ گویا وہ مجرموں کو اس لئے قتل کرتی ہیں کہ ملک سے قتل وغارت ختم ہو۔ عدالتوں کے اس طرز عمل کو ظلم نہیں بلکہ عدل کا نام دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کا یا عدالت کا یہ طرز عمل بہر حال انفرادی قسم کے فتنہ اور ظلم کا علاج تو ہے مگر پورے معاشرہ کے بگاڑ کا علاج عدالتوں کے بس کا روگ نہیں۔ اندریں صورت حال فتنہ وفساد کے خاتمہ کی صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ فتنہ وفساد کے اساطین کو قوت سے کچل دیا جائے۔ قرآن حکیم نے اس فتنہ وفساد کا یہی علاج تجویز فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ (۲:۱۹۳) اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے۔

اور اسی ناگزیر ضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

﴿يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ﴾ (۸:۶۵) اے نبی مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو۔

طریق کار:

اندریں صورت ایک مصلح کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے پیش نظر اپنے ساتھ معاشرہ میں سے ان افراد کو اپنے ساتھ ملاتا ہے جو عقائد ونظریات میں اس سے متفق ہوتے ہیں۔ پھر یہ جماعت اجتماعی شکل میں باطل قوتوں سے بھڑ جاتی ہے۔ ایسی جنگ اگر دنیوی اغراض و مقاصد کے تحت لڑی جائے تو اسے قتال یا جنگ کہتے ہیں۔ اور اگر اس سے مقصد دنیا سے فتنہ وفساد کو ختم کرنا ہو۔ جسے شرعی زبان میں اعلائے کلمۃ الحق یا ''اللہ تعالیٰ کے حکم کا بول بالا کرنا'' کہتے ہیں۔ تو اسے جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔

جہاد اور قتال کا فرق:

مندرجہ بالا تصریحات سے درج ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) جہاد فی سبیل اللہ کی بہت سی اقسام پر انفرادی طور پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اس میں دامے درمے سخنے حصہ لیتا رہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا ایمان ہی مشکوک ہوتا ہے۔ جبکہ قتال فی سبیل اللہ صرف اجتماعی شکل میں ہوتا ہے۔

(۲) جہاد فی سبیل اللہ وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ قتال فی سبیل اللہ اس کی ایک آخری شکل ہے اور محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے قرآن کریم نے بھی ان دونوں الفاظ کو الگ الگ مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

(۳) ''جہاد'' صرف فی سبیل اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ جبکہ قتال فی سبیل اللہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور دنیوی اغراض و مقاصد کے ماتحت بھی۔ قتال دنیوی اغراض کے ماتحت ہو تو اس صورت میں یہ قتال فی سبیل اللہ نہیں ہوگا۔ خواہ لڑنے والے دونوں فریق مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔

جہاد بالسیف کی فضیلت:

گو جہاد کی سب اقسام اپنے اپنے مقام پر بنیادی اہمیت کی حامل ہیں تاہم جو فضیلت جہاد بالسیف کو حاصل ہے وہ دوسری کسی قسم کو نہیں۔ کیونکہ اس میں انسان کو جان، مال اور وقت ہر چیز کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ مزید برآں عسکری تنظیم اس کے نتائج کو مفید تر بنانے کا موثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:۔

﴿لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (۹۵:۴)

((جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھنے والے ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے وہ اور جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ مال اور جان سے جہاد والوں کو بیٹھنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے درجے میں فضیلت بخشی ہے اور گو نیک وعدہ سب کے لئے لیکن اجر عظیم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں زیادہ فضیلت بخشی ہے۔))

آیت بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

(۱) جہاد کی تمام تر انفرادی کوششیں "قاعدین" کے زمرہ میں آتی ہیں۔

(۲) ان انفرادی کوششیں کرنے والوں (قاعدین) اور قتال فی سبیل اللہ میں جان و مال سے حصہ لینے والوں (مجاہدین) سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے اچھا وعدہ کر رکھا ہے۔

(۳) تاہم مجاہدین کو ان کے اجر عظیم کی وجہ سے قاعدین پر کہیں زیادہ فضیلت ہے اور یہی بات اس ایک آیت میں تین بار دہرائی گئی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

((قِيلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰه! اَىُّ النَّاسِ اَفْضَلُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ"۔))

(رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ "لوگوں میں کون شخص سب سے افضل ہے۔ آپ نے فرمایا "وہ مومن جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرے"۔)

(بخاری کتاب الجہاد والسیر - باب افضل الناس مومن یجاهد بنفسه و ماله فی سبیل الله)

ایک دوسرے مقام پر حضور اکرم ﷺ نے اپنی ذات سے متعلق فرمایا:۔

((وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُّ اَنِّىْ اُقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ۔)) (بخاری کتاب الجہاد والسیر - باب تمنی الشهادة)

(قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں مارہ جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں۔)

مندرجہ بالا حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے تین بار شہادت کی آرزو کو دہرا کر سب اعمال پر اس کی فضیلت کا مکمل ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا:۔

﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ﴾ (بخاری کتاب الجهاد والسیر - باب الجنة تحت بارقة السیوف)

((لوگو! جان رکھو کہ بہشت تلواروں کے سائے تلے ہے۔))

اس حدیث میں جہاد اور بہشت کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جو کوئی جہاد کرے

گا ضرور بہشت میں جائے گا۔ آج کے دور میں تلوار سے مراد ہر وہ اسلحہ لیا جائے گا جو موجودہ جنگوں میں استعمال ہوتا ہے۔

جہاد بالسیف کی فضیلت کی وجہ:

ہر ذی حیات میں ''تحفظ خویش'' کا جذبہ فطری طور پر ودیعت کیا گیا ہے۔ گویا جان ہی وہ متاع عزیز ہے جسے انسان اور اسی طرح ہر حیوان ہر قیمت پر بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ تو جو شخص اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتا اس کی نجات اور جنت کے حصول میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے؟

جہاد بالمال کی اہمیت:•

جان سے دوسرے درجہ پر مال کی باری آتی ہے۔ مال ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی ذات کے لئے سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ اور بسا اوقات مال اس کی جان کے تحفظ کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے پھر کچھ لوگ حصول زر کے معاملہ میں ایسے حریص واقع ہوتے ہیں کہ وہ اس کے لئے اپنی جان تک نثار کر دیتے ہیں۔ گویا انسان کے لئے سب سے قیمتی متاع یہی دو چیزیں ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کا مسلمان سے مطالبہ کیا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں تو ''جان'' کا لفظ ''مال'' سے پہلے استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (۹:۱۱۱)

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں۔ اور اس کے عوض ان کے لئے بہشت تیار کی ہے۔

اور بہت سے مقامات پر مال کا لفظ جان سے بھی پہلے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر ''جہاد بالسیف کی فضیلت'' کے عنوان کے تحت درج شدہ آیت میں دوبار مال کا لفظ نفس سے پہلے استعمال ہوا ہے۔ نیز قرآن کریم میں اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

مال کا لفظ جان سے بھی پہلے استعمال کرنے کی بھی چند وجوہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) بعض لوگوں کے نزدیک جان کی قیمت مال سے کم تر ہوتی ہے۔ اور وہ حصول زر کے لئے اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے۔

(۲) مال سے جہاد ہر وقت اور کئی صورتوں میں ہو سکتا ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ جبکہ

جان کا جہاد صرف قتال فی سبیل اللہ کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ جو امام وقت کے اعلان اور اس کی ماتحتی میں ہی ہو سکتا ہے۔

(۳) اللہ کی راہ میں اپنی جان پیش کر دینا بھی (جو دراصل جہاد بالنفس یا اصلاح خویش ہی کی آخری اور ترقی یافتہ شکل ہے) مال کی قربانی کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ اسلحہ کے حصول اور زادِ سفر کے لئے مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر قتال فی سبیل اللہ کا تصور ناممکن ہے۔

(۴) بعض مجبور اور معذور لوگ جہاد بالسیف میں عملاً حصہ نہیں لے سکتے۔ لیکن وہ مالی تعاون کر سکتے ہیں پھر بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جان تو پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن مالی ضروریات کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور مالی تعاون کرنے والوں کی امداد اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا مالی تعاون بھی جہاد میں بالفعل شامل ہونے کا درجہ رکھتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:۔

((مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَقَدْ غَزَا وَمَنْ خَلَّفَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِخَيْرٍ فَقَدْ غَزَا۔)) (بخاری، کتاب الجہاد والسیر ۔ باب فضل من جهز غازيا)

جو کوئی جہاد کے لئے کسی غازی کو سامان مہیا کرے تو گویا اس نے خود جہاد کیا (اسے اتنا ہی ثواب ملے گا) اور جس نے غازی کے گھر کی اس کے بعد خبر رکھی اس نے بھی گویا خود جہاد کیا۔

انہی وجوہات کی بنا پر قرآن کریم اور احادیث میں جہاں کہیں بھی جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر آیا ہے۔ تو جان و مال کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ اور چونکہ یہی چیزیں انسان کے نزدیک سب سے قیمتی متاع ہیں۔ لہذا جہاد بالسیف کی باقی تمام اعمال پر فضیلت ثابت ہو جاتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کیا ہے؟

گو جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ قتال فی سبیل اللہ سے زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم اور احادیث میں بیشتر مقامات پر جہاد فی سبیل اللہ سے اس کی سب سے اہم قسم قتال فی سبیل اللہ ہی مراد لی گئی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیت و احادیث سے بھی واضح ہے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کی تعریف کیا ہے؟ یہی بات آپ ﷺ

سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھی تھی جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:۔

((جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ يُرٰى مَكَانَهُ فَمَنْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (بخاری کتاب الجہاد والسیر - باب من قاتل لتكون كلمة الله هی العليا)

(ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ: کوئی لوٹ کے لئے لڑتا ہے، کوئی ناموری کے لئے اور کوئی اپنی بہادری جتلانے کو لڑتا ہے۔ تو ان میں کون اللہ کی راہ میں لڑتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جو کوئی اس نیت سے لڑے کہ اس سے اللہ کا بول بالا ہو وہ اللہ کی راہ میں لڑتا ہے۔)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عوام الناس میں لڑائی میں شرکت کے لئے مندرجہ ذیل تین قسم کے محرکات ہوتے ہیں:۔

(۱) بعض لوگ اس لئے لڑتے ہیں کہ لوٹ مار سے مال ہاتھ آئے گا۔ اموال غنیمت یا دوسرے دنیوی مفادات حاصل ہوں گے۔

(۲) کچھ اس وجہ سے لڑتے ہیں۔ کہ ان کا نام تاریخ میں ثبت ہوگا۔

(۳) اور کچھ اس لئے کہ لوگ ان کے بہادری کے کارنامے فخریہ طور پر بیان کیا کریں گے۔

مندرجہ بالا حدیث کے راوی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہی سے ایک دوسری روایت یوں ہے:۔

((جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ! يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! مَاالْقِتَالُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ وَ اِنَّ اَحَدَنَا يُقَاتِلُ غَضَبًا وَ يُقَاتِلُ حَمِيَّةً فَرَفَعَ اِلَيْهِ رَأْسَهُ فَقَالَ: "مَنْ قَتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.)) (مسلم۔ کتاب الجہاد۔ باب من قاتل لتكون كلمة الله هی العليا)

(ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "اے اللہ کے رسول ﷺ! قتال فی سبیل اللہ کیا ہے؟ ہم میں سے کوئی شخص جوش غضب میں لڑتا ہے اور کوئی حمیت قومی کی بنا پر"۔ آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا۔ "جو شخص اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے لڑتا ہے اسی کی جنگ اللہ کی راہ میں ہے"۔)

اس حدیث سے لڑائی کے دو اور محرک سامنے آ گئے:۔

(۱) کچھ لوگ اپنے کسی خون یا پہلی شکست کا بدلہ لینے کے لئے انتقام کے طور پر لڑتے ہیں۔

اور کچھ لوگ اپنے وطن، قوم یا قبیلہ کی حمایت میں جنگ کرتے ہیں۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کی متمدن دنیا میں بھی انسان کی ذہنی سطح اس مقام سے ذرہ بھر بھی بلند نہیں ہو سکی۔ صرف انداز و اطوار ہی بدلے ہیں۔ مقاصد میں انہی مندرجہ بالا باتوں میں سے کوئی ایک بات نظر آئے گی۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ان سب مقاصد کے علاوہ ایک بالاتر مقصد کا پتہ دیا اور فرمایا۔ کہ جہاد فی سبیل اللہ صرف وہ کہلا سکتا ہے جو محض اعلائے کلمۃ الحق یا اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے لڑا جائے۔ بالفاظ دیگر دنیا سے فتنہ و فساد ختم کر کے اسے احکام و فرامین الٰہی کے سامنے جھکا دینے کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے جس میں انسان کی اپنی کسی ذاتی خواہش کا ذرہ بھر بھی دخل نہ ہونا چاہئے۔

جنگ کے متعلق یہ تصور دنیا بھر کے لئے ایک انوکھا تصور تھا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام ؓ بھی ابتدا میں اس تصور جہاد پر بہت متعجب ہوئے۔ ایک شخص نے حاضر ہو کر پوچھا۔ یا رسول اللہ! جو شخص مالی فائدے یا ناموری کے لئے جنگ کرتا ہے اسے کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "لَاشَیْءَ لَہٗ"۔ یعنی ایسے شخص کو کچھ نہیں ملے گا"۔ سائل اس سوال پر بہت متعجب ہوا۔ آ کر دوبارہ یہی سوال کیا۔ حضورؐ نے دوبارہ یہی جواب دیا۔ اس کا اطمینان اب بھی نہ ہوا۔ سہ بارہ اور چوبارہ پلٹ کر آیا اور یہی سوال کرتا رہا۔ حضور ﷺ نے اس کے تعجب کی وجہ کو بھانپ کر فرمایا:-

((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا کَانَ لَہٗ خَالِصاً وَّابْتُغِیَ بِہٖ وَجْھُہٗ ـ)) (نسائی۔ کتاب الجہاد۔ باب من غزا یلتمس الاجر)

(اللہ کوئی عمل اس وقت قبول نہیں کرتا جب تک وہ خاص اس کی خوشنودی اور رضا کے لئے نہ کیا جائے۔)

جہاد فی سبیل اللہ ایک دائمی ضرورت:

جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے۔ امن کے ساتھ جنگ کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ جہاں کہیں انسانوں کے مفادات آپس میں ٹکراتے ہیں تو ان میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

پھر یہ سلسلہ قبائل اور ملکوں تک وسیع ہوتا ہے۔ کوئی نسلی تفاخر کی بنا پر جنگ میں کود پڑتا ہے۔ کوئی ہوس ملک گیری کی تسکین کے لئے جنگ کرتا ہے۔ اور کسی کو فاتح اعظم بننے کی خواہش اس میدان میں لے آتی ہے۔ بہر حال یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اور اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

بعنیہ یہی صورتحال حق و باطل کی آویزش کی بھی ہے۔ حضرت آدمؑ کی پیدائش کے ساتھ ہی شیطان کی ان سے ٹھن گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اور آئندہ یہ سلسلہ لگاتار جاری رہا تا آنکہ حضور اکرم ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی۔ دوسری طرف شیطان اور اس کی ذریت اسی وقت سے آدمؑ اور اس کی اولاد کو حق سے بہکا دینے میں پوری قوت سے سرگرم عمل ہے۔ اور یہ آویزش آج تک جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔ لہٰذا جہاد فی سبیل اللہ کی ضرورت بھی تا ابد باقی رہے گی اگرچہ انبیاء کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

((لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّ نِيَّةٌ وَ اِنِ اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا—)) (بخاری. کتاب الجہاد والسیر — باب فضل الجہاد والسیر)

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت (فرض) نہیں رہی۔ البتہ جہاد کرنا اور اس کی نیت رکھنا باقی ہے۔ تو جب تمہیں (جہاد کے لئے) بلایا جائے تو نکل کھڑے ہو۔)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ آج قتال فی سبیل اللہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ انسان کی ذہنی سطح کافی بلند ہو چکی ہے۔ لہٰذا جہاد بالقلم کے ذریعہ ذہنی تبدیلی لانے سے ہی فتنہ وفساد کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ ہم اس خیال سے قطعاً اتفاق نہیں رکھتے اور نہ ہی سر دست اس بحث میں الجھنا چاہتے ہیں۔ البتہ قارئین کی توجہ اس بات کی طرف ضرور مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ کہ حدیث بالا میں استنفرتم۔ اور فانفروا کے الفاظ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ قتال فی سبیل اللہ بھی جہاد کی دوسری اقسام کی طرح باقی رہے گا اور اسے رہنا بھی چاہئے۔

جہاد فی سبیل اللہ نبی نوع انسان کی سب سے بڑی خدمت ہے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاد فی سبیل اللہ کی ضرورت اور غرض وغایت کو بہت سے مقامات پر واضح طور پر بیان فرمایا۔

مثلاً ایک جگہ فرمایا:۔

﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ ۔﴾ (۲۵۱:۲)

(اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے نہ ہٹاتا رہتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔)

ایک اور مقام پر فرمایا:۔

﴿اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ ۔﴾ (۷۳:۸)

(اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑا فساد مچے گا۔)

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۔﴾ (۴۰:۲۲)

(اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو (راہبوں کے) صوامع، (عیسائیوں کے) گرجے، (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مساجد جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ گرائی جا چکی ہوتیں۔ اور اللہ اس کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتا ہے۔)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا فلسفہ یہ بیان فرمایا ہے کہ جب کوئی قوم ظلم و فساد میں تجاوز کر جاتی ہے تو اللہ اس پر کسی دوسری قوم کو مسلط کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو زمین فتنہ و فساد سے بھر جاتی اور شریف لوگوں کی زندگی وبال جان بن جاتی، مسجدیں اور دوسرے عبادت خانے مسمار کر دیئے جاتے۔ اللہ تعالیٰ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کے کمزور بندوں پر مسلسل ظلم و ستم ڈھائے جاتے رہیں۔ ان کے امن و چین پر ڈاکے پڑتے رہیں۔ طاقتور کمزوروں کو کھا جائیں۔ ظلم و بے انصافی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہے۔ لہٰذا جو لوگ اس اجتماعی فتنہ و فساد کے خلاف، اپنی کسی ذاتی غرض و لالچ کے بغیر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہی لوگ دراصل انسانیت کے سب سے بڑے محسن[1] ہوتے ہیں۔

---

[1] نبوت سے پہلے بھی حضور اکرم ﷺ کی طبیعت میں یہ بات داخل تھی کہ کسی شخص پر ظلم ہوتے دیکھ کر برداشت نہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی نبوت سے چند سال پیشتر 'حرب فجار' کے بعد چند دردمند اشخاص یعنی ہاشم زہرہ اور تیم عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے۔ ان میں یہ معاہدہ ہوا کہ مکہ میں کسی مظلوم کو پائیں گے تو اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوں گے۔ خواہ وہ مظلوم مکہ کا باشندہ ہو یا باہر کا۔ جس نے بھی ظلم کیا اس کا مقابلہ کریں گے یہاں تک کہ ظالم مظلوم کا حق لوٹا دے۔ (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۱)

شہید کی فضیلت:

جو مسلمان جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دیتا ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ-﴾ (۳:۱۶۹)

(جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ سمجھو کہ وہ مر گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیئے جا رہے ہیں۔)

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا:-

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ-﴾ (۲:۱۵۴)

(جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اور لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔)

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ شہید کا پہلا قطرۂ خون گرنے کے ساتھ اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور وہ سیدھا جنت میں پہنچ جاتا ہے۔

ایک دفعہ جنگ کے دوران ایک شخص رسول اللہ ﷺ سے پوچھنے لگا۔ اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو سیدھا جنت میں جاؤں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''بلا شک'' وہ کھجوریں کھا رہا تھا۔ اس نے کھجوریں پھینک دیں اور کہنے لگا اب میں کھجوریں بھی جنت میں ہی جا کر کھاؤں گا۔ یہ کہا اور لڑتے لڑتے اللہ کی راہ میں جان دے دی۔

(بخاری کتاب المغازی۔باب غزوۃ احد۔مسلم کتاب الجہاد۔باب ثبوت الجنۃ للشہید)

شہید کا خون قوم کی زندگی کے لئے آب حیات ثابت ہوتا ہے اور اگر یہ خالصتاً اللہ کی خوشنودی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہو تو پھر اس کے مرتبہ و مقام کے کیا ہی کہنے۔ مگر جب اس شہادت جیسے عمل میں بھی کوئی اور غرض شامل ہو جائے تو قوم کے لئے تو شاید آب حیات ثابت ہو مگر اللہ کے ہاں اس کی کچھ فضیلت نہیں صحیح مسلم میں مروی ہے کہ:-

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! ''میں ابن جدعان کے گھر جس حلف میں شریک ہوا مجھے یہ پسند نہیں کہ سرخ اونٹ کے بدلے اس سے دستبردار ہو جاؤں۔'' (حوالہ ایضاً)

آپ ﷺ فخر یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اس معاہدہ میں شریک ہوا تھا۔ اور نیز یہ بھی کہ اگر آج بھی مجھے کوئی ایسے معاہدہ میں شریک ہونے کو کہے تو میں تیار ہوں۔

قیامت کے دن تین شخص شہید، عالم اور سخی پیش کیے جائیں گے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ شہید سے پوچھیں گے کہ ''بتاؤ میں نے تمہیں زندگی، صحت اور طاقت دی تھی تم نے میرے لئے یعنی دین کی سربلندی کے لئے کیا کام کیا؟'' وہ کہے گا: ''الٰہی! میں نے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی جان کو تیری راہ میں قربان کر دیا''۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''تم اس لئے شہید ہوئے تھے کہ لوگ تمہیں بہادر کہیں اور تمہیں ناموری حاصل ہو وہ ناموری تمہیں حاصل ہو چکی، اب میرے پاس تمہارے لئے کوئی اجر نہیں''۔

اسی طرح کے سوال وجواب عالم اور سخی سے بھی ہوں گے۔

(مسلم کتاب الجہاد- باب من قاتل للریاء والسمعة)

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ قومی مفادات پر جان دینے والے، ناموری اور شہرت کی ہوس میں مرنے والے، قوم وطن یا نسل وقبیلہ پر جان نثار کرنے والے پر لفظ شہید کا اطلاق نہیں ہوتا۔ شہید صرف وہ ہے جو تمام دنیوی اغراض سے بالاتر ہو کر فتنہ وفساد کو ختم کرنے اور اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام حیات قائم کرنے کے لئے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا ہدیہ پیش کرتا ہے۔ یہ خلوص جتنا زیادہ ہو گا اسی قدر اس کی فضیلت زیادہ اور درجات بلند ہوں گے جن میں کم سے کم درجہ عذاب دوزخ سے نجات اور جنت میں داخل ہونا ہے۔

فرضیت جہاد:

جہاد فی سبیل اللہ کے فرض ہونے میں تو کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ جہاد فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ آسان الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ جہاد آیا امت کے ہر فرد پر لازم ہے یا کچھ افراد کے جہاد میں حصہ لینے سے ساری امت اس فریضہ سے سبکدوش ہو جاتی ہے؟

جہاد کے متعلق قرآن وحدیث میں جس قدر تاکید آئی ہے اسے دیکھ کر کئی علمائے متقدمین ومتاخرین نے اسے فرض عین قرار دیا اور بعض اسے اسلام کا چھٹا رکن بھی قرار دیتے ہیں۔ جہاد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم اور آج کے دور انحطاط میں جبکہ مسلمان دنیا میں ہر جگہ ذلیل وخوار ہے اس کی اہمیت اور پروپیگنڈا پر جتنا زور اور قوت آپ چاہیں صرف کیجئے لیکن حقیقت بہرحال

حقیقت ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاد کو نہ تو اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی فرض عین۔ اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) رسول ﷺ نے فرمایا:۔

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسَۃٍ۔)) (مسلم۔ کتاب الایمان۔ بیان ارکان الاسلام) (اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔)

اگر جہاد اسلام کا چھٹا رکن ہوتو آپ اس کی تصریح فرما دیتے۔

(۲) اسلام کے ارکان کا اجتماعیت سے بھی گہرا تعلق ہے۔ تاہم وہ مخصوص حالات میں انفرادی طور پر بھی بجالائے جاسکتے ہیں۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ (یعنی جہاد بالسیف) ایک ایسا فریضہ ہے جس کا اجتماعیت کے بغیر تصور ہی ممکن نہیں۔ جہاد صرف امام کے تحت ہوسکتا ہے انفرادی طور پر بجا نہیں لایا جاسکتا۔

(۳) جہاد فی سبیل اللہ میں شمولیت کی ایک شرط والدین کی اجازت بھی ہے (جیسا کہ آئندہ تفصیل آئے گی) والدین بوڑھے اور خدمت کے محتاج ہوں تو اولاد کا یہی جہاد ہے کہ وہ ان کی ہر طرح سے خدمت کرے۔ مالی کمزوری بھی جہاد کی فرضیت کو ساقط کر دیتی ہے۔ بوڑھے، بچے، معذور، بیمار اور عورت کو جہاد کی ذمہ داری سے ویسے ہی سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد فرض عین نہیں ہوسکتا۔

(۴) کسی ماہر حرب کا مقولہ ہے کہ ایک شخص کو محاذ پر بھیجنے میں آٹھ مختلف قسم کے آدمیوں کا حصہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اسلحہ تیار کرتے ہیں، کچھ لباس اور خوراک مہیا کرتے ہیں اور کچھ مالی تعاون کرتے ہیں، پھر جتنی فوج محاذ پر روانہ کی گئی ہو اس کے لگ بھگ وطن میں موجود رہنا بھی ضروری ہے تاکہ مرکز کمزور ہو کر دشمن کی نظروں میں نہ آ جائے۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ امت کے وہ افراد جو فی الواقع لڑنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ بھی پورے کے پورے جہاد میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً۔﴾ (۹:۱۲۲) اور مومنوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔

اب ہم دوسری طرف آتے ہیں جس طرح بعض علماء و فقہاء نے جہاد کو اس کے اصل مقام سے بڑھا کر اسے اسلام کا چھٹا رکن اور فرض عین قرار دینے کی کوشش کی ہے اسی طرح کچھ حضرات ایسے بھی ہیں دو جو تفریط کی طرف چلے گئے اور انہوں نے جہاد کے درجہ کو اتنا پست کیا کہ جہاد بالسیف کی فرضیت کو ہی ختم کر ڈالا۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اگر جہاد کا وسیع مفہوم یعنی ''سعی بلیغ'' پیش نظر رکھا جائے تو اس سے لازماً رزم و پیکار کے معنی نہیں نکلتے اس لئے کہ اللہ کی راہ میں سعی بلیغ پر امن ذرائع سے بھی ہو سکتی ہے اور تلوار کے ذریعہ بھی۔ دیکھنا صرف یہ چاہئے کہ کس دور میں میں کونسا ذریعہ زیادہ موثر ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور نبوت کا بیشتر حصہ اس پر امن ذریعہ تبلیغ میں صرف کیا تھا، آج کا دور پروپیگنڈا کا دور ہے لہذا مسلمانوں کو تمام تر توجہ اس پہلو پر صرف کرنی چاہئے۔

ہمیں ان حضرات سے قطعاً اتفاق نہیں کیونکہ:۔

(۱) دور نبوی میں بھی پروپیگنڈا کا ایک موثر ذریعہ موجود تھا۔ آج پروپیگنڈا کے ذرائع اخبارات و رسائل، ریڈیو اور ٹی وی ہیں، اس دور میں پروپیگنڈا کے وسائل گھوم پھر کر آگ لگا دینے والے شاعر اور خطیب ہوتے تھے۔ آپ ﷺ نے فی الواقع دور نبوت کا بیشتر حصہ پر امن تبلیغ میں نہیں بلکہ ظلم و ستم برداشت کر کے تبلیغ کرنے میں صرف کیا۔ آپ خود بھی افصح العرب والعجم تھے اور آپ ﷺ کو ایسے ساتھی بھی میسر آ گئے تھے لیکن ان سب باتوں اور مراحل کے بعد بھی تلوار کے ذریعہ تبلیغ کی ضرورت باقی رہی۔

(۲) قرآن کریم اور احادیث میں جہاد کی اہمیت و فرضیت پر جتنا زور دیا گیا ہے ان کی موجودگی میں ایک سلیم العقل انسان یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جہاد بالسیف کسی وقت ساقط بھی ہو سکتا ہے اور کئی احادیث صحیحہ میں یہ وضاحت بھی موجود ہے جہاد تا قیامت باقی ہے جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

ہمارے خیال میں جہاد بالسیف سے فرار کا ذہن مسلمانوں کے دور انحطاط کی پیداوار ہے۔ غلامی کا طویل دور انسان میں جبن اور بزدلی پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اب اسے جہاد سے نفرت ہونے لگی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکال کر لائے۔ پھر جہاد کیلئے کہا تو ان میں بزدلی اس قدر گھر کر چکی تھی کہ کہنے لگے: ''موسیٰ! وہاں کے لوگ بڑے طاقتور

ہیں۔ ہم کیسے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تم اور تمہارا خدا جا کر ان سے لڑو ہم تو بس یہیں بیٹھیں گے"۔ بعینہ یہی ذہنی کیفیت ہمارے ان دوستوں کی ہے۔

جہاد بالسیف سے ان لوگوں کے انکار کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مستشرقین نے سارا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا تھا تو ہمارے مغرب زدہ دوستوں نے معذرت خواہانہ روش اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی اور آئندہ کے لئے جہاد بالسیف کا نام لینے سے بھی کانوں کو ہاتھ لگایا۔

ہندوستان میں انگریز مسلمانوں کی جہاد کی تحریک سے بہت خائف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک تو مسلمانوں میں تفرقہ ڈال دیا جائے دوسرے ان سے جہاد کی روح کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے۔ انہیں ایام میں مرزا غلام احمد قادیانی نے نیا نیا نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس سے نبی کی ذات میں انگریز کو اپنی آرزو پوری ہوتی نظر آنے لگی چنانچہ انگریز نے مرزائیوں پر اپنی نوازشات کی بارش کر دی۔ مرزائیوں کو حکومت میں اعلیٰ مناصب عطا کئے گئے اور انہیں ہر طرح کی مراعات دیں جن کے خود مرزا غلام احمد دل و جان سے معترف تھے۔ مرزا صاحب نے انگریز بہادر کی نوازشات کا حق یوں ادا کیا کہ ایک تو دوسرے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر تفرقہ بازی اور انتشار کا سبب بنا دیا دوسرے جہاد جس کی فضیلت و اہمیت سے کتاب و سنت بھرے پڑے ہیں اس کو منسوخ قرار دیتے ہوئے یوں فتویٰ دیا کہ:-

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال ۔۔۔ دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے ۔۔۔ دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد ۔۔۔ منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد
کیوں چھوڑتے ہو لوگو نبی کی حدیث کو ۔۔۔ جو چھوڑتا ہے چھوڑ دو تم اس خبیث کو

(درثمین ص ۵۳)

اس طرح اس قادیانی کی وساطت سے انگریز کے تو دونوں مقاصد پورے ہو گئے۔ مگر امت مرحومہ کے اذہان سے جہاد کی رہی سہی اہمیت کو ختم کر دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا گیا۔

جو قوم پستی کے اس مقام پر پہنچ چکی ہو کہ جہاد کا نام سنتے ہی یا لرزنے لگ جائے یا معذرت کرنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ ابھی مزید اتھاہ گہرائیوں میں گر کر دم لے گی۔ مسلمانوں پر ویسے

بھی دور انحطاط کے سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:۔

''ایک وقت آئے گا کہ تم مسلمانوں پر دوسری قومیں اس طرح پل پڑیں گی جس طرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں'' کسی نے پوچھا ''کیا ہم اس وقت تھوڑے ہوں گے؟'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں تعداد کے لحاظ سے تم بہت زیادہ ہو گے لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح ہو گی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے دل سے تمہاری ہیبت اٹھالے گا اور تمہارے دلوں میں ''وہن'' ڈال دے گا۔ کسی نے پوچھا ''وہن کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت و کراہت''۔ (تلخیص منذری ج۶ ص۱۶)

اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت پر رونق افروز ہونے کے بعد جو خطبہ دیا۔ اس کے درج ذیل الفاظ کی تاریخ نے ہر آن گواہی دی ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم میں سے کوئی جہاد نہ چھوڑے۔ جو قوم جہاد کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اللہ اسے ذلیل و خوار کر دیتا ہے''۔

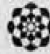
آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو خط میں لکھا تھا۔ ''جب تم دشمن سے ملو تو موت کی خواہش کرو۔ تاکہ تمہیں زندگی عطا ہو''۔

فرضیت جہاد کا دائرہ:

جن صورتوں میں جہاد فرض ہوتا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر تو آئندہ باب چہارم میں آئے گا۔ سردست یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر مسلمان کئی ممالک اور ریاستوں میں بٹ چکے ہوں تو جس ملک پر حملہ ہو جہاد محض اسی پر فرض نہیں ہوتا بلکہ ہمسایہ ممالک پر بھی اس کی ہر طرح سے امداد و استعانت فرض ہو جاتی ہے۔ البتہ اس فرضیت کے درجات مختلف ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ روس نے افغانستان میں جارحانہ مداخلت اور فوجی کارروائیاں شروع کیں تو سب سے پہلے نمبر پر جہاد افغانستان کے مسلمانوں پر فرض ہے دوسرے نمبر پر افغانستان کے ہمسایہ ملک ایران اور پاکستان پر اور اس فرضیت کا درجہ نسبتاً کم ہو گا اور تیسرے نمبر پر سب دنیا کے مسلمان ممالک پر اور اس فرضیت کا درجہ نمبر۲ سے بھی نسبتاً کم ہو گا اسی طرح اب مقبوضہ جموں و کشمیر کا مسئلہ ہے کہ وہاں کے مسلمان بھارتی مظالم کے شکار ہیں۔ ہندوؤں کے خلاف جہاد کرنا سب سے پہلے اہل کشمیر پر فرض ہے اور پھر پاکستانی مسلمانوں پر ان کا تعاون اور مدد فرض ہے، یہ فرضیت گو فرض کفایہ ہی کی

نوعیت کی ہوتی ہے لیکن فرضیت میں کوئی شک وشبہ نہیں کیونکہ ارشادِ ربانی کے مطابق دنیا بھر کے مسلمان سب ایک امت ہے اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں، اگر ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم کرب و بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔
(مسلم۔ کتاب البر والصلۃ۔ باب تراحم المومنین)

افسوس ہے کہ آج کا مسلمان اس پہلو سے انتہائی غفلت میں ہے اور یہی اس کی رسوائی کی اصل وجہ ہے۔



باب دوم

رسول اللہ ﷺ بحیثیت سپہ سالار

پس منظر

دنیا سے فتنہ وفساد ختم کر کے اللہ کا دین قائم کرنے کی ذمہ داری ہی حقیقتاً وہ مقصد تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ مختلف ادوار میں انبیاء علیہم السلام کے مقدس گروہ کو وقتاً فوقتاً مبعوث فرماتا رہا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو دنیا ظلم وجور سے بھر چکی تھی۔ جس کی تفصیل بیان کرنا خارج از بحث ہے۔ عرب کا وہ خاص علاقہ جہاں آپ ﷺ تشریف لائے لوٹ مار اور قتل و غارت کی جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ چونکہ عرب ایک بے آب وگیاہ علاقہ تھا لہذا یہاں کے اکثر وحشی قبائل کا پسندیدہ ذریعہ معاش تجارتی قافلوں کو لوٹ کر گزر اوقات کرنا تھا۔ ویسے تو یہ پیشہ ہی انسان کو دوسرے انسان کے بے دریغ قتل پر بیباک اور جری بنا دیتا ہے۔ تاہم ان میں کچھ اور بھی ایسے عقائد ونظریات شامل ہو گئے تھے جن کی بنا پر فتنہ وفساد اور انسانی خون کی ارزانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور وہ مختصراً درج ذیل ہیں:۔

قبائل عرب کی وحشت و بربریت:

عرب میں طوائف الملوکی یعنی قبائلی نظام رائج تھا۔ بات بات پر جھگڑنا ان کا قومی شعار بن چکا تھا۔ رقابت اور نسلی تفاخران جھگڑوں کو مستقل جنگوں کی شکل میں تبدیل کر دیتے تھے۔ علاوہ ازیں ان میں ''ثار'' کا عقیدہ راسخ ہو چکا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک مقتول کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے اس کی روح پرندے کی شکل اختیار کر کے مسلسل چیخ وپکار کرتی رہتی ہے۔ کہ ''میں پیاسی ہوں۔ میں پیاسی ہوں'' اور یہ پیاس صرف قاتل یا اس کے قبیلہ کے کسی فرد کا خون بہانے سے ہی بجھ سکتی تھی۔ اس عقیدہ کے تحت اگر قبائل میں جنگ چھڑ جاتی تو بعض اوقات مسلسل صدیوں تک پھیل جاتی تھی۔

ان میں فتنہ وفساد کی کثرت کی تیسری وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ خدائے واحد کو بھول کر بت پرست بن گئے تھے۔ ہر قبیلے کا جدا جدا بت تھا۔ جو اللہ کے ہاں سفارشی سمجھا جاتا تھا۔ اس عقیدۂ سفارش نے ان کو عصیان وسرکشی کی زندگی پر دلیر بنا دیا تھا۔

ان کے درمیان چوتھی وجہ مخاصمت ''عورت کی ذات تھی''۔ شراب اور عشق ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ جلسوں میں عورتوں سے عشق کا برملا اظہار کیا جاتا۔ ان کی عصمت سے کھیلنا ان کا دل چسپ مشغلہ تھا۔ جب کسی قبیلہ کی عورت پر ہاتھ ڈالا جاتا یا وہ فریاد کرتی تو یہ لڑائی مسلسل قبائلی جنگ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

پھر ان لوگوں کا جوش انتقام اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ محض حریف کو قتل کر دینا ان کے جوشِ انتقام کو تسکین نہیں بخشتا تھا۔ وہ قتل کے بعد لاش کے ہاتھ، ناک، کان وغیرہ کاٹ کر اس کو بدشکل بنا دیتے تھے۔ کبھی اس کا پیٹ چاک کر کے اس کا کلیجہ دانتوں میں چباتے اور کبھی اس کی کھوپڑی میں شراب پینے کی نذر پوری کرتے تھے۔

قریش دشمنی کی وجوہات:

یہ تھی اس قوم کی حالت، جس میں آپ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ سرانجام دے کر فتنہ وفساد اور ظلم وجور کا خاتمہ کرنا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے مشن کا آغاز عقیدہ توحید اور یوم آخرت پر ایمان اور پرسش اعمال پر استوار کیا۔ اور مکی زندگی کے مسلسل ۱۳ سال انفرادی اور پر امن جہاد پر صرف کیے۔ آپ ﷺ کی دعوت نے مکہ کے بت پرستوں کو اتنا مشتعل کر دیا کہ وہ آپ کی جان کے لاگو بن گئے۔ علاوہ ازیں اسلام نسلی تفاخر کی جڑ کاٹ کر معاشرتی مساوات کا سبق دیتا تھا۔ اور قریش مکہ جو اپنے آپ کو ہر لحاظ سے ''ایک برتر مخلوق'' سمجھتے تھے۔ انہیں یہ تعلیم کسی صورت میں قبول کرنا گوارا نہ تھی۔ پھر اسلام کمزور کی حمایت اور ظلم سے نفرت پر زور دیتا تھا۔ لیکن ان کا قبائلی نظام صرف اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ ہر صورت اپنے ہی قبیلہ کی حمایت کی جائے۔ علاوہ ازیں اسلام لوٹ مار کے مال کو حرام قرار دیتا تھا۔ لیکن بیشتر قبائل کا ذریعہ معاش ہی یہی پیشہ تھا۔ ان چند در چند وجوہات کے پیش نظر نہ صرف قریش مکہ بلکہ اکثر قبائل عرب اسلام بلکہ پیغمبر اسلام کے بھی دشمن بن گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے مسلسل تیرہ سال کی جدوجہد سے ایک مٹھی بھر جماعت تیار کر لی۔ جو اسلام کے شیدائی اور آپ کے جانثار تھے۔ قریش مکہ نے ان لوگوں کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اور یہ لوگ بیچارے مسلسل ان کے ظلم و ستم سہتے رہتے تھے۔ تا آنکہ ۱۳ سال بعد ان ظلم رسیدہ لوگوں کو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جانے کی اجازت مل گئی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن ہجرت کی اجازت ملی جس دن قریش کے پورے قبائل آپ کو جان ہی سے ختم کر دینے کی خفیہ سازش تیار کر کے آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیے بیٹھے تھے۔

مدینہ کی ریاست:

ان حالات میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے جانثار ساتھی مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے یہاں آ کر ایک چھوٹی سی آزاد خود مختار ریاست کی تشکیل کی۔ اس ریاست کے باشندوں کی تعداد بشمول مہاجرین مکہ پانچ سو نفوس سے زائد نہ تھی۔ انہی حالات میں آپ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ یعنی قتال کا فریضہ سرانجام دینا تھا۔ چنانچہ پہلی آیت جو اس سلسلہ میں نازل ہوئی وہ یہ تھی۔

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ﴾ (۳۹:۲۲)

(جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی رہی ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔)

گویا جو مسلمان آج تک کفار عرب کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ اور جنہیں آج تک صبر و استقامت کی تلقین کی جاتی رہی تھی مدینہ آ کر چھوٹی سی ریاست تشکیل دینے کے بعد انہیں ظلم سے نجات حاصل کرنے اور ظالموں کو ظلم سے روکنے کے لئے جنگ کی اجازت مل گئی۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی نوزائیدہ ریاست کی مختصر سی فوج کے سپہ سالار (حضور اکرمؐ) نے جہاد فی سبیل اللہ کا یہ فریضہ کس حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔

(ا) جہاد کی تیاری اور آپ ﷺ کی حربی مہارت

فنِ حرب اور سیاسی دفاع کے ماہرین کے نزدیک جنگ کی تیار میدان جنگ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ جنگ کی تیاری ہی وہ اصل بنیاد ہوتی ہے جس پر فتح و شکست کا

دارومدار ہوتا ہے۔اور جنگ کی تیاری کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہوتے ہیں:-

(۱) داخلی استحکام

جنگ کی تیاری میں سب سے ضروری چیز کسی ریاست کا داخلی استحکام ہوتا ہے۔ کسی ملک کی فوجیں اسی صورت میں دلجمعی سے لڑسکتی ہیں جبکہ اس ملک کی آبادی نظریاتی اعتبار سے ان کی ہمنوا ہو۔اور فوجوں میں بھی کسی قسم کا نظریاتی انتشار نہ ہو۔ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ ؐ نے مندرجہ ذیل اقدامات کیے-

(۱) تعمیر مسجد نبوی ﷺ:

مدینہ میں تشریف لاتے ہی آپ ﷺ نے سب سے پہلے مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر کی۔ اس میں دن بھر میں پانچ دفعہ مسلمانوں کے اجتماع نے مسلمانوں میں موافقت موانست اور ہمدردی کی فضا پیدا کر دی۔ یہی مسجد آپ ﷺ کی فوج کا ہیڈ کوارٹر بھی قرار پایا۔ جہاں سے حرب و ضرب کے تمام احکامات صادر ہوتے تھے۔

(۲) رشتہ مؤاخات:

مہاجرین اور انصار میں رشتہ مواخات یا بھائی چارہ قائم کر کے آپ ﷺ نے صرف مہاجرین کی آبادکاری اور معاش کا مسئلہ ہی حل نہیں فرمایا بلکہ اس سے مہاجرین و انصار میں اس قدر ہمدردی اور محبت پیدا ہوگئی جو عموماً حقیقی بھائیوں میں بھی ناپید ہوتی ہے۔

(۳) میثاق مدینہ:

مدینہ کی معتدبہ آبادی یہودیوں کے تین قبائل بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ سودخور اور تجارت پیشہ تھے۔ پڑھے لکھے بھی تھے لہٰذا اپنے علم و دولت کی وجہ سے اس معاشرہ میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے دشمن تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تمنا کے خلاف آنے والا نبی (حضور اکرم ﷺ) حضرت اسحاقؑ کی اولاد سے نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ کے تمام باشندوں (بشمول یہود) سے ایک معاہدہ کیا جو "میثاق مدینہ" کے نام سے مشہور ہے یہ دنیا کی پہلی تحریری دستاویز تھی جس میں عوام اور

ریاست کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا تھا۔ یہ میثاق ۵۲ دفعات پر مشتمل ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل دفعات بالخصوص حربی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں:۔

(۱) یہ کہ مدینہ کی کل آبادی کو ایک سیاسی وحدت قرار دیا گیا جسکا مطلب یہ تھا کہ اگر مدینہ پر باہر سے حملہ ہوا جس کا ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا، تو مدینہ کے تمام باشندے مل کر دشمن کا دفاع کریں گے۔

(۲) مصارف دفاع میں یہودی اپنے حصہ کی رقم ادا کریں گے۔

(۳) یہود اپنے مذہبی شعار کی ادائیگی میں پوری طرح آزاد ہوں گے۔

(۴) مدینہ کے ایسے قبائل جو نہ یہودی تھے اور نہ ہی انہوں نے ابھی تک اسلام قبول کیا تھا۔ کے لئے تابعین کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ خون بہا، فدیہ، انصاف اور نیکی کے کاموں میں ان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کی قبائلی روایات کا احترام کیا جائے گا۔ اس کے عوض وہ شہر کے مشترکہ دفاع اور حصہ رسدی اخراجات جنگ کو برداشت کرنے کے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔

(۵) اگر اس سلسلہ میں آپس میں کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تسلیم کیا جائے گا۔ گویا اس معاہدہ کی رو سے آپ کی بالادستی بھی تسلیم کر لی گئی۔ اور اندرونی استحکام کی طرف سے بھی کسی حد تک اطمینان ہو گیا۔

(۴) حرم نبوی ﷺ کا تعین:

چوتھا اقدام آپ ﷺ نے یہ کیا کہ مکہ کی طرح مدینہ کو بھی آپ ﷺ نے حرم قرار دیا۔ جسے آج کی سیاسی زبان میں اوپن سٹی Open City کہا جاتا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ اہل شہر اس کے اندر یا اس کے گردونواح میں جنگ نہیں کرنا چاہتے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی اور برطانیہ نے بیت المقدس کو ''اوپن سٹی'' یا حرم قرار دیا تھا۔ اور عالمگیر جنگ میں فرانس کی استدعا پر ''پیرس'' اوپن سٹی قرار پایا۔ چنانچہ جرمن نے اس پر بمباری نہیں کی۔

حضور اکرم ﷺ کا مدینہ کو حرم قرار دینے کا مقصد یہ تھا کہ قریش مکہ جو حرم مکہ کی وجہ سے بہت حد تک محفوظ و مامون سمجھے جاتے تھے اگر مدینہ پر حملہ آور ہوں گے تو قبائل عرب میں حرم کی قدر کا وقار خود بخود گر جائے گا۔ لہٰذا اس خطرہ کے پیش نظر قریش مکہ مدینہ پر حملہ آور ہونے میں ایک

اخلاقی جھجک محسوس کریں گے۔

ان چند در چند اقدامات کا یہ اثر ہوا کہ مدینہ کی چھوٹی سے نوزائیدہ ریاست عرب میں متعارف ہوگئی۔ اور اندرونی استحکام کے لحاظ سے بھی یہ اقدامات اطمینان کا باعث بنے۔

(۲) ہمسایہ قبائل سے تعلقات:

مبادیات جنگ میں دوسری اہم چیز اپنے ہمسایہ ممالک سے تعلقات ہیں۔ اگر ان سے تعلقات خراب ہوں تو عین ممکن ہے کہ جنگ کے دوران یہ لوگ دشمن سے مل کر اس کے ہاتھ مضبوط کر دیں یا جنگ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی پہلو سے مرکز پر حملہ کر دیں۔ لیکن اگر ان سے تعلقات اچھے ہوں تو وہ خواہ جنگ میں کوئی مفید خدمت انجام نہ بھی دے سکیں ان سے نقصان کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ اندرونی استحکام سے فراغت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلو پر بھی خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے:۔

(۱) ہجرت سے تقریباً ایک سال بعد اپنے چند جاں نثاروں سمیت موضع ودان کا رخ کیا۔ اس سفر کو غزوہ[1] ودان یا غزوۂ ابواء کہا جاتا ہے۔ وہاں قریش کا ایک قبیلہ بنوضمرہ آباد تھا۔ آپ ﷺ نے اس قبیلہ کے سردار عمرو بن مخشی الضمری سے مل کر درج ذیل شرائط پر معاہدہ کیا:۔

(ا) یہ قبیلہ قریش کی کسی طرح سے بھی مدد نہیں کرے گا اور غیر جانبدار رہے گا۔

(ب) اپنے علاقے میں امن بحال رکھے گا۔

(ج) جنگ کے علاوہ آئندہ تنازعات میں بھی غیر جانبدار رہے گا۔

۳۔ اس واقعہ کے چند ماہ آپ ﷺ مقام ذوالعشیرہ تشریف لے گئے یہ مقام ینبوع کے پاس آباد ہے۔ یہاں قریش کا قبیلہ بنومدلج آباد تھا۔ جو بنوضمرہ کا حلیف تھا۔ آپ ﷺ نے بنوضمرہ کے حوالے سے اس قبیلہ کے ساتھ بھی انہیں شرائط پر معاہدہ کیا۔ آپ ﷺ کا یہ سفر غزوۂ

---

[1] غزوہ یا سریہ کے معنی جنگ نہیں بلکہ مہم یا مہماتی سفر ہے۔ خواہ یہ سفر کسی ایک آدمی نے ہی کیا ہو۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر وہ سفر جس میں رسول اللہ ﷺ ساتھ ہوتے غزوہ کہلاتا ہے۔ خواہ یہ سفر تبلیغی نوعیت کا ہو یا سیاسی نوعیت کا اور خواہ محض معلوماتی قسم کی طلایہ گردی ہو۔ اور جس سفر میں حضور اکرم ﷺ ساتھ نہ ہوتے وہ سفر سریہ (جمع سرایا) کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ اپنی زندگی میں جنگیں تو صرف سات آٹھ کیں لیکن غزوات و سرایا کی تعداد رحمۃ للعالمین کے مصنف قاضی سلیمان منصور پوری کے بیان کے مطابق ۸۲ ہے جن میں سے ۱۹ غزوات ہیں اور باقی ۶۳ سرایا ہیں۔

ذوالعشیرہ کے نام سے مشہور ہوا۔

الغرض ایسی کوششوں سے آپ ﷺ کا مقصد مدینہ کے قرب وجوار میں بسنے والے قبائل کو غیر جانبدار بنانا تھا تاکہ جنگ کی صورت میں ان کا قریش سے تعاون کا خطرہ نہ رہے۔

(۳) علاقہ جنگ سے متعلق پوری واقفیت:

علاقہ جنگ سے متعلق واقفیت بھی بسا اوقات فتح کا ایک اہم سبب بن جاتی ہے۔ آپ کو جب کبھی نقل وحرکت کی ضرورت پیش آتی تو آپ اکثر مہاجرین کو اپنے ساتھ لے جاتے اور غیر معروف راستوں سے منزل مقصود تک پہنچتے تھے۔ انصار تو کم وبیش ان علاقوں سے واقف تھے ہی۔ مہاجرین کو بھی اس آب وگیاہ علاقہ سے متعارف کرانا ضروری تھا۔ تاکہ عندالضرورت پڑاؤ کے انتخاب یا پانی کی تلاش میں دقت پیش نہ آئے۔ چنانچہ غزوۂ بواط یا ودان میں ۷۰ مہاجرین آپ ﷺ کے ساتھ تھے اور غزوۂ ذوالعشیرہ میں ۱۵۰ کے لگ بھگ، ان دونوں غزوات میں، جن کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے، اسی مقصد سے آپ ﷺ نے غیر معروف اور طویل راستے اختیار کیے تھے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے عبیدہ بن الحارث کی سرکردگی میں ۶۰ مہاجرین پر مشتمل ایک گشتی سریہ شوال اھ میں بھیجا تھا تاکہ قریش کے حالات کی خبر لائے۔ یہ سریہ سریہ رابغ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قافلہ بھی غیر معروف راستوں سے ایک چشمے کے پاس پہنچا جو ثنیۃ المرہ نامی پہاڑی کے نیچے واقع تھا۔ یہاں پہنچ کر اس قافلہ کو معلوم ہوا کہ قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ عکرمہ بن ابوجہل کی سرکردگی میں مکہ کی طرف جا رہا ہے گو یہ دونوں قافلے دوبدو ہو گئے تاہم مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ کیونکہ مسلمانوں کو ابھی تک جنگ کی اجازت نہیں ملی تھی۔ چنانچہ یہ قافلہ گشت لگا کر واپس آ گیا۔

آپ ﷺ کے اس قسم کے معلوماتی سفر سے عموماً مندرجہ ذیل تین امور کی تحقیق مطلوب ہوتی تھی:۔

(۱) کتنے اور کون کون سے قبائل جنگ کے موقعہ پر حلیف یا حریف بن سکتے ہیں؟

(۲) علاقہ کے طبعی حالات حملہ آور کے مخالف ہیں یا موافق؟

(۳) حملہ آور کو کس جگہ روکنا چاہیے؟

جنگی اعتبار سے ایسے معلوماتی سفر کی اہمیت اس تاریخی واقعہ سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ جرمنی کے مشہور جرنیل ہینڈ نبرگ نے روسی فوجوں کو ٹینبرگ نامی ایک مقام پر گھیر کر دلدلوں میں پھنسا کر فنا کر دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہنڈ نبرگ اس سارے علاقے کے چپہ چپہ سے واقف تھا اور یہ علاقہ اپنے پاؤں تلے روند چکا تھا۔

(۴) طلایہ گردی اور جاسوسی نظام:

رسول اللہ ﷺ نے جس رات مکہ سے ہجرت فرمائی تو اس رات قریشیوں کے تمام قبائل کے سرداروں نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کی غرض سے آپؐ کے مکان کے گرد مسلح پہرہ بٹھا رکھا تھا۔ لیکن آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بحفاظت اس چنگل سے نکل آئے تو قریش کی اس ناکامی نے ان کے جوش انتقام کو اور زیادہ بھڑکا دیا تھا۔ قریشیوں نے آپ ﷺ کی گرفتاری کے صلہ میں سو اونٹ انعام مقرر کیا۔ اس مہم میں بھی سخت ناکامی ہوئی تو اور بھی سیخ پا ہو گئے۔ ادھر حضور اکرم ﷺ بخیر و عافیت مدینہ پہنچ گئے۔ پھر بھی ان لوگوں نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے جانثاروں کو چین کا سانس نہ لینے دیا۔ اور عبداللہ بن ابی[1] رئیس المنافقین کو مندرجہ ذیل تہدید آمیز خط لکھا۔

''تم نے ہمارے آدمی کو اپنے یہاں پناہ دی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو۔ ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے۔ اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے''۔ (ابوداؤد ج ۲ باب خبر النضیر)

آپ ﷺ کو جب اس خط کا علم ہوا تو آپ خود عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے سمجھایا کہ ''کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے''؟

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اس سوال پر عبداللہ بن ابی پر فوراً یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اس کا بیٹا اور اس کے قبیلہ کے جو لوگ مسلمان ہو چکے ہیں وہ کسی قسمت پر اس کا ساتھ نہیں دے

---

[1] عبداللہ بن ابی مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج کا سردار تھا۔ حضور اکرم ا کے مدینہ تشریف لانے سے پیشتر یہ اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ اوس وخزرج کے اکثر افراد اسلام لا چکے تھے۔ لہذا بظاہر یہ بھی مسلمان ہو گیا۔ مگر کینہ کی چنگاری دل میں دبی رہی۔ چونکہ مدینہ قریش مکہ کے تجارتی سفر کا ایک نہایت اہم مقام تھا۔ لہذا قریش مکہ مدینہ کی سیاست سے بخوبی واقف تھے۔ لہذا انہوں نے عبداللہ بن ابی کو اپنی سیاست کے مہرہ کے طور پر استعمال کیا۔

سکتے۔لہٰذا وہ قریش کے اس تہدید آمیز خط کے باوجود کوئی اقدام کرنے سے قاصر رہا۔

پھر یہ خبریں بھی دم بدم مدینہ پہنچ رہی تھیں کہ قریش مکہ مدینہ پر ایک بڑے حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔رسول اللہ ﷺ گو چند دفاعی تیاریاں کر چکے تھے تاہم ان مسلسل خبروں نے مٹھی بھر مسلمانوں کی رات کی نیند حرام کر دی تھی۔اور یہ خطرہ ہر آن لگا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی قریش مکہ مدینہ پر حملہ آور ہو سکتے ہیں اور رسول اللہ خود اکثر راتوں کو جاگا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ رات کو اکثر ہتھیار بند ہو کر سویا کرتے تھے (بخاری کتاب الجہاد۔ باب الحراستہ) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک رات رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کاش کوئی نیک بخت میرا پہرہ دے اور میں سوسکوں۔چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے پہرہ دیا۔پھر آپ ﷺ سوئے۔

(بخاری کتاب الجہاد والسیر۔باب الحراسۃ)

ان حالات میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مسلمان ہر آن کفار کی نقل و حرکت سے باخبر رہیں۔چنانچہ اس ضرورت کے تحت آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں کئی ایسے جاسوسی دستے روانہ کیے۔ایسے دستوں کو عربی میں طلیعہ اور اردو میں طلایہ گرد یا جاسوسی دستے (Petrol) کہا جاتا ہے اس طرح کے ایک دستے کا ذکر اوپر سریہ رابغ کے نام سے گزر چکا ہے۔یہ سریہ شوال ۱ھ میں عبیدہ بن حارث کی سرکردگی میں بھیجا گیا تھا۔اور ۶۰ مہاجرین پر مشتمل تھا۔اس دستہ کا جب قریش کے تجارتی قافلہ سے آمنا سامنا ہوا تو اس بات کے باوجود کہ مسلمان اس قافلہ پر حملہ کر کے اسے بآسانی لوٹ سکتے تھے صرف اس لیے باز رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس بات کی اجازت نہ تھی۔البتہ ایک صحابی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک تیر چلایا۔جو قافلہ کو مرعوب کرنے کے لیے انہوں نے چلایا تھا۔اور یہ پہلا تیر تھا جو اسلام میں چلایا گیا۔

(۲) اسی طرح کا ایک ۸۰ نفوس پر مشتمل دستہ سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں ذی قعدہ ۱ھ میں روانہ کیا گیا۔جو سریہ ضرار کے نام سے مشہور ہوا۔یہ دستہ جحفہ تک گشت لگا کر واپس چلا آیا۔

(۳) غزوۂ بواط بھی ایسی ہی سرگرمیوں سے تعلق رکھتا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ۲۰۰ افراد کی معیت میں قریش کے ایک تجارتی قافلہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے ربیع الاول ۲ھ میں روانہ ہوئے۔یہ دستہ رضوی اور بواط سے ہو کر واپس آ گیا۔راہ میں

۰۰ انفوس پر مشتمل تجارتی قافلہ امیہ بن خلف کی سرکردگی میں جاتے ہوئے ملا لیکن اس سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا۔

(۴) قریش مکہ کے بھی ایسے دستے مدینہ کے احوال کا پتہ چلانے آتے تھے۔ چنانچہ اسی ماہ یعنی ربیع الاول ۲ ھ میں کرز بن جابر الفہری کی سرکردگی میں ایک دستہ مدینہ پہنچا۔ اس نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور اہل مدینہ کے مویشی لوٹ کر لے گیا۔ آپ ﷺ نے ۷۰ آدمیوں کی معیت میں صفوان جو بدر کے نزدیک ایک مقام ہے تک اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ ہاتھ نہ لگا۔ یہ غزوۂ صفوان یا غزوۂ بدر الاولیٰ کے نام سے مشہور ہوا۔

(۵) رجب ۲ ھ میں آپ ﷺ نے ۱۲ آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بھیجا۔ تاکہ قریش کے اس قافلہ کی خبر لائے جو بنو امیہ کی سرکردگی میں جا رہا تھا یہ سریہ نخلہ کے نام سے مشہور ہوا۔ دونوں قافلوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ قافلہ قریش میں ایک نامور شخص عمرو بن حضرمی، جو تمام قریش کے سردار عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ایک ساتھی واقد بن عبداللہ تمیمی کے تیر سے مارا گیا۔ دو آدمی گرفتار ہوئے اور مال غنیمت بھی ہاتھ آیا۔ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے واپس مدینہ آ کر یہ صورتِ حال رسول اللہ ﷺ سے بیان کی تو آپ ﷺ سخت برہم ہوئے اور فرمایا:-

((صَنَعتُم مَالَمْ تؤمَروا بہٖ وَ قاتلتم فی الشَّھرِ الحرامِ ولم تومروا القتال-))	(تم نے وہ کام کیا جس کا تمہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ پھر تم ماہ حرام میں لڑے جس کا تمہیں حکم نہ تھا۔)
(طبری ج ا۔ غزوہ بدر کے تحت)	

نیز آپ ﷺ نے مال غنیمت قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ گو بعد میں قیدی بھی رہا کر دیئے تھے اور مقتول کا خونبہا بھی ادا کر دیا گیا (رحمتہ للعالمین ج ۲ ص ۱۸۷) تاہم قریش نے ماہ حرام میں لڑنے کے واقعہ کو اتنا اچھالا کہ یہی واقعہ غزوۂ بدر کا فوری سبب بن گیا۔

(۶) جنگ احزاب ختم ہونے کو تھی۔ ایک رات سخت سردی ہو گئی۔ ٹھنڈی ہوا جسموں کو چھیدتی ہوئی نکل رہی تھی۔ اس حال میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا ''کوئی ہے کہ جو جا کر دشمن کی خبر لائے''۔ سردی کی شدت اور دشمن کے کیمپ میں

جانے کا ہمت آزما مرحلہ تھا۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اس مہم کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ بچتے بچاتے اور چھپتے چھپاتے دشمن کے کیمپ میں جانے تک کامیاب ہو گئے۔ آپ نے دیکھا کہ دشمن سخت مایوسی کے عالم میں بیٹھا ہے۔ ابوسفیان سالارِ قریش کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے لشکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ پہلے سب لوگ تسلی کر لیں کہ ان کے ساتھ کوئی دشمن کا آدمی تو نہیں۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے خود دوسروں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ خود چور کو پکڑو پکارنے لگے۔ جب ابوسفیان کی تسلی ہو گئی۔ تو لشکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا:۔ محاصرہ طویل ہو گیا اور رسد ختم ہو گئی۔ بنو قریظہ نے ساتھ چھوڑ دیا اور موسم ناساز گار ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ واپس چلے جائیں"۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پوری رپورٹ لے کر اسی طرح بچتے بچاتے واپس آ گئے اور آ کر رسول اللہ ﷺ کو اس صورتحال کی اطلاع دی آپ ﷺ بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا ہر نبیؐ کا کوئی حواری ہوتا ہے۔ اور میرا حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہے"۔

(بخاری، کتاب الجہاد والسیر۔ باب ہل یبعث الطلیعة......)

ان تصریحات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ایک سپہ سالار کے دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رہنا کس قدر ضروری ہے۔ اور آپ ﷺ نے اس ذمہ داری کو کس قدر مستعدی اور جانفشانی سے سرانجام دیا تھا۔ ایسے دستوں کی روانگی سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے:۔

(۱) مدینہ کے آس پاس کے علاقہ کے متعلق پوری معلومات حاصل ہو گئیں۔

(۲) دشمن کی نقل و حرکت اور سیاسی اور حربی سرگرمیوں سے مسلمان پوری طرح واقف رہتے تھے۔

(۳) ان دستوں کی روانگی نے ابتدائی جنگی مشقوں کا کام دیا۔

(۵) عسکری تنظیم:

اسلام سے پہلے دنیا میں بالعموم جاگیرداری نظام رائج تھا۔ بادشاہ اپنے سرداروں کو جاگیریں عطا کرتے تھے اور یہ سردار اس کے عوض جنگ کے موقع پر فوج اور اس کے لوازمات مہیا

کرتے تھے۔ عام لوگ فوجی خدمات سے آزاد ہوتے تھے۔ آپ ﷺ نے ہر لڑنے کے قابل مسلمان کو فوجی قرار دیا اور ان کی تربیت اس انداز سے کی کہ نظم وضبط سے آشنا اور ایک دوسرے کی جانی دشمن قوم بنیان مرصوص کی طرح مستحکم اور مضبوط فوج بن گئی۔

دور نبوی ﷺ میں سامان جنگ صرف تیر و کمان، تلوار اور ڈھال، خود اور زرہ، نیزہ، بھالوں اور برچھوں تک محدود تھا۔ سواری کے لئے عموماً گھوڑے اور اونٹ کا استعمال ہوتا تھا ہر مسلمان مجاہد کا فرض تھا کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اسلحہ جنگ خود مہیا کرے۔ جب کبھی ہنگامی حالات پیدا ہو جاتے تو حضور اکرم ﷺ جہاد کا اعلان فرما دیتے۔ پھر صحابہ ؓ اس میں دامے درمے، قدمے سخنے شریک ہو جاتے تھے۔ مسلمانوں کی ان فوجی خدمات کے عوض انہیں صرف اموال غنیمت سے حصہ ملتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ بلکہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے دور تک یہی دستور رہا۔

جنگ بدر اور جنگ احد کے درمیانی وقفہ میں کسی وقت حضور اکرم ﷺ بلکہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے دور تک یہی دستور رہا۔

جنگ بدر اور جنگ احد کے درمیانی وقفہ میں کسی وقت حضور اکرم ﷺ نے تمام مسلمانوں کے نام درج رجسٹرڈ کروائے تو حضرت حذیفہ ؓ کی روایت کے مطابق اس وقت جملہ مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار پانچ سو ہوئی۔ اور لڑنے کے قابل مسلمانوں کی تعداد ابو معاویہ کی روایت کے مطابق چھ سو اور سات سو کے درمیان تھی۔

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب کتابت الامام الناس)

جب کبھی جہاد کا اعلان ہو جاتا تو تمام لڑنے والے مسلمان اپنے نام لکھوا دیتے۔ پھر اگر کسی کو کوئی مجبوری پیش آ جاتی تو وہ باقاعدہ حضور اکرم ﷺ سے اجازت لیتا تھا۔ ابن عباس کہتے ہیں:-

((جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انی کتبت فی غزوۃ کذا و کذا و امراتی حاجۃ فقال	(ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا نام فلاں فلاں جہاد میں جانے کے لئے لکھا گیا ہے

لیکن میری بیوی حج کو جا رہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''لوٹ جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ (پہلے) حج کرو۔''

ارجع فحج مع امراتک۔))
(بخاری' کتاب الجہاد والسیر - مسلم کتاب الحج - باب سفر المراۃ مع المحرم الی الحج وغیرہ)

منافقین کا نام بھی چونکہ مسلمانوں کے رجسٹر میں درج تھا۔ اس لئے وہ اکثر حیلے بہانے کر کے جہاد میں شامل نہ ہونے کی اجازت لے لیتے تھے اور یہی ان کے نفاق کی علامت تھی۔ غزوۂ تبوک میں تین سچے مسلمان کعب بن مالکؓ اور اس کے دو ساتھی محض تساہل کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔ تو ان پر سخت گرفت ہوئی۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ یہ واقعہ قرآن[1] و احادیث میں تفصیل سے مذکور ہے۔

مسلمان عموماً اسلحہ جنگ تو حسب توفیق خود مہیا کر لیتے لیکن سواریوں کا معاملہ ذرا مشکل تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ لہٰذا بارگاہ نبوی ﷺ میں آ کر سواری طلب کرتے۔ بسا اوقات آپ ﷺ بھی سرکاری بیت المال سے سواری مہیا نہ کر سکتے تھے۔ جس سے آپ ﷺ کو بڑا قلق ہوتا۔ اور مسلمان بھی بیچارے آبدیدہ ہو کر چلے جاتے۔

غزوۂ تبوک جو جیش العسرہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ کے وقت مسلمانوں پر خاصی تنگ دستی کا وقت تھا۔ چند مسلمان آئے اور آپ ﷺ سے سواری طلب کی آپ ﷺ پر یہ بات اس قدر شاق گزری کہ آپ ﷺ نے قسم کھالی کہ میں سواری مہیا نہ کروں گا۔ وہ مایوس اور آبدیدہ ہو کر واپس چلے گئے۔ اتنے میں کچھ اونٹ بیت المال میں آ گئے تو آپ ﷺ نے ان لوگوں کو واپس بلا کر پانچ عمدہ قسم کے اونٹ دیدیئے۔ ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے سواری مہیا نہ کرنے کی قسم اٹھائی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''جب میں قسم کھا لیتا ہوں تو بہتر بات کے لیے اسے توڑ کر کفارہ دے دیتا ہوں''۔ (بخاری' کتاب المغازی' باب قدوم الاشعریین)

جنگی مصارف پہلے سے تو خمس کے مال سے پورے کیے جاتے لیکن اس سے کام نہ چلتا تو آپ ﷺ چندہ کی اپیل فرمایا کرتے۔ اسی غزوۂ تبوک کے موقعہ پر آپ ﷺ نے بھرپور مالی تعاون کی اپیل فرمائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مقابلہ مسابقت کا

[1] سورۂ توبہ آیت ۱۱۸' بخاری - کتاب المغازی باب حدیث کعب ابن مالک..... مسلم' کتاب التوبہ - باب حدیث کعب ابن مالک و صاحبیہ۔

خیال آیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں حضرت عمرؓ کی مالی حالت حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اچھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے گھر کے تمام اثاثہ کا نصف لاکر مسجد میں حضور کے سامنے لا ڈھیر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا۔ ''عمرؓ! کیا کچھ لائے؟'' بولے تمام جائیداد کا نصف لے آیا ہوں۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ تھوڑا سا سامان لیے آ گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا۔ ''ابوبکر! کیا کچھ لائے۔ فرمایا'' گھر میں بس اللہ اور رسول ﷺ کا نام چھوڑ آیا ہوں''؟

(ترمذی ابواب المناقب- باب ابی بکر الصدیق)

اسی موقعہ پر ایک تنگدست صحابی (ابو عقیل) نے ساری رات کنویں سے پانی نکال کر ایک صاع کھجوریں مزدوری حاصل کی اور آدھا صاع لاکر حضور اکرم ﷺ کے سامنے لاکر ڈھیر کر دیں۔ آپ ﷺ ہر چندہ دھندہ کے مشکور ہوتے اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کرتے۔

اس تنگدست صحابی کی اس قربانی پر آپ ﷺ اتنے خوش ہوئے کہ اس کی ایک صاع کھجوریں تمام ڈھیر پر پھیلا دیں۔

(بخاری کتاب التفسیر زیر آیت الذین یلمزون المطوعین اور الرحیق المختوم اردو ص ۶۸۲)

یہ تھا حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں افرادی قوت اور جنگی مصارف مہیا کرنے کا طریق۔ حضرت عمرؓ وہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے فوج کا الگ محکمہ قائم کیا۔ باقاعدہ تنخواہ دار ملازم رکھے گئے۔ پھر یہ افواج بھی دو قسم کی تھیں۔ ایک وہ جو ہر وقت چھاؤنیوں میں موجود اور مستعد رہتی تھیں اور دوسرے وہ جو تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس آ کر اپنا کام کاج کرتی تھیں اور بوقت ضرورت انہیں طلب کر لیا جاتا تھا۔ جسے آج کل ریزرو فوج کہا جاتا ہے۔ ان کے نظم و نسق کے لئے ایک محکمہ دیوان الجند کے نام سے قائم کیا جس میں سپاہیوں کے نام اوصاف ان کے وظائف کی مقدار اور ان کے اعمال و فرائض کی تفصیلات کا اندراج ہوتا تھا۔

قیادت کا نظام:

رسول اللہ ﷺ کے آخر زمانہ میں اسلامی مملکت سات صوبوں میں تقسیم کی گئی تھی اور حضرت ابوبکرؓ کے دوران خلافت دس صوبوں میں ہر صوبہ کا ایک والی ہوتا تھا۔ جو حاکم اور سپہ سالار دونوں طرح کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک عامل ہوتا جو صوبہ کی آمد و خرچ

کا نگران ہوتا اور ایک قاضی جو عدلیہ کا سربراہ ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حاکم اور سپہ سالار کے عہدے بھی الگ الگ کردیے گئے۔ فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کر کے ان کے سالار مقرر کردیے گئے اور پھر ان سب کو ایک سالار اعظم کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس سے پیشتر جنگ کے دوران ہی مختلف دستوں کے سالار مشورہ کے ذریعہ مقرر کئے جاتے تھے اور یہ بات بسا اوقات خلیفہ کی صوابدید پر منحصر ہوتی تھی۔ ان سالاروں کو قائد کہا جاتا تھا۔

خلیفہ کی طرح قائد کی اطاعت بھی واجب تھی۔ اس کی حیثیت خلیفہ کے نائب کی ہوتی تھی۔ نماز میں وہی لوگوں کی امامت کراتا۔ اگر کسی مقام پر ایک سے زیادہ قائد جمع ہو جاتے تو ان میں سے کسی اہل تر کو خلیفہ نماز کی امامت کے لئے مقرر کر دیتا۔ یہ بمنزلہ قائد القواد یا سپہ سالار اعظم سمجھا جاتا تھا۔

جب کسی مقام پر جنگ کا خاتمہ ہو جاتا اور پیش قدمی روک دی جاتی تو ان سپہ سالاروں کے فرائض فوجیوں کے معاملات کی نگرانی' ان کی ترتیب و مشق اور ان کے اسلحہ وسامان کی اصلاح و عمدگی کی دیکھ بھال ہوا کرتی تھی۔

اسلامی فوج کی لڑائی کا یہ طریقہ تھا کہ سالار تین دفعہ اللہ اکبر کہتا تھا۔ پہلی تکبیر پر فوج حربہ و ہتھیار سے آراستہ ہو جاتی تھی' دوسری پر لوگ ہتھیار تول لیتے تھے اور تیسرے نعرہ پر حملہ کر دیا جاتا تھا۔ جنگ بویب (۱۴ھ) میں سالار لشکر مثنیٰ نے ابھی دوسری تکبیر نہیں کہی تھی کہ ایرانیوں نے حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر مسلمان ضبط نہ کر سکے اور کچھ جوش میں آ کر آگے نکل گئے مثنیٰ نے غصہ میں آ کر داڑھی دانتوں کے نیچے دبالی اور پکارے "خدا کے لیے اسلام کو رسوا نہ کرو"۔ اس آواز کے ساتھ فوراً لوگ پیچھے ہٹے اور اپنی جگہ پر ہٹ آئے۔ پھر تیسری تکبیر پر مثنیٰ نے حملہ کیا۔
(الفاروق شبلی نعمانی ص ۱۳۷)

(۶) کمانڈروں کا انتخاب:

اسلامی لشکر کو کئی دستوں (BATALIAN) میں تقسیم کیا جاتا۔ ان دستوں کو جند کہتے تھے۔ اور ان کے قائد یا سالار مقرر کیے جاتے تھے۔ سپہ سالار کو اپنے چھوٹے افسروں کا انتخاب کرتے وقت ان کی حربی مہارت اور سابقہ تجربہ کا ضرور لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بڑے پایہ کے صحابی تھے۔ زہد و تقویٰ میں خاص مقام رکھتے تھے لیکن طبیعت میں نرمی اور رحم

دلی بہت زیادہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ ان سے محبت بھی رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے بھی افسر بنا دیجئے۔ تو آپ ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ ''اے ابوذر! تو کمزور ہے اور افسری امانت ہے۔ جو قیامت کو رسوائی کا باعث بن سکتی ہے۔ (مسلم، کتاب الامارۃ۔ باب کراھیۃ الامارۃ) اور ایک دوسری روایت ہے کہ آپ ﷺ نے یہ جواب دیا کہ ''اے ابوذر! تو بھی میرے جیسا ہی (نرم دل) ہے۔ میں تمہیں دو آدمیوں پر بھی افسر بنانے کو تیار نہیں''۔ اور یہ جو آپ ﷺ نے ''میرے جیسا'' فرمایا تو یہ مشابہت محض نرم دلی کے پہلو سے تھی۔ ورنہ آپ ﷺ میں تو اولی الامر کے جملہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔

آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری سال روم کی طرف ایک لشکر تیار کیا اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اس کا سپہ سالار منتخب کیا۔ اس واقعہ سے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یوں روایت کرتے ہیں:-

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بَعْثاً وَاَمَّرَ عَلَیْھِمْ اُسَامَۃَ بْنَ زَیْدٍ فَطَعَنَ النَّاسُ فِیْ اِمَارَتِہٖ وَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وسلم فَقَالَ: اِنْ تَطْعَنُوْا فِیْ اِمَارَتِہٖ فَقَدْ کُنْتُمْ تَطْعَنُوْنَ فِیْ اِمَارَۃِ اَبِیْہِ مِنْ قَبْلُ وَاَیْمُ اللّٰہِ اِنْ کَانَ لَخَلِیْقاً لِّلْاِمَارَۃِ وَاِنْ کَانَ لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ وَاِنَّ ھٰذَا لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ بَعْدَہٗ۔))

(بخاری، کتاب المغازی۔ باب بعث النبی اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ)

((آنحضرت ﷺ نے روم کی طرف ایک لشکر روانہ کیا اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اس کا سردار مقرر کیا (حالانکہ اس لشکر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔) لوگوں نے اسامہ رضی اللہ عنہ کے سردار ہونے پر طعنہ مارا۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''اگر تم اسامہ کی سرداری پر طعنہ دیتے ہو۔ تو اس سے پہلے تم اس کے باپ (زید بن حارثہ) کی سرداری میں بھی طعن کر چکے ہو۔ اور قسم خدا کی وہ سرداری کے لائق تھا اور سب لوگوں سے مجھ کو پیارا تھا۔ اس کے بعد (اس کا بیٹا) سب لوگوں سے پیارا ہے۔))

لوگوں کی نظر میں صرف یہ بات تھی کہ اسامہ رضی اللہ عنہ صرف بیس سال کا نوجوان ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے افضل صحابہ ان کی ماتحتی میں کیسے رہ سکتے ہیں؟ اور بعض کو یہ خیال بھی تھا کہ اسامہ غلام زادہ ہو کر بڑے بڑے معززین قریش کا افسر کیسے بن سکتا ہے؟

اس خطبہ میں آپ ﷺ نے دو باتوں کی تعلیم دی ہے۔ ایک یہ کہ جس منصب کے لئے کسی کا تقرر کیا جائے اس منصب کی اہلیتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ (چنانچہ حضور ﷺ کی زندگی کے بعد خلافت ابوبکرؓ میں لشکر اسامہ بن زید کی سرکردگی میں بھیجا گیا۔ اور فتحیاب ہو کر واپس آیا) دوسرے یہ کہ جو امیر مقرر کیا جائے سب کو اس کی اطاعت کرنا چاہیے۔ خواہ غلام یا غلام زادہ ہو۔ چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ لشکر روانہ کیا تو آپ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی اجازت سے اسلامی ریاست کے انتظام کے لئے مدینہ میں رہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خود حضرت اسامہ کو الوداع کرنے گئے۔ حضرت اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ حضرت اسامہ کہتے ہی رہے کہ یا آپ بھی سوار ہو جائیں یا میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں میں سے کوئی بات قبول نہ کی۔ رخصت کرتے وقت فرمانے لگے اگر مناسب سمجھو تو انتظام سلطنت کے لیے عمر رضی اللہ عنہ کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات بخوشی منظور کر لی۔ (طبری حصہ دوم خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ)

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی کئی سرایا سے کامیاب و کامران واپس آئے تھے۔ ان میں جنگی مہارت اور سپہ سالار بننے کے اوصاف موجود تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت زید کو سریہ موتہ میں سالار لشکر بنایا تھا۔ بڑے بڑے صحابی اور خالد بن ولید جیسا جرنیل آپ کی سرکردگی میں اس جہاد میں شریک ہوئے۔ زید بن حارثہ[1] رضی اللہ عنہ اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ اور بالآخر خالد بن ولید کے ہاتھ پر اللہ نے فتح دی۔ اس جنگ میں حضرت زید کو سپہ سالار بنانے سے آپ ﷺ کا اہم مقصد یہی تھا کہ قریش کے تفوق کے بت کو پاش پاش کر دیا جائے۔

یہ تو ایک خاص پہلو تھا جس میں امت کی اخلاقی تربیت مقصود تھی۔ عام اصول یہی ہے کہ کمانڈروں کے انتخاب میں بھی سپہ سالار کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لینا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ دور رس بھی اس سلسلہ میں بہت تیز تھی۔ اور ہر محاذ پر لشکر روانہ کرتے وقت ان کی نظر کسی اہل تر سپہ سالار پر جا کر ٹکتی تھی۔ تاہم جنگ قادسیہ کے موقع پر انہیں بھی سپہ سالار کے

---

[1] آپ نے لشکر کی روانگی کے وقت فرمایا کہ اگر زید رضی اللہ عنہ شہید ہو جائیں تو جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو امیر بنا لینا' وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنا لینا۔ اتفاق کی بات یہ تینوں سپہ سالار اسی ترتیب سے باری باری شہید ہو گئے۔ اس وقت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے خود آگے بڑھ کر جھنڈا سنبھالا۔ اور فائز المرام واپس آئے۔ اسی موقع پر حضور اکرم ﷺ نے انہیں ''سیف اللہ'' کا خطاب دیا تھا۔

انتخاب کے لیے اہل الرائے سے مشورہ لینا پڑا۔ اسی طرح سپہ سالار کو اپنے لشکر کے لیے کئی چھوٹے بڑے کمانڈر مقرر کرنا پڑتے ہیں۔ اس وقت عدل و انصاف اور باہمی مشورہ سے کام لینا چاہئے۔ اگر سپہ سالار محض اپنی پسند و ناپسند کے مطابق ترقیاں اور درجات عطا کرنا شروع کر دے تو فوج میں انتشار اور بے دلی پھیل جاتی ہے۔

(۷) رازداری اور خفیہ اطلاعات (Secracy + Intelligence):

جس طرح دشمن کی نقل و حرکت اور اس کے حالات سے آگاہ رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اپنے حالات اور نقل و حرکت سے دشمن کو حتی الوسع بے خبر رکھا جائے۔ لہٰذا ایسے ''فوجی راز'' سوائے گنتی کے چند مشیروں اور معتمدان خاص کے کسی کو معلوم نہ ہونے چاہیں۔ حتی کہ فوجی عوام بھی جنگی پالیسی سے آگاہ نہیں ہوتے۔ فتح مکہ کی تیاری کے دوران اس بات کا اتنا خیال رکھا گیا کہ آپ نے اپنے حلیف قبائل کو جو خفیہ پیغامات بھیجے وہ اس رازداری سے بھیجے گئے تھے کہ عام مسلمانوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ اسی موقعہ پر ایک سچے مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ سے ایک لغزش ہوگئی۔ انہوں نے بھی خفیہ طریق سے ایک عورت کے ہاتھ رقعہ دے کر اہل مکہ کو چڑھائی کے متعلق آگاہ کرنا چاہا تھا۔ جس سے اس صحابی کی غرض محض اس ''احسان'' کے بدلے اپنے بال بچوں کی حفاظت تھی۔ حضور اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعہ اس واقعہ کی خبر مل گئی۔ تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تعاقب میں روانہ کیا جنہوں نے اس عورت سے بجبر رقعہ برآمد کر لیا۔

رازداری کی اہمیت یہ ہے کہ بعض دفعہ محض ایک راز کے لیک آؤٹ ہو جانے سے جنگ کا نقشہ ہی بدل سکتا ہے۔ اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک عام حکم دے دیا۔

﴿يَا يُّهَا الَّذِينَ امَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ.﴾ (۱۱۸:۳)

(اے مومنو! اپنے علاوہ کسی دوسرے کو رازدار نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری بربادی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور چاہتے ہیں کہ تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔)

آپ کی رازداری کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ نے ۲ھ میں ۱۲ آدمیوں کا ایک گشتی دستہ

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں روانہ کیا تو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ایک سربمہر لفافہ دیا اور حکم دیا کہ تین دن بعد تم نخلہ کے مقام پر پہنچ جاؤ گے۔ وہاں جا کر اسے کھولنا اور اس کے مطابق عمل کرنا۔ تین دن بعد جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نخلہ پہنچ گئے تو لفافہ کھول کر دیکھا تو لکھا تھا کہ قریش کی نقل و حرکت کے متعلق پوری واقفیت حاصل کر کے واپس آ کر مجھے اطلاع دو“؟

(یہ واقعہ ”طلایہ گردی“ کے عنوان کے تحت ذرا تفصیل سے گزر چکا ہے)

آپ ﷺ جو فوجی دستے روانہ کرتے ان کو قبل از وقت‘ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس انداز تربیت سے مجاہدین میں بھی فوجی راز کو راز رکھنے کی اہلیت پیدا ہو گئی۔

آپ ﷺ کو جب کبھی غزوہ پر جاتا ہوتا تو عموماً غیر معروف اور پر پیچ راستے اختیار فرماتے۔ جس کا مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ دشمن آپ ﷺ کی نقل و حرکت سے مطلع نہ ہونے پائے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ آپ ﷺ کی منزل تو کوئی اور ہوتی اور آپ ﷺ استفسارات کسی دوسرے مقام کے متعلق کرتے۔ یا مبہم اور ذو معنی الفاظ استعمال کرتے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

((وَلَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرِيْدُ غَزْوَةً اِلَّا وَرّٰى بِغَيْرِهَا-)) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ غزوہ تبوک)

(اور آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے۔)

علاوہ ازیں آپ ﷺ نے غزوہ بنی مصطلق میں پوشیدہ تحریر کا طریقہ ایجاد کیا طبری ج ۲۔ص ۶۰۲ رازداری کے اس طریق سے دنیا پہلے متعارف نہ تھی یہی طریق ترقی کر کے آج کل Code Words کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

اسی رازداری کا دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ جہاں اپنی نقل و حرکت کو حتی الامکان صیغہ راز میں رکھا جائے وہاں دشمن کے حالات سے متعلق زیادہ سے زیادہ‘ صحیح اور مستند خبریں مہیا کی جائیں۔ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں آپ دیکھ آئے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے سربمہر لفافہ دیا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ”دشمن کے حالات معلوم کر کے بواپسی اطلاع دی جائے۔“

دشمن سے متعلق موصول شدہ اطلاعات کی صحت کے متعلق آپ کو اتنا اہتمام تھا کہ آپ ﷺ نے صرف ان فوجی دستوں کی اطلاعات کو ہی کافی نہیں سمجھا بلکہ مختلف حلیف و حریف قبائل

میں آپ ﷺ کے ایسے آدمی موجود تھے جو آپ ﷺ کو حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ مکہ[1] جیسے مرکزی شہر میں نامہ نگار متعین کیا۔ جو خفیہ طور پر آپ ﷺ کو وہاں کے حالات سے باخبر رکھتا تھا۔ آج کی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ کا Intelligence Dept. بھی اپنے دشمن کی نسبت بہت زیادہ متحرک اور فعال تھا۔

(۸) فوجی تربیت:

رسول اللہ ﷺ نے اسلامی فوج کی فوجی تربیت، پریڈ اور لیفٹ رائٹ کے انداز سے نہیں فرمائی بلکہ اس کی ابتدا نماز سے کی گئی۔ عسکری نقطہ نظر سے نماز سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:۔

(۱) صف بندی، صفوں کی درستی پر آپ ﷺ خصوصی توجہ فرماتے تھے اور اس درستی کو نماز کا حصہ قرار دیا گیا۔

(۲) اطاعت امیر اور ڈسپلن، نماز میں امام کی تکبیر پر سب کو بلا چون وچرا امام کی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ سب نمازیوں کی تمام حرکات ایک ساتھ عمل میں آئیں۔ اور لحظہ بھر کی بھی تقدیم وتاخیر گوارا نہیں۔ یہ دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے سامنے اظہار عبودیت اور اطاعت امیر اور ڈسپلن کی مسلسل اور ناقابل فراموش مشق ہے۔

(۳) رابطہ باہمی، نماز سے اس ''اسلامی فوج[2]'' کا آپس میں مسلسل رابطہ قائم رہتا ہے۔ جو باہمی موانست، محبت اور یک جہتی کا بہت بڑا سبب ہے۔

(۴) وقت کی پابندی کیونکہ نماز کی مقررہ اوقات پر پابندی بھی فوجی نقطہ نگاہ سے بہت اہم مقام رکھتی ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ طے شدہ پروگرام میں چند منٹ کی تاخیر بھی فتح کو شکست میں تبدیل کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

(۵) طہارت اور پاکیزگی، نماز کی ادائیگی سے پہلے طہارت کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ جو

---

[1] جنگ احد سے متعلق قریش مکہ کی تیاری کی خفیہ رپورٹیں آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس ؓ نے بہم پہنچائی تھیں۔ اگرچہ ان دنوں کافر تھے۔ (تاریخ اسلام حصہ ۴۲ از پروفیسر حمید الدین)

[2] آج کل عام حالات میں دن میں دو بار فوجی جوانوں کو Fall in کر کے حاضری لگائی جاتی ہے۔

سپاہیانہ زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔

(۶) ضابطہ اخلاق کی پابندی' نماز کا یہ خاصہ ہے کہ اگر صحیح طور پر ادا کی جائے تو یہ برے کاموں سے روکتی ہے۔ اسلامی فوج کے لئے ضابطہ اخلاق کی پابندی بھی بہت ضروری چیز ہے۔ اور سالار لشکر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ فوج کی اخلاقی تربیت بھی کرے۔ یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر عین دوران جنگ بھی نماز اسی طرح فرض ہے جس طرح عام حالات میں فرض ہے گو اس میں تخفیف کر دی گئی ہے۔

فوجی تربیت کے لئے دوسرا اہم اقدام ''روزہ'' قرار دیا گیا ہے۔ ''روزہ'' انسان میں قوت برداشت پیدا کرتا ہے یہ ایک ماہ کا تربیتی کورس ہے بسا اوقات سفر میں فوج کو سامان خوراک کی قلت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسے وقتوں میں صبر و ثبات پیدا کرنے کے لئے روزہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔

روزہ جہاں صبر و ضبط پیدا کرتا ہے وہاں دوسرے لوگوں کی ایسی تکالیف کا احساس بھی بیدار کرتا ہے۔ جس سے انسان میں خود غرضی کے بجائے ایثار کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

تیسرا اہم اقدام ''زکوۃ'' ہے جو معاشی ناہمواریوں کو ختم کرتی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دولت امیر طبقہ میں ہی گردش نہ کرتی رہے۔ امیر کو غریب کا احساس ہو۔ فاتح جب کوئی ملک فتح کرتا ہے تو اموال غنائم کو وہ اپنا ذاتی حق سمجھ کر جس طرح چاہتا ہے۔ اُسے تصرف میں لاتا ہے اور اس کا کچھ حصہ سردارانِ لشکر میں تقسیم کر دیتا ہے اور دولت امراء میں ہی رہ جاتی ہے جو اسلامی روح کے منافی ہے۔ اسلام اموال غنائم سے پانچواں حصہ بیت المال کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ جو عموماً غریبوں کی فلاح و بہبود پر ہی خرچ ہوتا ہے باقی غنیمت کے یکساں حصے کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود حضور اکرم ﷺ کو بھی لشکری کے برابر حصہ ملتا تھا۔ دولت سے محبت کم کرنے کے لئے زکوۃ ایک موثر ذریعہ ہے۔

چوتھا اقدام ''حج'' ہے جو ایک عالم گیر بین الاقوامی اجتماع ہے۔ جہاں مسلمان مل کر پیش آمدہ مسائل پر غور و خوض کر کے اس کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ اور جس کے بعد نہ جنیوا کانفرنس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور نہ رباط کانفرنس کی۔ افسوس ہے کہ آج کا مسلمان حج کے عظیم فوائد سے یکسر غافل ہے۔

اور پانچواں اقدام "جہاد" جس کی تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے لانگ مارچ کی کئی دفعہ مشقیں کرائیں۔ وہ گشتی دستے جو آپ ﷺ علاقہ کے نشیب و فراز سے واقفیت بہم پہنچانے کی غرض سے بھیجتے تھے۔ سب لانگ مارچ کی نوعیت کے ہوتے تھے۔

الغرض اسلام نے جو فرائض مقرر کیے ہیں انہیں اگر کماحقہٗ بجالایا جائے تو فوجی تربیت ازخود ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح عبادات میں جہاد کا رنگ پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح جہاد میں عبادات کا رنگ پیدا کرتا ہے۔

(۹) فوج میں بھرتی کے قواعد

ابتدائے اسلام میں جو لوگ مسلمان ہوئے ان میں سے جو لوگ لڑائی کے قابل تھے "مجاہد" قرار دیے گئے۔ ان میں مندرجہ ذیل صفات کا ہونا ضروری تھا:-

(۱) مسلمان ہو:

یہ ایک عام اصول تھا جس میں کچھ مستثنیات بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً جنگ حنین میں مکہ کے نومسلموں کے علاوہ کچھ غیر مسلم بھی شامل تھے۔ اسی طرح دور فاروقی میں جنگ قادسیہ میں مشرک بھی مسلمانوں کے ساتھ تھے اور فتح حاصل کر چکنے کے بعد انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ تاہم یہ خیال رکھنا ضروری ہے۔ کہ فوج کے کلیدی مناصب کسی غیر مسلم کے حوالہ نہیں کیے جاسکتے۔ اشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ (۳:۱۱۸)

(اے ایمان والو! کسی غیر مذہب کے آدمی کو اپنا راز نہ بتاؤ۔ یہ لوگ تمہاری خرابی میں کسی طرح کوتاہی نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہیں کہ تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔)

گو حکومت کے دوسرے محکموں میں بھی بعض امور کو صیغہ راز میں رکھنا پڑتا ہے مگر محکمہ فوج میں راز اور رازداری کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ بعض دفعہ صرف ایک راز کے فاش ہونے سے ملک کی قسمت بدل جاتی ہے۔ لہٰذا حتی الوسع یہ کوشش ہونی چاہیے کہ فوج میں غیر مسلم بھرتی نہ کیے جائیں اور اگر بفرض محال ان کی ضرورت آ بھی پڑے تو کلیدی اسامیاں ہرگز غیر مسلموں کے

حوالہ نہیں کی جاسکتیں۔

غزوۂ بدر کے دوران آپ ﷺ کو ایک ایسا شخص ملا جو بہادری میں مشہور تھا۔ اس نے اپنی خدمات پیش کیں تاکہ اموال غنیمت سے حصہ حاصل کر سکے۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے''؟ اس نے کہا نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوٹ جا۔ میں مشرک کی مدد نہیں چاہتا۔ تھوڑی دور آگے چل کر پھر یہی سوال جواب ہوئے تو بھی آپ ﷺ نے اس کی مدد لینے سے انکار کر دیا آگے بڑھے تو پھر یہی سوال و جواب ہوئے۔ اب کی بار اس نے جواب دیا کہ ''میں اللہ اور اس کے رسول پر یقین رکھتا ہوں''۔ تب آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی۔ (مسلم، باب کراهیة الاستعانة فی الغز و بکافر) حالانکہ اس وقت آپ ﷺ کو افرادی قوت کی سخت ضرورت تھی۔

تاہم اس میں اتنی گنجائش ضرور ہے کہ کافر اگر مشرک نہ ہو اور اس سے مسلمانوں کی خیر خواہی کا بھی یقین ہو تو اسے فوج میں شامل کیا جاسکتا ہے حضور اکرم ﷺ نے صفوان بن امیہ سے جنگ حنین میں مدد لی۔ جبکہ وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے (امام نووی۔ تحت شرح حدیث مذکورہ)

(۲) مرد ہو:

لڑنے والی فوج یا مجاہدین میں عورتوں کو بھرتی نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کریم میں جہاد کے متعلق جتنی آیات آئی ہیں سب میں صرف مردوں سے خطاب ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں میدان جنگ میں لڑنے کی مکلف نہیں ہیں اور انہیں اصولاً غیر مجاہد قرار دیا گیا ہے:-

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:-

((قَالَتْ اسْتَاذَنْتُ النَّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی الجھاد و قال: جِھَادُ کُنَّ الْحَجُّ"۔)) (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب جہاد النساء)	(میں نے آنحضرت ﷺ سے جہاد کی اجازت مانگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم عورتوں کا جہاد حج کرنا ہے (اس میں تم کو جہاد کا ثواب ملے گا)۔

خلافت راشدہ کے چالیس سالہ دور میں ہمیں ایک مثال ایسی ملتی ہے جہاں کسی عورت نے معرکہ کارزار میں حصہ لیا ہے اور وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جنگ جمل میں شمولیت اور قیادت ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے جذبہ سے شدید متاثر

ہو کر جنگ میں شمولیت اختیار کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو لکھا کہ:-

((فَاِنَّکِ خَرَجْتِ غَاضِبَۃً لِلّٰہِ وَ لِرَسُوْلِہٖ تَطْلُبِیْنَ اَمْرًا کَانَ عَلَیْکِ مَوْضُوْعًا۔ مَابَالُ النسوۃِ والحرب وَاِصْلَاحِ بَیْنَ النَّاسِ۔)) (الامامہ والسیاسیہ ابن قتیبہ ص ۷۰)

(آپ اللہ اور اس کے رسول کے حکم قصاص کے لئے غضبناک ہو کر ایک ایسے معاملہ کے لئے نکلی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ سبکدوش تھیں بھلا عورتوں کا جنگ اور لوگوں کے درمیان مصالحت سے کیا تعلق؟)

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ صحابی' جو اس جنگ میں غیر جانب دار رہے تھے نے اس واقعہ کے متعلق یوں کہا تھا کہ:-

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھر ان کے ہودج سے بہتر ہے''۔

(حوالہ ایضاً ص ۶۰)

اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس شمولیت کا زندگی بھر افسوس رہا۔ جب یہ آیت ''فی بیوتکن'' کی تلاوت فرماتیں تو اتنا روتیں کہ دوپٹہ بھیگ جاتا۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۹۱)

البتہ عورتیں بالواسطہ جنگ میں حصہ لے سکتی ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(۳) بالغ اور سلیم العقل ہو:

بچوں اور دیوانوں کو اس وقت تک جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جب تک کہ وہ بالغ اور تندرست نہ ہو جائیں۔ جنگ بدر سے متعلق حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:-

((اُسْتُصْغِرْتُ اَنَا وَابْنُ عمر۔)) (بخاری کتاب المغازی۔باب عدۃ اصحاب بدر)

(میں اور عبداللہ بن عمر دونوں (بدر کے دن) چھوٹے سمجھے گئے۔)

رسول اللہ ﷺ لڑائی میں جانے سے پیشتر جہاد میں شامل ہونے والی فوج کو ملاحظہ فرماتے۔ جو لڑائی کے قابل نہ ہوتے انہیں منظور نہ کرتے جنگ بدر کے موقع پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی عمر ۱۳ برس تھی۔ آپ ﷺ نے منظور نہ کیا۔ پھر احد کے دن پیش کیے گئے جبکہ ۱۴ برس کے تھے' تب بھی آپ ﷺ نے انہیں اجازت نہیں دی۔ اور جنگ خندق کے وقت آپ رضی اللہ عنہ کی عمر

پندرہ سولہ برس کی تھی۔ اس وقت آپ کو اجازت مل گئی۔

(بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب غزوۃ الخندق)

جنگ احد کے موقع پر جب عبداللہ بن ابی منافق اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے باقی ماندہ فوج کا جائزہ لیا۔ اور مندرجہ ذیل پانچ کمسن صحابہ ؓ کو اس بنا پر فوج سے خارج کر دیا۔ کہ وہ ابھی حد بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔

حضرت زید بن ثابت ؓ، حضرت عبداللہ بن عمر ؓ، حضرت عرابہ اوسی ؓ، حضرت ابوسعید خدری ؓ اور حضرت براء بن عازب ؓ۔

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومت وقت عمر کے متعلق یہ تعین کر سکتی ہے کہ اتنی عمر سے کم بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) قد و قامت اور جسمانی طاقت:

اسی موقعہ پر جب حضور اکرم ﷺ فوج کا جائزہ لے رہے تھے تو چند نوخیز اور شوق جہاد سے سرشار نوجوانوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے اجازت حاصل کر لی ان میں سے ایک رافع بن خدیج ہیں۔ جب ان سے کہا گیا کہ تم چھوٹے ہو تو آپ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے تا کہ قد پورا نظر آئے۔ آپ کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ تو ایک دوسرے نوجوان سمرہ نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ میں رافع سے کسی طرح کم نہیں اور میں اسے کشتی میں پچھاڑ سکتا ہوں۔ اگر رافع کو اجازت مل گئی ہے تو مجھے بھی ملنی چاہئے۔ چنانچہ ان دونوں میں کشتی کرائی گئی۔ فی الواقع سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا۔ لہٰذا انہیں بھی اجازت مل گئی۔ (طبری ج ۲ ص ۱۳۹۱) یہ تھا ان پاکباز ہستیوں کا شوق جہاد۔

عمر اور قد سے متعلق یہ واقعات سب کتاب تاریخ مثلاً طبری، ابن ہشام اور البدایہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ اس واقعہ سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) حکومت مجاہدین کے قد اور جسمانی طاقت کا ایک معیار قائم کر سکتی ہے۔

(۲) اگر کسی نوجوان میں کسی ایک پہلو میں معیار سے کچھ کمی بھی ہو۔ لیکن وہ جذبہ جہاد سے سرشار ہو تو متعلقہ افسر اس کی بھرتی کی اجازت دے سکتا ہے۔

(۵) صحت مند ہو اور اعضاء و جوارح سالم ہوں:

قرآن کریم نے واضح طور پر اندھوں، لنگڑوں اور بیماروں کو جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ سورۂ فتح میں ارشاد ہے:-

﴿لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ-﴾ (۱۷:۴۸)

(نہ اندھے پر نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے (کہ وہ سفر جنگ سے پیچھے رہ جائے)۔)

اور سورۂ توبہ میں کمزور اور ناتوان، بوڑھوں اور بیماروں کے علاوہ ان لوگوں کو بھی جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جو مالی حیثیت سے کمزور ہیں۔ نہ گھر میں خرچ کرنے کو کچھ موجود ہے اور نہ زادراہ یا اسلحہ جنگ کے لئے کچھ پس انداختہ رقم۔ ایسے اشخاص کا بروقت اگر کچھ بندوبست ہو جائے تو خیر ورنہ جہاد ان سے ساقط ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَی الْمَرْضٰی وَلَا عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ-﴾ (۹: ۹۱)

(ضعیفوں، بیماروں، اور خرچ سے معذور لوگوں پر، اگر وہ شریک جہاد نہ ہوں تو کچھ گناہ نہیں۔ بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خیر اندیش ہوں۔)

آج کل چونکہ اسلحہ، وردی، زادراہ اور پس ماندگان کی کفالت کی حکومت خود ذمہ دار ہوتی ہے لہٰذا اخراجات کی کمی سے متعلقہ شق قابل غور نہیں رہی۔

(۶) والدین کی اجازت:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:-

((جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَاذَنَهٗ فِی الْجِهَادِ فَقَالَ: اَحَیٌّ وَالِدَاکَ"؟ قَالَ انَعَمْ! قَالَ فَفِیْهِمَا فَجَاهِدْ"-)) (بخاری، کتاب الجہاد والسیر۔ باب الجهاد باذن الوالدین)

(ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد میں جانے کی اجازت چاہی آپ ﷺ نے پوچھا؟ تیرے والدین زندہ ہیں؟ کہنے لگا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر جا کر ان دونوں کی خدمت بجالا"۔ (یہی تیرا جہاد ہے))

اور یہ شرط اس وقت بالخصوص ضروری ہو جاتی ہے۔ جبکہ والدین بوڑھے ہوں اور انہیں خدمت کی ضرورت ہو۔

(۷) تعلیم اور کردار:

دور نبوی ﷺ میں کسی بھرتی ہونے والے مجاہد کی تعلیم کا ٹیسٹ یا معیار ضروری نہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سب صحابہ ؓ قرآن کی تعلیم کے شیدائی اور اس کے عامل تھے۔ اور معرکہ کارزار میں شمولیت ہی ان سب باتوں کا واضح ثبوت تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج اسلامی ممالک میں بھی بھرتی کے وقت ریکروٹ کے اخلاق' دینی تعلیم یا ارکانِ اسلام کی پابندی سے متعلق پوچھا تک نہیں جاتا۔ اس کے بجائے محض محکمہ تعلیم کے سرٹیفکیٹ دیکھے جاتے ہیں۔ اور بھرتی کے بعد محکمہ پولیس کی معرفت اس بات کی تسلی کر لی جاتی ہے۔ کہ ریکروٹ کسی بڑے جرم میں ماخوذ تو نہیں۔ ایسے تعلیمی اور کریکٹر سرٹیفکیٹوں کی افادیت اپنی جگہ اہم ہی سہی لیکن ایک مجاہد بھرتی کرتے وقت اس کی دینی تعلیم اور اس کے ''مثبت کردار'' کا بھی جائزہ لینا چاہئے اور اسی لحاظ سے اسے عہدہ اور ترقی دینا چاہئے۔

(۱۰) عورتوں کی جہاد میں بالواسطہ شمولیت

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ عورتیں اصولاً جہاد کے فریضہ سے مستثنیٰ ہیں۔ تاہم عند الضرورت وہ میدان جنگ میں جا کر زخمیوں کو سنبھالنے' ان کی مرہم پٹی کرنے ان کے لیے پانی یا دوسری اشیائے ضرورت مہیا کرنے کی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں۔

''جنگ احد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اپنی پنڈلیاں کھولے جلدی جلدی پانی کی مشکیں پیٹھ پر لاد کر لاتیں اور مسلمانوں کو پلا کر پھر لینے چلی جاتیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کا زخم دھو رہی تھیں اور چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھر دی تاکہ خون تھم جائے۔ اور حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جنگ احد میں ہمارا کام یہ تھا کہ ہم لوگوں کو پانی پلاتے' زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے اور جو لوگ مارے جاتے ان کی لاشیں مدینہ کو لاتے تھے''۔

(بخاری کتاب الجہاد والسیر ۔ باب جہاد النساء)

یہ تمام احادیث ایسی ہیں جن سے عورتوں کی میدان جنگ میں محض شمولیت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن درج ذیل حدیث اس کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ حشرج بن زیادؓ اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں:۔

((أَنَّهَا خَرَجَتْ فِيْ غَزْوَةِ خَيْبَرَ نِسْوَةً فَبَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَعَثَ إِلَيْنَا فَجِئْنَا فَرَأَيْنَا فِيْهِ الْغَضَبَ فَقَالَ: بِمَعَ مَنْ خَرَجْتُنَّ وَبِإِذْنِ مَنْ خَرَجْتُنَّ؟ فَقُلْنَا. يَارَسُوْلَ اللّٰهِ خَرَجْنَا نَغْزِلُ الشَّعْرَ وَنُعِيْنُ بِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَعَنَا دَوَاءٌ لِلْجَرْحٰى وَنُنَاوِلُ السِّهَامَ وَ نَسْقِ السَّوِيْقَ. فَقَالَ قُمْنَ"۔ حَتّٰى إِذَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ خَيْبَرَ أَسْهَمَ لَنَا كَمَا أَسْهَمَ لِلرِّجَالِ. قَالَ فَقُلْتُ لَهَا: يَاجَدَّةُ: وَمَا كَانَ ذٰلِكَ؟ قَالَتْ تَمْرًا"۔)) (ابوداؤد کتاب الجہاد۔باب فی المراۃ والعبد یحذمان من الغنیمۃ)

(غزوہ خیبر میں ہم کچھ عورتیں بھی جہاد کے لیے ساتھ ہولیں۔ حضور اکرم ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ہمیں بلا بھیجا۔ ہم گئیں تو آپ ﷺ نے پوچھا: "تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں"؟ ہم نے کہا یارسول اللہ ﷺ! ہم سوت کاتی رہیں تا کہ اس کی اجرت سے اللہ کی راہ میں مدد کر سکیں ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوائیں ہیں۔ اور ہم تیر اٹھا اٹھا کر لائیں گی اور پیاسوں کو ستو پلائیں گی"۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اچھا ٹھہری رہو"۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ہاتھ خیبر فتح کیا۔ تو آپ ﷺ نے مردوں کی طرح ہمارا بھی (مال غنیمت سے) حصہ نکالا۔ راوی کہتا ہے میں نے کہا دادی یہ حصہ کیا تھا؟ اس نے کہا "کھجوریں"۔)

مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں میدان جنگ میں مندرجہ ذیل خدمات سرانجام دے سکتی ہیں:۔

(۱) زخمیوں[1] کی تیمارداری۔ مرہم پٹی زخمیوں اور بیماروں کو پیچھے محفوظ مقامات تک

[1] زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کی تیمارداری میں عورتیں اپنی نرم طبعی کی بنا پر مردوں سے عموماً زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اور شائد وہ اس معاملہ میں مردوں سے دلچسپی بھی زیادہ رکھتی ہیں۔ غزوۂ بنوقریظہ میں قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ تیر سے شدید زخمی ہو گئے۔ زخم سے خون تھمتا نہ تھا۔ ایک عورت رفیدہ نامی زخموں کے علاج میں شہرہ رکھتی تھی اور اس کا کلینک محض ایک سائبان تھا' مسجد نبوی کے بالکل قریب تھا۔ رسول اللہ نے علاج کی سہولت کے پیش نظر حضرت سعد بن معاذ کا خیمہ مسجد نبوی میں ہی لگوا دیا تھا۔ تا کہ بر وقت رفیدہ کی نگہداشت میں رہ سکیں۔ مگر افسوس کہ حضرت سعد اس کی کاری زخم سے جانبر نہ ہو سکے۔ (لابن حجر ذکر رفیدہ بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱۔ص ۴۴۲) جس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بوقت ضرورت عورت مرد کا اور اسی طرح مرد عورت کا علاج کر سکتے ہیں۔

پہنچانے کا بندوبست' لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا انتظام۔

(۲) مجاہدین' زخمیوں اور بیماروں کے پینے کے لئے پانی کا فراہم کرنا۔ ان کی خوراک تیار کر کے دینا۔ اور خورد و نوش سے متعلق کام سرانجام دینا۔

(۳) مجاہدین کو اسلحہ جنگ موقعہ پر مہیا کرنا۔ میدان جنگ میں گرا پڑا اسلحہ اکٹھا کر کے مجاہدین کو دوبارہ استعمال کے لئے بنا دینا یا اسلحہ اگر کہیں دور ہو تو اسے ان تک پہنچانا۔

گویا مجاہدین کا اصل کام حملہ کرنا یا دفاع کرنا ہوتا ہے اس اصل کام کو سرانجام دینے کے لیے' یا جنگ سے پیدا ہونے والے نتائج کے لیے جس قدر امدادی کاموں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان میں عورتیں بھی ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔ تاہم یہ یاد رہے کہ عورتیں یہ کام یا تو رضاکارانہ طور پر سرانجام دے سکتی ہیں (جیسا غزوہ خیبر میں ہوا) یا حالات کی نزاکت کے پیش نظر (جیسا کہ جنگ احد میں ہوا) یعنی اشد ضرورت کے وقت ان سے یہ کام لیے جا سکتے ہیں۔ عام حالات میں اصول یہی ہے کہ عورتیں باقاعدہ فوج کا حصہ نہیں بن سکتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی غنیمت سے ان رضاکار عورتوں کو صرف کھجوریں (جائیداد منقولہ کا حصہ) دیا۔ حالانکہ مجاہدین کو خیبر کی زمین (جائیداد غیر منقولہ) بھی تقسیم ہوئی تھی۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ عورتوں کو مستقل طور پر فوج میں بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ عند الضرورت وہ امدادی کاموں میں رضا و رغبت سے حصہ لے سکتی ہیں اور ان سے ایسے کام لیے بھی جا سکتے ہیں۔ جن کا انہیں معاوضہ ادا کیا جانا چاہئے۔ تاہم اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عورتوں کی شمولیت سے فوج میں فحاشی کے رجحانات کا فروغ نہ ہونے پائے۔

عورتوں کی طرح لڑکے بھی خدمت گزاری کے لئے جنگ میں لے جائے جا سکتے ہیں۔ لیکن انہیں بھی اموال غنیمت میں سے انعام کے طور پر کچھ دیا جا سکتا ہے۔ اموال غنیمت سے باقاعدہ حصہ نہیں نکالا جا سکتا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے عورتوں اور لڑکوں کی شمولیت اور حصہ غنیمت کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے اسے جواب دیا کہ:-

((وَسَأَلْتَ عَنِ الْمَرْاَةِ وَالْعَبْدِ هَلْ كَانَ لَهُمَا سَهْمٌ مَعْلُومٌ اِلَّا اَنْ يُحْذَيَا مِنْ غَنَائِمِ الْقَوْمِ.)) (مسلم۔ کتاب الجہاد و السیر۔ باب النساء الغازیات یُرضخ لھن ولا یُسھم)

(اور تو نے پوچھا عورت اور لڑکے کو کوئی حصہ ملے گا اگر وہ لڑائی میں شریک ہوں تو ان کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا مگر انعام کے طور پر غنیمت میں سے۔)

یہاں تک تو میدانِ جنگ میں عورتوں کی امدادی کارروائیوں کا ذکر تھا۔ اب ہم دور نبوی کا ایک ایسا واقعہ پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر لڑائی میدان جنگ کے بجائے محفوظ شہری آبادیوں میں داخل ہو جائے تو دفاع کے طور پر عورتوں کو بھی ...... اگر وہ کرسکیں تو ...... ایسا ہی کردار ادا کرنا چاہئے جیسا کہ مجاہد ادا کرتے ہیں۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی بہادری کا کارنامہ:

جنگ احزاب کے موقع پر بنو قریظہ معاہد کی حیثیت سے مدینہ میں رہ رہے تھے۔ لیکن بدعہدی کر کے 'اتحادیوں' سے مل گئے۔ ایک یہودی نے مسلمانوں کو مصروف جہاد دیکھ کر اس قلعہ پر جس میں مستورات پناہ گزین تھیں۔ حملہ کر دیا حضرت حسان بن ثابت اس قلعہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "اتر کر اس کو قتل کر دو"۔ حضرت حسان کسی عارضہ کی وجہ سے لڑائی سے گھبراتے تھے۔ کہنے لگے اگر میں ایسا کرسکتا تو میدان جنگ میں ہوتا"۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے خیمہ کی چوب اکھاڑی اور اس زور سے یہودی کے سر پر ضرب لگائی کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا اس کے ہتھیار اور کپڑے اتار لاؤ"۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں"۔ آخر صفیہ رضی اللہ عنہا نے خود ہی اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ یہودیوں کو یقین ہو گیا اس قلعہ میں مسلمان فوج متعین ہے۔ لہٰذا انہیں پھر حملہ کی جرأت نہ ہوئی۔

(طبری ج ا۔ جنگ خندق)

ام عمارہ رضی اللہ عنہا کی بہادری کا کارنامہ:

جنگ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ تو افراتفری مچ گئی۔ عورتیں بھی گھروں سے میدان جنگ میں نکل آئیں جو امدادی کام سرانجام دے رہی تھیں۔ انہیں میں سے ایک حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا تھیں جو زخمیوں کو پانی پلا رہی تھیں۔ آپ نے مشک اتار کر پھینک دی' تلوار کھینچ لی اور حضور ﷺ کے دفاع میں لڑنے لگیں۔ اس دن انہیں تیرہ زخم پہنچے اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئیں۔ جب ذرا ہوش آیا۔ تو نہ اپنے خاوند سے متعلق پوچھا اور نہ بیٹے

کے متعلق جو اس جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں لڑ رہے تھے۔ اگر پوچھا تو یہ کہ: کیف حال الرسول یعنی رسول اللہ ﷺ کس حال میں ہیں؟ (بخاری کتاب المناقب۔ ذکر ام سلیط)۔

موجودہ دور میں جنگ کے دوران عموماً دشمن کے بمبار جہاز آتے ہیں۔ اور جنگی یا شہری آبادیوں کو خبر کیے بغیر بمبارمنٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی فضائی حملہ سے بچاؤ کی تدابیر (A.R.P) اور ابتدائی طبی امداد کے کورس کروائے جائیں۔ تاکہ عورتیں بھی اپنی دفاعی ذمہ داریاں پوری کر سکیں۔

(۱۱) آلات حرب کی مسلسل مشقیں

جہاد کی تیاری کے سلسلہ میں آلات حرب کی فراہمی' ان کا استعمال اور ان کی مسلسل مشق بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود مسلمانوں کو اس طرف خصوصی توجہ دلائی ہے۔ فرمایا:-

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (۸ : ۶۰)

(اور ان دشمنوں کے لئے' جہاں تک ممکن ہو' حربی قوت اور گھوڑے تیار رکھنے سے مستعد رہو تاکہ اللہ تعالیٰ کے اور تمہارے دشمن دہشت زدہ اور سہمے رہیں۔)

دور نبوی ﷺ میں آلات حرب صرف تیر و کمان' نیزہ' تلوار اور اپنے دفاع کے لئے ڈھال زرہ اور خود پر مشتمل ہوتے تھے۔

دور جاہلیت کے عرب تیر اندازی میں ماہر تھے۔ باہمی جنگوں اور شکار کے مرغوب شغل نے انہیں اس کام میں اتنا ماہر بنا دیا تھا کہ اگر کوئی چاہتا کہ ہرن کی آنکھ کو نشانہ بنائے تو وہ اس میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

تیر' نیزہ اور تلوار کے علاوہ حبشی لوگ ایک اور قسم کا ہتھیار چلانے میں مہارت رکھتے تھے۔ جسے حرابہ کہتے تھے۔ یہ گول شکل کا تیز دھار والا ہتھیار جب استعمال کیا جاتا تو لٹو کی طرح اپنے گرد گھومتا ہوا تیزی سے دشمن کی طرف بڑھتا تھا۔ اور دشمن تک پہنچ کر اس کے جسم میں پیوست ہو جاتا یا پار نکل جاتا اور اسے مار دیتا۔

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ان سب آلات کے استعمال میں مہارت حاصل کرنے کی

تلقین فرمائی۔ سلمہ بن اکوع کہتے ہیں کہ:۔

((مَرَّ النَّبی صلی الله علیه وسلم علی نفر من اسلم یَنْتَضِلُوْنَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وسلم: اِرْمُوا بنی اسْمٰعِیلَ فَاِنَّ اَبَاکُمْ کَانَ رَامِیاً اِرْمُوْا وَاَنَا مَعَ بَنِیْ فُلَانٍ فَاَمْسَکَ اَحَدُ الْفَرِیْقَیْنِ بِاَیْدِیْهِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهِ وسلم: مَالَکُمْ لَا تَرْمُوْنَ"؟ قَالُوْا کَیْفَ نَرْمِیْ وَاَنْتَ مَعَهُمْ"؟ قَالَ النَّبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِرْمُوْا فَاَنَا مَعَکُمْ کُلِّکُمْ"۔))

(بخاری کتاب الجہاد والسیر باب التحریض علی الرمی)

نبی کریمؐ اسلم قبیلے کے کئی لوگوں پر گزرے جو (دو گروہ ہو کر) تیر مار رہے تھے۔ (تیر کی مشق کر رہے تھے) آپؐ نے فرمایا۔ اے بنی اسمٰعیل! تیر اندازی کی مشق کیا کرو کیونکہ تمہارے باپ اسمٰعیل تیر انداز تھے۔ اور میں اس گروہ کی طرف ہوتا ہوں یہ سن کر دوسرے گروہ نے کھیل ختم کر دیا۔ آپ نے تو انہیں کہا۔ تیر کیوں نہیں چلاتے۔ وہ کہنے لگا کیسے چلائیں آپؐ دوسرے فریق کے ساتھ ہو گئے"۔ آپ نے فرمایا۔"اچھا میں تم سب کے ساتھ ہوں۔ تیر چلاؤ (مشق جاری رکھو)

جنگی فنون سے آپ ﷺ کی دلچسپی کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

((بَیْنَا الْحَبَشَةُ یَلْعَبُوْنَ عِنْدَ النَّبِی صَلَّی اللّٰهُ وَسَلَّمْ بِحَرَابِهِمْ دَخَلَ عمر فاهوی الی الحصی فحصبهم بها فقال: "دعهُمْ یَا عُمر!" وزادَ عَلَیَّ حَدَّثَنَا عبدالرزاقِ اخبرنا مَعْمَرٌ فی المسجد۔))

(بخاری کتاب ایضاً باب اللھو بالحراب و نحوھا)

(ایک بار ایسا ہوا کہ حبشی لوگ آنحضرت ﷺ کے سامنے برچھیوں سے کھیل رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور یہ دیکھ کر کنکریوں کی طرف جھکے اور ان پر کنکر مارے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔"عمر رضی اللہ عنہ ان کو کھیلنے دے"۔ علی نے عبدالرزاق سے انہوں نے معمر سے اتنا زیادہ کیا کہ "یہ کھیل مسجد میں ہو رہا تھا"۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کے احترام کی وجہ سے حبشیوں کو روکنا چاہا تھا لیکن حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روک کر یہ واضح کر دیا کہ حربی فنون کی مشقیں مسجد میں بھی کی جا سکتی ہیں۔ بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:۔

((وَكَانَ يَوْمُ عِيدٍ يَلْعَبُ السُّوْدَانُ بِالدَّرَقِ وَالْحِرَابِ فَإِمَّا سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَإِمَّا قَالَ لِيْ "تَشْتَهِيْنَ اَنْ تَنْظُرِيْ؟" فَقُلْتُ "نَعَمْ" فَاَقَامَنِيْ وَرَآءَهُ خَدِّيْ عَلٰى خَدِّهٖ وَيَقُوْلُ: "دُوْنَكُمْ بَنِيْ اَرْفَدَةَ" حَتّٰى اِذَا مَلِلْتُ قَالَ: حَسْبُكِ؟ قُلْتُ. "نَعَمْ"! قَالَ "فَاذْهَبِيْ"-)) (بخاری حوالہ ایضاً)

(یہ عید کا دن تھا۔ حبشی سپر اور برچھوں سے کھیل رہے تھے یا تو میں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی یا آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا۔ ''کیا تو یہ تماشا دیکھنا پسند کرتی ہے''؟ میں نے کہا ''جی ہاں''۔ آپ ﷺ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔ میرا گال آپ ﷺ کی گال پر تھا اور آپ ﷺ حبشیوں سے فرما رہے تھے ''بنی ارفدہ! کھیل تماشا جاری رکھو''۔ میں تماشہ دیکھتے دیکھتے خود ہی تھک گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا۔ ''بس طبیعت سیر ہو گئی؟ میں نے عرض کیا ''جی ہاں'' آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اچھا چلی جاؤ''۔)

تلوار کے استعمال سے آپ ﷺ کو اتنی دلچسپی تھی کہ بسا اوقات دوران جنگ آپ تلوار گلے میں لٹکائے رکھتے تھے۔ امام بخاری نے اس کتاب میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے الجنہ تحت بارقة السيوف۔ یعنی جنت تلواروں کے سایہ تلے ہے۔

نیزہ اور اس کے استعمال سے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:-

((جُعِلَ رِزْقِیْ تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِیْ وَ جُعِلَ الذِّلَّةُ وَالصَّغَارُ عَلٰى مَنْ خَالَفَ اَمْرِیْ-)) (بخاری کتاب الجہاد- باب ماقیل فی الرماح)

(میری روزی بھالے کے سائے تلے ہے اور جو میرا حکم نہ مانے اس پر ذلت اور خواری مسلط ہو گی۔)

آج کے مشینی دور سے پہلے جنگ میں بطور سواری اکثر گھوڑے ہی استعمال ہوتے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قوت یعنی آلات حرب کے ساتھ گھوڑوں کو پال پوس کر تیار رکھنے کی بھی تاکید فرمائی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

((مَنِ احْتَبَسَ فَرَسًا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِيْمَانًا بِاللّٰهِ وَتَصْدِيْقًا بِوَعْدِهٖ فَاِنَّ شِبَعَهٗ وَرِيَّهٗ وَرَوْثَهٗ وَبَوْلَهٗ فِیْ مِيْزَانِهٖ يَوْمَ

(جس شخص نے ایمان کے ساتھ اللہ کے وعدے کو جو اس نے مجاہدین سے کیا ہے۔ سچا سمجھ کر جہاد کے لئے گھوڑا باندھ رکھے تو

الْقِيَامَةِ-)) (بخاری' کتاب ایضا) اس کی کھلائی' پلائی' لید اور پیشاب سب کچھ اس کے اعمال کے ترازو میں رکھے جائیں گے۔)

اموال غنیمت میں سے آپ نے مجاہد کے لئے ایک حصہ اور گھوڑے کے لئے[1] دو حصے مقرر فرمائے۔ اس کی مندرجہ ذیل دو وجوہ تھیں:۔

(۱) اس دور میں نہ تو مجاہدین یا سپاہیوں کو تنخواہ ملتی تھی اور نہ اسلحہ جنگ اور گھوڑے وغیرہ۔ اپنے علاوہ گھوڑوں کی پرورش بھی مجاہدین کی ذمہ تھی اور یہ تو ظاہر ہے کہ گھوڑے کی خوراک پر آدمی سے کئی گنا زیادہ خرچ اٹھتا ہے۔

(۲) گھوڑے کے دو حصے مقرر کرنے میں یہ حکمت بھی تھی کہ مجاہدین کو گھوڑے پالنے کی طرف زیادہ سے زیادہ رغبت ہو۔

جاہلیت کی رسوم میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کے ہتھیار توڑ ڈالتے اور جانور مار ڈالتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس رسم کو یوں ختم کیا جب آپ ﷺ فوت ہوئے تو آپ ﷺ نے مال و اسباب کی قسم کی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ اور اگر کچھ چھوڑا تو وہ یہی آلات حرب تھے۔ یعنی کچھ ہتھیار اور ایک سفید خچر۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب بغلة النبی)

آلات حرب سے مسلمانوں کی دلدادگی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف اس بات پر اکتفا نہیں کیا کہ اسلحہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں تیار رکھا جائے یا بہتر طریق سے استعمال کیا جائے۔ بلکہ ان میں نئے آلات حرب کی ایجادات کا بھی شوق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جنگ طائف میں مسلمانوں نے منجنیق' دبابہ اور ضبوریہ تین نئے آلات استعمال کیے۔ منجنیق ایک قلعہ شکن آلہ تھا جو توپ کی طرح ایک مقام پر نصب کیا جاتا اور بارود کے گولوں کی بجائے پتھر برساتا تھا۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق اسلام میں سب سے پہلے منجنیق کا استعمال آنحضرت ﷺ نے محاصرہ طائف کے وقت فرمایا: جس سے اہل عرب پہلے آشنا نہ تھے۔ دوسرا جنگی آلہ جو محاصرہ کے دوران استعمال کیا گیا وہ دبابہ تھا سپاہی اس کے اندرونی حصہ میں داخل ہو جاتے اور

---

[1] واضح رہے کہ اگر کسی مجاہد کے پاس ایک کے بجائے دو یا تین گھوڑے ہوں تو بھی گھوڑوں کا حصہ مجاہد سے دگنا ہی رہے گا۔ چوگنا یا چھ گنا نہیں رہے گا۔ فقہاء حنفیہ ہر گھوڑے کا الگ حصہ شمار کرتے ہیں۔

اسے ریلتے ہوئے قلعہ کی دیواروں تک بڑھاتے چلے جاتے اور وہاں پہنچ کر قلعہ کی دیواروں میں سوراخ پیدا کر دیتے تھے۔ دبابہ کی چھت ان سپاہیوں کو دشمنوں کے تیروں سے محفوظ رکھتی تھی۔ اور تیسرا جنگی آلہ ضبور تھا۔ جو اس جنگ میں استعمال ہوا۔ حملہ آور اس کے اندر بیٹھ کر دشمن کے قلعوں تک پہنچتے اور وہاں ان سے لڑتے۔ آج کل یہ آلہ ٹینک کے نام سے معروف ہے۔ جو اسی ضبور کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ (طبری ج ا۔ غزوہ طائف)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے بحری بیڑہ تیار کر لیا۔ پھر اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ رومی بیڑے کی حیثیت بھی ختم کر دی۔ آئندہ بھی مسلمان اس میدان میں پیش پیش رہے۔

پھر بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے اس پہلو سے غفلت برتی تو حضور اکرم ﷺ کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ وَجُعِلَ الذِّلَّةُ والصَّغارُ علٰی مَنْ خَالَفَ اَمْرِیْ اور یہ ادبار و نکبت آج تک اسی وجہ سے مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہے۔ اور آج بھی اس مصیبت کا علاج یہی ہے کہ مسلمان انفرادی اور حکومتی سطح پر اس پہلو پر خاص توجہ دیں۔

(۱۲) سرحدوں کی حفاظت:

کسی ریاست کے استحکام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مملوکہ یا زیر اثر کے کناروں پر فوجی چوکیاں قائم کرے۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ﴾ (۸:۶۰)

(جہاں تک ہو سکے فوج کی جمعیت کے زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے مقابلے کے لیے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے اور تمہارے دشمنوں اور ان کے علاوہ دوسروں پر تمہاری دھاک بیٹھی رہے گی۔)

اور دوسرے مقام پر فرمایا:۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۳:۲۰۰)

(اے ایمان والو! کفار کے مقابلے میں ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور مورچوں پر جمے رہو اور خدا سے ڈرو تا کہ تم مراد حاصل کرو۔)

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:۔

((رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَافِيْهَا۔)) (بخاری۔ کتاب الجهاد والسیر۔باب رباط یوم فی سبیل الله) (ایک دن رباط یعنی سرحدی چوکیوں میں بسر کرنا دنیا میں اور جو کچھ اس میں ہے سب سے بہتر ہے)

ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا:۔

((رِبَاطِ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهٖ اِنْ مَاتَ جرى عليه عمله الذى يَعْمَلُهُ واَجرى عليه رزقه وَامَنَ الْفَتَانَ۔)) (مسلم۔کتاب الجهاد۔باب تفضيل الرباط) (ایک دن رات پہرہ چوکی دنیا ایک ماہ کے روزہ اور قیام سے بہتر ہے۔اگر (پہرہ دار) مر جائے گا تو اس کا یہ عمل جاری رہے گا اور اس کو اس پر اجر دیا جائے گا اور فتنوں سے وہ امن میں رہے گا۔)

بعض فقہاء رباط کو جہاد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔وجہ یہ ہے کہ جہاد غیر مسلموں سے کیا جاتا ہے اور رباط خود مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کے ابتدائی سالوں میں مدینہ کے اردگرد بسنے والے مشرک قبائل آپس میں گٹھ جوڑ کر کے مدینہ پر حملہ کرتے رہتے تھے۔آپ ان کے حالات سے ہر لحظہ باخبر رہتے اور جب محسوس کرتے کہ کوئی مدینہ کی طرف بری نظروں سے دیکھ رہا ہے تو فوراً خود وہاں پہنچ جاتے یا سرایا بھیج دیتے۔صلح حدیبیہ سے پہلے اکثر ایسے واقعات پیش آتے رہے۔اور بسا اوقات یوں ہوا کہ دشمن اسلامی دستوں کی خبر پا کر تتر بتر ہو جاتا تھا۔

۹ ھ میں جبکہ عرب کا بیشتر حصہ اسلام کے زیر نگین آ چکا تھا۔شام کی سرحد پر عرب عیسائیوں نے جو قیصر روم کے زیر اثر تھے۔مسلمانوں کی سرحد پر فوج اکٹھی کرنا شروع کر دی تھی۔غزوۂ تبوک اسی وجہ سے پیش آیا تھا لیکن اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی دشمن کا لشکر منتشر ہو گیا اور جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔

دورِ فاروقی میں جب اسلامی سلطنت کی سرحدیں بہت وسیع ہو گئیں۔تو سرحدوں پر فوجی چھاؤنیاں قائم کر دی گئیں جہاں ہر وقت فوج موجود رہتی تھی تاکہ دشمن کی نقل و حرکت کی بروقت سرکوبی کی جا سکے۔

(۱۳) جنگ اور تعلقات خارجہ

جنگ کا خارجہ پالیسی کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے اس سلسلہ میں مسلمانوں کو مندرجہ ذیل ہدایات دی گئی ہیں۔

(۱) دوستانہ تعلقات:

غیر مسلم اقوام سے صلح کے معاہدے تو کرنے کی اجازت ہے لیکن دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔﴾ (۶۰:۱)

(اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو جو غیر مسلم ہیں دوست نہ بناؤ۔)

اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) کافر مسلمان کا حقیقی خیر خواہ کبھی نہیں بن سکتا۔اس کی دوستی صرف اس وقت تک ہوگی جب تک اس کا اپنا مفاد وابستہ ہوگا۔ذرا بھی مفادات میں فرق آیا تو وہ اسی وقت کفر کی دوسری طاقتوں سے مل جائے گا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ۔﴾ (۵۸:۲۲)

(تمہیں ایسی کوئی قوم نہ ملے گی جو اللہ اور قیامت پر ایمان بھی رکھے پھر ایسی قوم سے دوستی بھی رکھے جو اللہ اور رسول کی مخالفت کرتی ہو۔ چاہے وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا بھائی یا دوسرے رشتہ دار۔)

(۲) غیر مسلم کی دوستی سے ملکی اور فوجی راز افشا ہونے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔کیونکہ جس سے دوستی ہو اس سے ایسے راز چھپانا ناممکن ہوتا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ۔﴾ (۳:۱۱۸)

(اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی دوسرے کو راز دار مت بناؤ۔ یہ لوگ تمہارے نقصان میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ تمہارے نقصان اور تمہاری تکلیف میں ان کی خوشی ہے۔)

آج مسلمانوں کے "دوست غیر مسلم ممالک" اقتصادی امداد کے نام پر فنی ماہرین بھی ساتھ بھیجتے ہیں۔ جو فنی مہارت کا کام تو کم ہی سرانجام دیتے ہیں۔ البتہ ملک کے راز بڑی سرگرمی سے اپنی حکومتوں کو مہیا کرتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمان ملکوں کی حکومتوں کے آئے دن تختے الٹائے جاتے ہیں۔ غیر مسلم دوستوں سے مشترکہ دفاع کے سمجھوتے بھی نہیں کیے جاسکتے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝﴾ (۴:۱۰۷)

(جو لوگ خود اپنے نفس سے دھوکہ کرتے ہیں ان کی حمایت میں نہ لڑو۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو دغاباز اور بدکردار ہوں۔)

(۳) غیر مسلم ممالک سے دوستی کا تیسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ثقافت کے نام پر اس ملک کے باطل نظریات مسلمانوں میں پرورش پانے لگتے ہیں۔ فحاشی اور بے حیائی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور جن منکرات کے استیصال کے لیے جہاد فرض قرار دیا گیا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور خود مسلمان ممالک میں فروغ پانے لگتے ہیں۔

(۲) معاہدات:

دوسرے ممالک سے برابر کی سطح پر معاہدات کرنے کی اجازت ہے۔ یہ معاہدات امن وصلح کے بھی ہو سکتے ہیں تجارتی بھی اور امان کے بھی۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خوب سمجھ کر معاہدات کریں۔ کیونکہ جب کوئی قوم صلح کی پیش کش کرے یا کوئی فرد یا قوم امان مانگے تو مسلمان پر اسے قبول کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ ان معاہدات کو ایفا کرنا مسلمان کی اولین ذمہ داری ہے۔ خواہ دشمن اس طریق سے مسلمانوں کو دغا دے جائے۔ اگر ایسی صورت ہو تو دشمن کو معاہدہ کے کینسل کر دینے کا الٹی میٹم دینا ضروری ہے۔ بعد میں مناسب کاروائی کی جاسکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

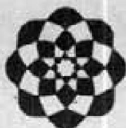
﴿وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔﴾

اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو۔

یعنی معاہدہ منسوخ اور اب ہر فریق اپنی اپنی جگہ آزاد ہے۔ جیسی کاروائی مناسب سمجھے کرے۔

(۳) سفارتی تعلقات:

غیر ممالک کے خواہ یہ ملک دوست ہو' غیر جانبدار ہو یا دشمن ہو۔سفیروں سے اچھی طرح پیش آنا' ان سے بہتر سلوک کرنا اور انہیں مناسب آرام پہنچانا اور مراعات دینا ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ سفارت کی تکریم کے لیے حضور اکرم ﷺ نے بہت تاکید فرمائی ہے۔ اگر کوئی ملک مسلم سفیر سے بدسلوکی کرے یا اسے قتل کر دے۔ تو یہ بات جنگ کا سبب بن جاتی ہے۔ آج کل ہر ملک میں دوسرے ممالک کے سفارت خانے قائم ہیں۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو تو پہلے اس ملک سے سفارتی تعلقات ختم کر دینا چاہئیں۔ یہ گویا جنگ کا الٹی میٹم ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر تلافی نہ ہو تو جنگ شروع کی جا سکتی ہے۔



باب سوم

میدانِ کارزار اور فوج کولڑانے کی مہارت

جب دونوں متحارب فریق آمنے سامنے آ جائیں تو ایک بہتر جرنیل کو مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

(۱) میدانِ جنگ کا صحیح انتخاب:

میدانِ جنگ کا صحیح انتخاب بھی فتح کا ایک موثر سبب ہوتا ہے۔ جنگ بدر کے موقع پر قریش مکہ نے پہلے پہنچ کر حسب پسند مقامات پر قبضہ کر لیا۔ جو جنگ کے لیے موزوں سمجھتے تھے۔ ناچار مسلمانوں کو ایسی جگہ پڑاؤ ڈالنا پڑا جہاں نہ کوئی کنواں تھا نہ چشمہ زمین ریتلی تھی جہاں پاؤں بھی نہیں جم سکتے تھے۔ آپ ﷺ اسی سوچ میں تھے کہ ایک صحابی حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اس مقام پر پڑاؤ ڈالنا جنگی تدبیر ہے یا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا! ''یہ جنگی تدبیر سے تعلق رکھتا ہے۔'' حباب رضی اللہ عنہ نے کہا پھر آپ ﷺ لوگوں کو آگے لے چلیں چشمہ پر قبضہ کر لیں اور تالاب بنا کر پانی سے پر کر لیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فوراً اس تجویز پر عمل کیا۔[1] یہ جگہ کفار کے پڑاؤ سے اونچی تھی۔ مزید براں اللہ تعالیٰ کی مہربانی یہ ہوئی کہ مینہ برس گیا۔ زمین جم کر اور سخت ہو گئی۔ جبکہ اسی پانی نے نیچے بہہ کر کفار کے پڑاؤ میں دلدلی کیفیت پیدا کر دی۔ اس موقع پر بارش کا نزول دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد اور خاص رحمت تھی۔

دوسری تدبیر آپ ﷺ نے یہ کی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے اپنا خیمہ ایک ایسے بلند مقام پر نصب کیا جہاں آپ ﷺ تیروں کی زد سے بھی محفوظ رہ سکتے تھے اور لڑائی کا نقشہ بھی بخوبی ملاحظہ فرما سکتے تھے۔

---

[1] طبری ج ۱ غزوۂ بدر

اور تیسری تدبیر یہ تھی کہ اس خیمہ کے پاس چند سواری کے جانور رکھے گئے- ایک طرف کفار مکہ کا ایک ہزار کا لشکر جو آلاتِ حرب وضرب سے پوری طرح مسلح تھا خوراک وافر تھی- ہر روز دس اونٹ ذبح کیے جاتے اور شراب کا بھی دور چلتا تھا- دوسری طرف تین سو تیرہ مسلمان (تہائی سے بھی کم) اور وہ بھی نہتے' کمزور اور سامانِ خوراک سے بھی عاجز- اندریں حالات جنگ کے دوران کسی وقت بھی مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑ جانے کا اندیشہ ایک فطری امر تھا خیمہ کے پاس سواریاں اس لیے رکھ لی گئیں کہ خدانخواستہ اگر ایسی صورت پیدا ہو تو مدینہ سے فوری طور پر کمک مہیا کی جا سکے[1]

(۲) صف بندی اور طریق جنگ:

مسلمان صف بندی کا طریق تو نماز سے ہی سیکھ چکے تھے- تاہم آپ ﷺ نے میدانِ بدر میں اس کا بالخصوص اہتمام کیا- آپ ﷺ ایک چھڑی لے کر خود مسلمانوں کی صفوں کو درست اور سیدھا کر رہے تھے- صف بندی قریش مکہ نے بھی کی تھی- لیکن ان میں ایسا نظم وضبط ہرگز نہ تھا- دوسرا اہتمام آپ ﷺ نے یہ کیا کہ مسلمانوں کی اس انداز سے صف بندی کی کہ وہ اپنی اصل تعداد سے کئی گنا زیادہ نظر آ رہے تھے- قرآن کریم نے اس منظر کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰی كَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ-﴾ (۱۳:۳)

(ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا- دوسرا کفار کا گروہ تھا- جو مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے اپنے سے دگنا مشاہدہ کر رہا تھا-)

صف بندی کی اصل غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی خاص مقام پر دشمن کے حملہ کا دباؤ بڑھ جائے تو فوج کا آپس میں رابطہ منقطع نہ ہونے پائے- صف بندی کے دوران حضور ﷺ نے اس بات کو بالخصوص ملحوظ رکھا تھا-

صف بندی کے علاوہ مورچہ بندی' مورچوں کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب' ان میں مناسب افراد کا تعین' یہ سب امور سپہ سالار کی صوابدید پر منحصر ہوتے ہیں- اللہ تعالیٰ جنگ احد کا نقشہ ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:-

---

[1] طبری ج ۲ غزوۂ بدر

﴿وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾- (۱۲۱:۳) (اور اے نبیؐ جب تم صبح اپنے گھر سے روانہ ہو کر ایمان والوں کو لڑائی کے لیے موروچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کر رہے تھے-)

اور لغوی لحاظ سے فقط تَبَوَّ اَ کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کسی رہائشی جگہ کی فضا اور ماحول رہنے والے کی طبیعت کے موافق اور سازگار ہو یا کوئی شخص جس مقصد کے لیے کسی جگہ کا انتخاب کرتا ہے وہ اس کے لیے موافق اور سازگار ہو-

عہدِ جاہلیت میں عرب جنگ کے دوران کر وفر کے اصول کے تحت لڑتے تھے- وہ دشمن پر حملہ کرتے (کرّ) اور جب اپنے اندر کوئی کمزوری دیکھتے تو بھاگ کھڑے ہوتے- (فرّ) اس کے بعد پھر لوٹ کر حملہ آور ہوتے اور جب تک جنگ جاری رہتی بغیر کسی ضابطہ یا نظام کے اسی طرح لڑتے رہتے- اُس طریق جنگ میں نہ کوئی نظم رہ سکتا تھا اور نہ ہی کامیابی کی کوئی ضمانت ہو سکتی تھی- اس لیے مسلمانوں کو باقاعدہ صف بندی کا حکم دیا گیا- ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾- (۴:۶۱) (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں یوں صفیں باندھ کر لڑتے ہیں جیسے سیسہ پلائی دیوار ہے-)

چنانچہ دورِ نبوی ﷺ میں مسلمان نماز کی طرح ہی جنگ کے لیے بھی صف بندی کرتے تھے- شانہ سے شانہ ملائے دشمن کی طرف بڑھتے اور ایک انچ بھی صف سے آگے پیچھے نہ ہوتے- جب تک فوج صف بہ صف نہ ہو اس وقت تک اس کے مختلف شعبوں کا توازن صحیح نہیں رہ سکتا- تیر انداز، شمشیر زن، نیزہ بردار اور سوار مختلف سمتوں اور مختلف رفتار سے میدان جنگ میں استعمال کیے جاتے تھے- مگر ان میں توازن اسی صورت میں قائم رکھا جا سکتا تھا- جب ان میں ہر ایک اپنی اپنی صف میں جگہ پہچان لیتا- اور پھر اسے قائم رکھتا ورنہ احتمال رہتا تھا کہ سوار کہیں وقت سے پہلے یا وقت کے بعد دشمن سے ملاپ نہ کر پائے- اس قسم کے بے ترتیبی میں شکست کے امکان پیدا ہو جاتے ہیں-

پڑاؤ کے انتخاب اور صف بندی کے دوران سورج کی روشنی اور ہواؤں کے رخ کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے- تاکہ دشمن کی تلواروں کی حرکت سے مسلمانوں کی آنکھیں چندھیا نہ جائیں- اور ہواؤں کے رخ کے متعلق صحیح انتخاب کا ہی یہ نتیجہ تھا- کہ آپ ﷺ نے عین اس وقت جب

معرکہ کارزار گرم تھا آپ ﷺ نے مٹھی بھر ریت کفار کی طرف پھینکی تو ہواؤں نے ان ذرات کو اڑا کر کفار کی آنکھوں میں ڈال کر انہیں چندھیا دیا اس عمل میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مدد کو اپنے خاص احسان سے تعبیر فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔﴾ (۸:۱۷)

(اے مسلمانو! کفار کو تم نے نہیں وہ تو اللہ نے مارا تھا اور نہ ہی اے پیغمبر! جو مٹھی تم نے پھینکی وہ تم نے نہیں پھینکی بلکہ وہ تو اللہ نے پھینکی تھی۔)

یہ ہے تائید ایزدی کا صحیح مفہوم۔ اس موقع پر بارش کا نزول اور ہواؤں کے رخ سے ریت کے ذرات کا کفار کی آنکھوں کو نشانہ بنانا اللہ کی بہت بڑی امداد ثابت ہوئے۔ لیکن یہ امداد اس وقت آئی جب مسلمان اپنے مادی وسائل سے مقدور بھر استفادہ کر چکے تھے۔

آج کی افواج میں بحری بیڑے، بری فوج اور فضائیہ میں توازن نہ ہو تو جنگ صحیح معنوں میں لڑی ہی نہیں جا سکتی اور اس توازن کو افواج سہ گانہ کی متوازن تیاری کے بعد ان کا استعمال بھی ایسے منصوبے کے ماتحت ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کو مدد دے سکیں تا کہ ایک کی ضرب دوسرے کو آگے بڑھنے میں مدد دے۔ اس طرح کی جنگ کو صف بہ صف جنگ یا متوازن منصوبے کی جنگ کہتے ہیں۔

مذکورہ آیت میں سیسے کی دیوار کی مثال دی گئی ہے۔ سیسہ ایسی دھات ہے جو مضبوط ہوتی ہے اور لچک دار بھی۔ اور یہی دو صفات افواج میں ہونی چاہئیں۔ تا کہ دشمن کی ضربات سے صف ٹوٹنے نہ پائے۔ اور اس محاذ کا کوئی حصہ کمزور نہ ہو جائے۔ لچک کی وجہ سے صرف معمولی طور پر اور وقتی طور پر دب جائے اور جونہی دشمنوں کا دباؤ ہٹے اسی وقت پھر اپنے پہلے مقام پر چلا جائے۔

(۳) جنگی نقشہ کی فوری تبدیلی:

معرکہ کارزار میں ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اور شکست کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اس وقت ایک بہترین اور حاضر دماغ جرنیل کا کام یہ ہوتا ہے کہ فوراً بڑا تبدیل کر کے نقشہ جنگ کو بدل کر فتح و شکست کا رخ موڑ دے۔ جنگ احد کے موقع پر جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور ابن قمیہ نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ قتل ہو گئے۔ تو آپ ﷺ نے فوراً نقشہ جنگ بدل دیا۔ اور پہاڑی کے ایک محفوظ اور بلند مقام پر

تشریف لے گئے۔ گویا اب مسلمان فوج کا مرکز و محور یہ مقام تھا۔ یہیں سے آپ ﷺ نے شکستہ دل اور بدحواس فوج کو پکار پکار کر بلایا اور بکھری ہوئی فوج پھر جمع ہو گئی۔ اور مسلمان شکست سے بچ گئے۔

(۴) اقدام:

معرکہ کارزار میں اقدام کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب فتح و شکست کا کوئی فیصلہ نہ ہو رہا ہو تو کوئی ایک فوج پوری قوت سے دشمن کے قلب پر حملہ کر کے اسے پسپائی پر مجبور کر دے۔ آپ نے جنگ احد کے موقع پر یہی تدبیر استعمال کی اور کفارِ قریش فتح و شکست کا فیصلہ ہوئے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ چنانچہ راستہ میں ابوسفیان سپہ سالار قریش کو یہ خیال آیا کہ کام تو ادھورا رہ گیا۔ واپس مڑ کر حملہ کرنا چاہیے ادھر حضور اکرم ﷺ کو بھی ایسا ہی خیال آیا۔ اور آپ ﷺ نے کفار کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا' اللہ تعالیٰ نے نہایت وضاحت سے ارشاد فرمایا کہ:۔

﴿وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَاۗءِ الْقَوْمِ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّھُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ۔﴾ (۴:۱۰۴)

(اور دشمن کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تمہیں دکھ پہنچا ہے تو انہیں بھی تو دکھ پہنچا ہے جیسے تمہیں پہنچا ہے پھر تم اللہ تعالیٰ سے ایسی امیدیں بھی (جنت و انعام) رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے۔)

چنانچہ دوسرے دن آپ زخموں سے چور ستر صحابہ کی معیت لیے تعاقب کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اور مدینہ سے آٹھ میل دور ایک مقام حمراء الاسد پر جا کر ڈیرہ ڈالا۔ اور تین دن قیام فرمایا۔ اس تعاقبی سفر کو غزوہ حمراء الاسد کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہاں قطعاً جنگ نہیں ہوئی۔ ہوا یہ تھا کہ ابوسفیان کا لشکر روحا کے مقام پر پڑاؤ ڈالے مسلمانوں پر مڑ کر حملہ کر کے سارا قصہ پاک کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ انہیں ایک شخص معبد خزاعی ملا۔ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن مسلمانوں کا خیر خواہ ضرور تھا۔ اس سے ابوسفیان نے مسلمانوں کی کیفیت پوچھی تو کہنے لگا کہ ''محمد ﷺ ایک بہت بھاری لشکر لے کر تمہاری تلاش میں چڑھے آ رہے ہیں۔ اب ان میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ جو میدانِ جنگ میں موجود نہ تھے۔ اور انہیں اس موقع کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس ہے۔'' (طبری ج ا غزوہ احد)

---

[1] بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب الذین استجابوا اللہ وللرسول

ابوسفیان نے جب یہ کیفیت سنی تو اسے واپس مڑ کر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ معبد خزاعی کا یہ کردار بھی فی الحقیقت نصرت الٰہی تھی۔

دعا و مناجات اور نزول ملائکہ:

اگر خالصتاً مادی ذہنیت کو ملحوظ رکھا جائے تو دعا و مناجات اور نصرت الٰہی کا تصور خارج از بحث قرار پاتا ہے۔ جبکہ مسلمان مادی وسائل سے بھرپور استفادہ تو کرتا ہے۔ لیکن ان پر تکیہ کبھی نہیں کرتا۔ اور انجام کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے اس کا ایمان ہے کہ نتائج کے عوامل صرف مادی اور ظاہری اسباب ہی نہیں ہوا کرتے بلکہ اور بھی کئی غیر مرئی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو حالات کا رخ موڑ دینے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کئی مثالوں سے واضح ہو چکا ہے۔ محض مادی وسائل پر تکیہ کرنے کی تردید میں ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ ـــــ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۲:۲۴۹) (کتنی ہی بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھاری جمعیت پر غالب آ جاتی ہے۔)

اور مسلمانوں سے تو تقریباً ہر جنگ میں ایسا ہی معاملہ پیش[1] آتا رہا ہے۔

غیر مرئی اسباب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ لہٰذا مسلمان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ مادی وسائل سے بھی بھرپور تیاری کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و انکسار کا اظہار اور فتح و کامرانی کے لیے دعا بھی کرتا رہے۔ جنگ بدر میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے مادی وسائل سے بھی بھرپور استفادہ کیا اور جنگی تدابیر میں اپنی تمام صلاحیتیں بھی صرف کیں۔ لیکن اس کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ کام بھی کیا کہ پڑاؤ ڈالنے کے بعد مسلمان تو رات بھر سو رہے تھے۔ اور آپ ﷺ نے اپنے خیمہ ''عریش'' میں یہ رات اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گزار دی۔ آپ ﷺ رو رو کر مسلمانوں کے لیے فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ عبداللہ بن عباس ..... کہتے ہیں۔

﴿قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِيْ قُبَّةٍ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَنْشُدُكَ (نبی اکرم ﷺ (بدر کے دن) ایک خیمہ میں تھے۔ آپ نے یوں دعا کی ''یا اللہ اب

---

[1] فلپ کے حتی (HITTI) تاریخ عرب میں لکھتا ہے کہ ''مسلمان عربوں کی فوجی قوت نہ ساز و سامان جنگ کی برتری پر مبنی تھی نہ نظم و تربیت کی عمدگی پر بلکہ اس کا اصل راز ہمت اور حوصلہ کی برتری تھی۔ جس میں مذہب نے بلاشبہ اپنا حصہ پیش کیا۔''

عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ اللّٰهُمَّ اِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ فَاَخَذَ اَبُوْبَكْرٍ بِيَدِهٖ فَقَالَ حَسْبُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَدْ اَلْحَحْتَ عَلٰى رَبِّكَ۔" وَهُوَ فِي الدِّرْعِ فَخَرَجَ وَيَقُوْلُ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔﴾ (بخاری۔کتاب الجهاد۔باب ماقیل فی درع النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

میں وعدے اور تیرے اقرار کو تجھ سے چاہتا ہوں۔ اے اللہ اگر تیری مرضی یہ ہو (مسلمانوں کی مٹھی بھر جمعیت ختم ہو جائے) تو آج کے دن سے تیری عبادت بند ہو جائے گی۔ حضرت ابو بکر ؓ نے آپ کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگے "یارسول اللہ ﷺ اب بس کیجئے آپ ﷺ نے اپنے پروردگار سے دعا میں حد کردی" آپ ﷺ اس وقت زرہ پہنے ہوئے تھے خیمہ سے نکلے تو یہ آیت زبان پر جاری گئی۔"اب کوئی دم میں کافروں کا گروہ شکست کھا کر پسپا ہو جائے گا۔")

اس رات بھر دعا کے نتیجہ میں آپ ﷺ کو فتح کی بشارت مل گئی۔ اور اس فتح کے بے شمار غیر مرئی اسباب پیدا ہو گئے۔ مثلاً بارش کا نزول' ہوا کا رخ اور کافروں کے دل میں رعب کا طاری ہونا۔ مسلمانوں کے دلوں کا ثابت قدم رہنا' اور فرشتوں کا نزول یہ اسباب بھی غیر مرئی ہیں اور فرشتے بھی غیر مرئی۔ ان کا آپس میں کیا تعلق ہے یہ نہ ہم جان سکتے ہیں نہ جاننے کے مکلف ہیں۔ تاہم یہ ایسے حقائق ثابتہ ہیں جن سے مجال انکار نہیں۔ نصرت الٰہی اور نزول ملائکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ۔﴾ (۸:۱۲)

(جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔ میں کافروں کے دلوں میں رعب و ہیبت ڈال دیتا ہوں۔ تم ان کی گردنیں اڑا دو اور بند بند توڑ دو۔)

اور حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے:۔

((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یومُ بدرٍ "ھذا جبرئیلُ اخذ براس فرسه علیه اداة الحرب۔"))

(نبی ﷺ نے بدر کے دن فرمایا: یہ جبریل آن پہنچے اپنے گھوڑے کو تھامے ہوئے ہتھیار لگائے ہوئے۔)

(بخاری - کتاب المغازی - باب شهود الملئكة بدرا)

اسی طرح جنگ احد میں بھی ملائکہ کے نزول سے متعلق اسی باب میں کئی احادیث موجود ہیں - اور ایسی احادیث بھی ہیں جن میں صحابہ کا بیان ہے کہ وہ فرشتوں کے مارے ہوئے کافروں اور مسلمان کے ہاتھوں مقتولین کے درمیان امتیاز بھی کر لیتے تھے - تاہم اگر ہم اس نصرت الٰہی کو مادی زبان میں ہی ادا کرنا چاہیں - تو صورت یہ ہوگی کہ کفار اپنے سرداروں کے قتل شکست کے غم اور جنگ کی محنت سے اتنے نڈھال ہو گئے تھے کہ ان کا بند بند چور ہو رہا تھا -

پھر یہ نصرت الٰہی حضور اکرم ﷺ یا دور نبوی ﷺ کے مسلمانوں سے بھی مخصوص نہیں - جب بھی مسلمانوں نے ذاتی اغراض کو بالائے طاق رکھ کر محض اعلائے کلمۃ الحق کے لیے نیک نیتی سے جنگ کی انہیں ایسی نصرت غیبی ضرورت حاصل ہوتی رہی ہے دور کیوں جایئے ستمبر ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ میں گئے گزرے مسلمانوں کو بھی یہ تائید غیبی حاصل ہوئی - جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اعتماد کر کے اپنے سے پانچ گنا بڑی طاقت کو شکست دی - اور اس فوج کا ہر فرد اس بات کا معترف ہے کہ تائید غیبی ضرور ساتھ تھی - یہ تائید کیسے حاصل ہوئی اس کی تفصیل میں بہت سی حکایتیں بیان کی جاتی ہیں جنہیں درج کرنے کا یہ موقع نہیں - اسی حقیقت کو مولانا ظفر علی نے درج ذیل شعر میں ادا فرمایا ہے

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو!
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دعا اسی وقت کارگر ثابت ہوتی ہے جبکہ مادی وسائل سے بھی پورا پورا استفاد کیا جائے - مادی وسائل کو بروئے کار لائے بغیر محض دعا پر تکیہ کرنا بے سود اور قانون الٰہی کے خلاف ہے - اگر مادی وسائل کے ساتھ ساتھ دعا کی روحانی قوت بھی شامل ہو جائے تو مسلمانوں کی قوت دس گنا تک بڑھ جاتی ہے - اور اگر یہ قوت دو گنا سے بھی کم رہ جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی واقع ہو چکی ہے -

اگر مسلمان مادی وسائل سے غافل ہو کر محض دعا پر انحصار کرے گا - جیسا کہ آج کل اکثر مسلمانوں کا شیوہ بن چکا ہے تو وہ یقیناً شکست ہی سے دوچار ہوگا - اور اگر دونوں لڑنے والے فریق دعا اور توکل کے عادی نہ ہوں اور محض مادی وسائل پر تکیہ رکھتے ہوں تو فتح اس فریق کی ہوگی

جو مادی وسائل کے لحاظ سے مضبوط اور طاقتور ہوگا- اللہ تعالیٰ کا قانون مسلمانوں کا محض نام کا مسلمان ہونے کے لحاظ سے کوئی لحاظ نہیں کرے گا-

(۲) دشمن کی تدابیر کو ناکام بنانا

اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے- یہ اپنی قوت کو بڑھانے اور کامران ہونے کے مثبت پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے- لیکن کامرانی کے حصول کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ دشمن کے جنگی مقاصد اور تدابیر پر کاری ضربیں لگائی جائیں- اس سلسلہ میں بالعموم درج ذیل تدابیر اختیار کی جاتی ہیں-

(۱) تجارتی ناکہ بندی (Blockada):

جنگ کے لیے سب سے ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست ہوتا ہے- اور ایک کامیاب جرنیل اس بات پر کڑی نظر رکھتا ہے کہ وہ دشمن کے معاشی وسائل پر کاری ضرب لگا کر اس کی جنگی تیاریوں میں تعطل پیدا کر دے-

قریش مکہ کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور مدینہ اسی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا- لہٰذا مدینہ کو سیاسی لحاظ سے ایک نمایاں مقام حاصل تھا- اور اسی وجہ سے مکہ اور مدینہ کے بڑے بڑوں میں دوستانہ تعلقات قائم تھے- ایک دفعہ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے کے لیے مکہ آئے اور اپنے دوست قریشی سردار امیہ بن خلف کے ہاں قیام کیا- یہ دونوں حضرات کعبہ کے سامنے بیٹھے تھے- ابو جہل نے سعد بن معاذ کو کہا کہ اگر تم ابوصفوان (امیہ بن خلف کی کنیت) کے ساتھ نہ ہوتے تو میں تمہیں ختم کر دیتا- تو اس کے جواب میں سعد بن معاذ نے یہی جواب دیا تھا کہ ہم تمہاری تجارت کی شہ رگ کاٹ کر تمہارے ناک میں دم کر دیں گے-

(بخاری- کتاب المغازی- باب ذکر النبی من............)

مدینہ میں دم بدم یہ خبریں پہنچ رہی تھیں- کہ ۲ھ میں قریش کا جو تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں شام گیا ہوا ہے- اس کا پورے کا پورا منافع مصارف جنگ اور مسلمانوں کے استیصال کے لیے وقف کر دینے کے آپس میں عہد و پیمان ہو چکے ہیں- لہٰذا مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جنگ سے بچنے کے لیے اس تجارتی قافلہ کی ناکہ بندی کر کے جنگ کو التوا میں ڈال دیں- پھر

ساتھ ہی یہ خطرہ بھی تھا کہ قریش مکہ اس قافلہ کی حفاظت کے لیے مسلح ہو کر موقع پر پہنچ جائیں گے۔

چنانچہ ان ملی جلی کیفیات سے رمضان ۲ھ میں مسلمانوں کا لشکر اس قافلہ کی طرف بڑھا۔ ادھر ابوسفیان کو خبر ہو گئی تو اس نے تیز رفتار قاصد مکہ بھیجا۔ مکہ سے ہنگامی طور پر ایک ہزار پر مشتمل مسلح لشکر ابوجہل کی سرکردگی میں قافلہ کی حفاظت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اب ہوا یہ کہ ابوسفیان نے عام رستہ کو چھوڑ کر بحیرہ قلزم کے ساتھ والا راستہ اختیار کر لیا۔ اور اس طرح بچتا بچاتا قافلہ لے کر بحفاظت مکہ پہنچ گیا۔ قریشی لشکر بدر کے مقام پر پہنچ چکا تھا تو اسے بھی معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان بخیریت مکہ پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا اکثر سرداروں نے یہ رائے دی کہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب جنگ نہ کرنی چاہیے۔ مگر ابوجہل کے غرور اور ہٹ دھرمی نے کوئی پیش نہ جانے دی اور جنگ ہو کر رہی جس میں کفار کو عبرت انگیز شکست ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں اس تجارتی ناکہ بندی کے اور بھی چند ایک واقعات ملتے ہیں۔ مندرجہ بالا تصریحات سے مقصود یہ ہے کہ غزوۂ بدر کا پیش خیمہ بھی تجارتی ناکہ بندی تھا۔ اور ایسی مہمیں بسا اوقات کامیاب ہی ثابت ہوئیں۔

ابتدا میں قریش نے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لیے بحیرۂ قلزم کے ساحل کے ساتھ کا متوازی راستہ اختیار کیا مگر ان پر چل کر ان کے منافع کی مقدار بہت کم ہو گئی اور سامانِ خوراک بڑی دقت سے اور گراں قیمت پر ملنے لگا۔ اس طرح کی ناکہ بندی[1] سے آپ ﷺ کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ دشمن معاشی لحاظ سے کمزور ہو جائے دوسرے وہ منافع جو فوری طور پر مصارف جنگ کی صورت میں مسلمانوں ہی پر استعمال ہونے والا تھا اس کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔

تجارتی ناکہ بندی کو کامیاب بنانے کے لیے گہرے تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اسی وقت کی جانی چاہیے جب انسان اس سے پیدا ہونے والے ردعمل کا مقابلہ کرنے کے لیے

---

[1] اس تجارتی ناکہ بندی پر معاندین اسلام نے یہ الزام لگایا کہ اسلام غارت گری کی تعلیم دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کا مقصد محض لوٹ مار کا مال حاصل کرنا تھا۔ لیکن یہ الزام کئی لحاظ سے غلط ہے۔ مثلاً

(۱) اگر لوٹ مار ہی مقصد ہوتا تو پھر صرف قریش کے تجارتی قافلہ کی تخصیص کیوں تھی۔ تجارتی قافلے تو یمن سے بھی روانہ ہوتے تھے مدینہ سے بھی اور غیر ملکی تاجر بھی ان راستوں پر سفر کرتے تھے۔ ان کی بھی ناکہ بندی نہیں کی گئی۔

(۲) کسی واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں نے اس ناکہ بندی کے ذریعہ مال حاصل کیا ہو۔ سریہ نخلہ میں عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اگر مال حاصل کیا بھی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

پوری طرح تیار ہو- اب دیکھئے کہ نپولین بونا پارٹ جو مغربی دنیا کا عظیم جرنیل سمجھا جاتا تھا' نے بھی برطانیہ کی تجارتی ناکہ بندی کی تھی جسے کانٹی نینٹل سسٹم (Continental System) بھی کہا جاتا ہے- برطانیہ کے پاس مضبوط بحری بیڑہ بھی تھا- اور بیرونی مصنوعات چینی' چائے' قہوہ' اور دیگر کئی اشیاء پر اس کی اجارہ داری بھی تھی- نپولین نے پہلے تو برطانوی درآمدات کو حکماً ممنوع قرار دیا پھر اپنے دوست ممالک پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھی برطانوی مصنوعات اپنے ہاں ہرگز درآمد نہ کریں یہ ایک ایسی بات تھی جس پر زیادہ دیر تک عمل نہیں کیا جا سکتا تھا- فرانس اور اس کے دوست ممالک کی تجارت بحران کا شکار ہو گئی- برطانیہ نے جوابی کاروائی کے طور پر ان ممالک کی بھی ناکہ بندی کر دی- تو نپولین اور اس کے حامی ممالک سخت مجبور ہو گئے- نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے حلیف ممالک اسی وجہ سے اس سے کٹ گئے اور دشمن بن گئے- خود نپولین کا یہ حال تھا کہ اسے فوج کے لیے ہزارہا تعداد میں سمگل شدہ برطانوی کمبل بلیک میں اونچے نرخوں پر خریدنے پڑے- اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اس کے زوال کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب اس کی یہی تجارتی ناکہ بندی تھی- (جدید تاریخ یورپ حصہ اول- ص ۳۶۳ تا ۳۵۶)

ناکہ بندی کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ دشمن کی کمک کو دشمن تک پہنچنے سے پہلے اس کا صفایا کر دیا جائے- جنگ احزاب میں جب محاصرہ طویل ہو گیا اور ''اتحادیوں'' کی رسد ختم ہونے لگی تو حیی بن اخطب یہودیوں کے سردار نے رسد لائے ہوئے بیس اونٹ مشرکین کی فوج کے لیے بھیجے- یہ رسد جو کھجوروں اور ستو پر مشتمل تھی- رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر لگ گئی تو

(بقیہ) (۳) لوٹ مار کا مال اسلامی نقطہ نظر سے حرام قرار دیا گیا ہے- یہ مال غنیمت کی تعریف میں نہیں آتا- اس فرق کے لیے صفحہ ۱۶۷ پر اموال غنیمت پر حدود و قیود کا عنوان ملاحظہ فرمائیے-

جب آپ ﷺ غزوہ بدر پر گئے تو آپ ﷺ کو ایک شخص ملا جو بہادری میں مشہور تھا- اس نے اپنی خدمات پیش کیں تاکہ اموال غنیمت سے حصہ حاصل کر سکے- آپ ﷺ نے اس سے پوچھا- ''کیا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے؟'' اس نے کہا نہیں- تو آپ ﷺ نے فرمایا- ''لوٹ جا میں مشرک کی مدد نہیں چاہتا- تھوڑی دور آگے چل کر پھر یہی سوال و جواب ہوئے تو بھی آپ ﷺ نے اس کی مدد لینے سے انکار کر دیا- آگے بڑھے تو پھر یہی سوال و جواب ہوئے- اب کی بار اس نے جواب دیا کہ ''میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر یقین رکھتا ہوں- '' تب آپ ﷺ نے اجازت دیدی-

(مسلم- باب کراهية الاستعانة فی الغزو بکافر)

تاہم اس میں اتنی گنجائش ضرور ہے کہ کافر اگر مشرک نہ ہو اور اس سے مسلمانوں کی خیر خواہی کا بھی یقین ہو تو اسے فوج میں شامل کیا جا سکتا ہے حضور اکرم ﷺ نے صفوان ابن امیہ ؓ سے جنگ میں مدد لی جبکہ وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے- (امام نووی- تحت شرح حدیث مذکورہ)

مجاہدین نے اس پر حملہ کر کے ان رسد سے لدے ہوئے اونٹوں پر قبضہ کر لیا۔

(۲) دشمن کی فوجوں میں انتشار ڈالنا:

ایک کامیاب جرنیل جہاں اپنی فوجوں میں ہر قیمت پر اتحاد برقرار رکھنے کی طرف خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہاں دشمن کی فوجوں میں پھوٹ ڈال کر اس کی قوت کو منتشر کرنا بھی اس کے مقصد کے حصول کا ایک مؤثر ذریعہ ہوتا ہے۔ اسلام میں کسی قوم سے خواہ وہ کتنی ہی دشمن جاں کیوں نہ ہو بدعہدی کی قطعاً اجازت نہیں البتہ کسی تدبیر سے یہ کام اگر بنتا نظر آئے تو اس کی اجازت ہے۔

جنگ احزاب میں یہود اور بالخصوص اس کے قبیلہ بنونضیر کے کچھ افراد جو خیبر کی طرف جلاوطن کیے جا چکے تھے۔ تمام قریش مکہ اور دوسرے مشرک قبائل عرب کو بھڑکا کر مسلمان کو ختم کرنے کے لیے مدینہ پر چڑھا لائے تھے۔ یہود کا ایک قبیلہ بنوقریظہ ابھی تک اپنے عہد پر قائم تھا۔ لہٰذا مدینہ میں مقیم تھا اور مسلمانوں کا حلیف تھا۔ بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب نے بنوقریظہ کو کئی طرح کے سبز باغ دکھا کر بدعہدی پر مجبور کر لیا تھا۔ چنانچہ اس جنگ میں وہ بھی دشمنوں سے مل گئے تھے۔ اور چونکہ یہ واقعہ عین دورانِ جنگ پیش آیا لہٰذا اس سے مسلمانوں پر مایوسی کی فضا طاری ہو گئی تھی۔

انہیں دنوں میں ایک واقعہ پیش آیا۔ قبیلہ غطفان ...... جو یہودیوں کا حلیف تھا...... کا ایک رئیس نعیم بن مسعود اشجعی مسلمان ہو گیا۔ لیکن اس کے اسلام لانے کی دشمن کو خبر نہ تھی۔ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا۔ ''اگر آپ ﷺ اجازت دیں تو میں دشمن میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مؤثر کردار ادا کر سکتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اس کی تجویز سن کر اتفاق فرمایا۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد کی ایک شکل تھی۔

چنانچہ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ پہلے بنوقریظہ کے پاس گئے جنھوں نے بدعہدی کی تھی۔ اور کہا کہ اگر جنگ میں خدانخواستہ ہمیں (یعنی قریش مکہ، بنونضیر، غطفان اور بنوقریظہ وغیرہ کو) شکست ہو گئی۔ تو دوسرے سب قبائل تو اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے لیکن تمہارا کیا بنے گا؟ تم تو مدینہ میں ہی رہتے ہو۔ مسلمان تو تمہارا کچومر نکال دیں گے۔ اس لیے تمہارے حق میں بہتر یہ ہے

کہ تم قریش مکہ اور غطفان کے دس آدمی بطور یرغمال لے لو تاکہ بصورت شکست اگر وہ واپس چلے جائیں تو تمہاری تکلیف کا انہیں فکر ہو اور وہ اس کا مداوا سوچنے پر مجبور ہوں۔ بنو قریظہ کے ذہن میں یہ بات آ گئی۔

پھر یہی نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ قریش کے سپہ سالار ابو سفیان کے پاس گئے اور کہنے لگے۔ ''دیکھو! میرے تمہارے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں۔ میں تمہیں تمہارے ہی فائدے کی ایک بات کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بنو قریظہ اپنے کیے پر پریشان ہیں وہ تو پہلے ہی معاہدہ توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ حیی بن اخطب نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اگر قریش کام ناتمام چھوڑ کر چلے گئے تو میں تمہارے پاس آ رہوں گا۔ اب ظاہر ہے کہ شکست کی صورت میں نہ تو بنو نضیر مدینہ واپس آ سکتے ہیں اور نہ ہی تم ایسا کر سکتے ہو۔ لہٰذا بنو قریظہ اب یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے چند آدمی بطور یرغمال اپنے پاس لے لیں۔ اگر تم نے ان کی یہ بات مان لی تو عین ممکن ہے کہ وہ انہیں مسلمانوں کے حوالے کر کے جنگ کا نقشہ ہی الٹ دیں۔'' ابو سفیان کے ذہن میں بھی یہ بات کھب گئی۔

چنانچہ قریش اور غطفان نے بنو قریظہ کے پاس عکرمہ بن ابو جہل کی سرکردگی میں ایک مشترکہ سفارت بھیجی۔ اور کہلا بھیجا کہ کل صبح آخری حملہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تاکہ محمد ﷺ کا قصہ ہی پاک کر دیں۔

بنو قریظہ نے جواب دیا کہ ''کل ہمارا چھٹی کا دن ہے۔ لہٰذا کل یہ کام نہیں ہو سکتا۔ نیز ہم محمد ﷺ کے ساتھ اس وقت تک لڑنے کے لیے تیار نہیں جب تک تم ہمارے اطمینان کے لیے اپنے چند خاص آدمی بطور ضمانت ہمارے حوالے نہ کر دو۔''

تدبیر اپنا کام کر چکی تھی۔ جب عکرمہ یہ پیغام لے کر واپس آیا تو قریش اور غطفان کو نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بات کا یقین ہو گیا۔ بنو قریظہ کو کہلا بھیجا کہ ''اگر تم لڑنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ ورنہ تمہاری مرضی۔ خدا کی قسم! ہم اپنا ایک آدمی بھی تمہارے سپرد کرنے کو تیار نہیں ہیں۔''

یہ پیغام سن کر بنو قریظہ کو بھی نعیم بن مسعود کی بات کا یقین آ گیا۔ لہٰذا انہوں نے آئندہ جنگ میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ دشمن کی فوجوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ کفار کے قبائل میں بدگمانی اور بددلی کی فضا پیدا ہو گئی۔ جو کفار کی شکست کے اسباب میں سے ایک مؤثر سبب

ثابت ہوئی۔ (طبری۔ ج ا۔ غزوۂ خندق)

(۳) جنگی چالیں یا خدع فی الحرب:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:۔

((اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ۔)) (یعنی جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے۔)

(بخاری۔ کتاب استتابة المرتدین)

تو یہاں خدعۃ سے مراد بدعہدی یا اخلاقی اقدار کو پامال کر کے اپنے مقصد کا حصول نہیں۔ بلکہ اس سے مراد "داؤ اور تدبیر" ہے۔ جیسے دو پہلوانوں کی کشتی میں ایک پہلوان کوئی انوکھا داؤ کھیل کر دوسرے کو پچھاڑ دیتا ہے۔ تو اس کے داؤ یا تدبیر کو دھوکا اور فریب پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ بس بالکل یہی مثال ان جنگی تدابیر کی ہوتی ہے۔ جنہیں حضور اکرم ﷺ نے خُدْعَةٌ[1] کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اب اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) میدان جنگ میں صف بندی اس طرح کی جائے کہ دشمن کو اپنے حریف کی تعداد اصلی تعداد سے بہت زیادہ نظر آئے۔ یہ خدعۃ یا جنگی چال تو ہے۔ لیکن اسے مکروفریب کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

(۲) آج کل فوج کی وردی کا رنگ عموماً خاکی تجویز کیا جاتا ہے۔ جو ہم رنگ زمین ہے۔ اور اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کے ہوائی جہاز فوج کی نقل وحرکت سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ یہ بھی خدعۃ کی تعریف میں آتا ہے۔ اس طریق سے کسی چیز کی ہیئت تبدیل کر دی جاتی ہے۔ لیکن دشمن سے مکروفریب کا اسے نام نہیں دیا جاسکتا۔

(۳) اسی طرح آج کل فوج اگر کہیں پڑاؤ ڈالنا چاہے تو اپنے خیموں کے اوپر درختوں کی شاخیں رکھ دیتی ہے۔ جسے کیموفلاج (Camou Falge) کہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کے جہاز اس مقام کو عام جنگل ہی تصور کریں اور فوج کی نقل و حرکت سے بے خبر رہیں۔ یہ خدعۃ ہے۔

غرض اس طرح کی بیشمار تدابیر جنگ میں اختیار کی جاتی ہیں۔ کمین گاہوں میں بیٹھنا،

---

[1] خدعة کا مادہ خدع ہے۔ جس کا معنی دھوکا اور مکروفریب ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے افصح العرب والعجم ہونے کی حیثیت سے خدعۃ کی اصطلاح خود وضع فرمائی۔ جس کے معنی چالیں اور داؤ ہے نہ کہ دھوکا فریب۔

دشمن کو بے خبر رکھ کر خطرے کی جگہ کھینچ لانا' دکھاوے کی پیش قدمی اور دکھاوے کی پسپائی سے دشمن کو مغالطہ میں ڈالنا- یا پسپائی کا مغالطہ دے کر اس کے آگے بڑھنے پر اسے چاروں طرف سے گھیر لینا یہ سب باتیں خدعۃ میں داخل ہیں- اور ایک کامیاب جرنیل وہ ہوتا ہے- جو موقع و محل کے مطابق بروقت ایسی تدابیر اختیار کر سکے-

ایسی ہی صورت حال مسلمانوں کو ایران کی جنگوں میں پیش آئی- ایرانیوں کے دیو ہیکل اور سیاہ فام ہاتھیوں کو دیکھ کر مسلمانوں کے گھوڑے جو بدکے تو اپنے ہی لشکر کو روندنے لگے- پہلے ایک دو دن تو مسلمان سخت پریشان ہوئے- آخر ایک تدبیر ذہن میں آ گئی- عربوں نے اپنے اونٹوں کو کالے برقع پہنائے اور جب یہ سیاہ کالے مہیب جانور میدان جنگ میں آئے- تو دشمن کے گھوڑے ڈر کر جو بدکے تو دور تک اپنی فوجوں کو روندتے چلے گئے-[1]

اگر ہم اس پہلو سے بھی رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں کامیاب جرنیل نظر آتے ہیں- چنانچہ آپ نے

(۱) جنگ بدر کے میدان میں اس طرح صف بندی کی کہ دشمن کو مسلمانوں کی فوج اصل تعداد سے بہت زیادہ نظر آتی تھی- لہٰذا وہ مرعوب ہو گئے-

(۲) جنگ خندق میں آپ نے خندق کھود کر دشمن کے سارے ارادوں اور تدبیروں پر پانی پھیر دیا- یہ ایک ایسی تدبیر تھی جو دشمن کے سان و گمان میں بھی نہ تھی-

(۳) جنگ خیبر کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک عجیب جنگی تدبیر اختیار کی- قبیلہ غطفان کا اہل خیبر سے شرکتِ جنگ کا معاہدہ ہو چکا تھا- آپ ﷺ نے رجیع کی مقام پر فوج کو اترنے کا حکم دیا جو غطفان اور خیبر کے درمیان واقع ہے- یہیں سے حسب ضرورت کا انتظام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا گیا- اس تدبیر کا فائدہ یہ ہوا کہ غطفان کا اہل فوجی دستے آگے روانہ کرنے کا انتظام کر دیا- یہاں ایک مسجد بھی تعمیر کر لی- اور کیمپ خیبر سے رابطہ منقطع ہو گیا- جب غطفان کی فوجوں نے خیبر کے طرف پیش قدمی شروع کی تو اپنے علاقہ کو خطرہ میں دیکھ کر واپس ہو گئے-

(۴) فتح مکہ سے ایک دن قبل جب آپ ﷺ نے مضافات مکہ میں پڑاؤ ڈالا تو فوج کو حکم دیا

---

[1] الفاروق شبلی نعمانی ص ۱۰۹ 'مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۰ء

کہ وہ دور تک کئی میلوں میں پھیل کر پڑاؤ ڈالیں اور آگ خوب روشن کریں۔ اس تدبیر کا بھی یہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کی فوج اصل تعداد سے کئی گنا زیادہ معلوم ہو۔ قریش مکہ کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا کیونکہ اس میں آپ ﷺ نے انتہائی رازداری سے کام لیا تھا۔ یکدم اتنی بڑی فوج دیکھنے پر اہل مکہ کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ نفسیاتی طور پر اتنے مرعوب ہو گئے کہ مقابلہ کی جرأت نہ کر سکے۔

(۵) غزوہ بنولحیان (ربیع الاول ۶ ھ) کے موقع پر آپ ﷺ صحابہ کرام ؓ کی معیت میں نکلے اور اپنی فوجوں کا رخ شمال کی طرف کیا۔ جب یہ خبر قریش اور بنولحیان میں مشہور ہوئی تو آپ ﷺ نے ناگہانی طور پر پلٹ کر بنولحیان پر حملہ کر دیا۔ بنولحیان اس ناگہانی حملہ سے گھبرا کر مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور منتشر ہو گئے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے ایسے ڈھنگ اختیار کیے جو اس جیسی لڑائیوں میں آج کے ترقی یافتہ دور میں استعمال ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے طائف کے محاصرہ میں منجنیق، دبابہ اور ضبور سے کام لیا۔ اس وقت ایسے ہتھیاروں کا استعمال عجیب و غریب تھا۔ آپ ﷺ نے جنگ بدر میں اپنے ٹھہرنے کے لیے جو علیحدہ جگہ (عریش) تیار کروائی اور اپنا ٹھکانہ منتخب کرتے وقت تمام ضروری انتظامات کا لحاظ رکھا جیسا کہ آج کل کی جنگوں میں ہوتا ہے۔

(۴) گوریلا جنگ

انفرادی جنگ کی یہ شکل بھی خدعہ ہی کے ذیل میں آتی ہے۔ یہ طریق جنگ عموماً اس وقت استعمال کرنا پڑتا ہے جب کھلے میدان میں مقابلہ کی صورت پیدا نہ ہو سکے۔ یا اگر ہو تو وہ یا غیر مؤثر ہو یا نقصان دہ۔ ایسی جنگ کسی جنگی ضابطہ یا نظم کے تحت نہیں لڑی جاتی۔ اس کا مقصد دشمن کے ٹھکانوں کو اور بعض تخریب کار عناصر کو خفیہ طریقہ اور داؤ سے نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ نیز دشمن کے بعض ایسے افراد جو زیر زمین سازشوں اور تخریب کاریوں میں مصروف رہتے ہیں اور کھلے میدان میں مقابلہ کو نہیں آتے۔ انہیں اس طریقہ سے ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے چنانچہ جنگ احزاب سے قبل ایسے ہی چند دشمنان اسلام کا قلع قمع کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ ان دشمنان اسلام کا جرم اتنا

ہی نہ تھا کہ وہ اسلام کے دشمن تھے۔ بلکہ وہ طرح طرح گھناؤنے جرائم سے مسلمانوں کو اور خود پیغمبر اسلام کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔ اور کھلے میدان میں لڑنے سے بھی گریز کرتے تھے۔

ابوجہل اور اس کا بیٹا عکرمہ' ابوسفیان' امیہ بن خلف غرض بیشمار ایسے افراد کا نام لیا جا سکتا ہے جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کا مدینہ جانے کے بعد بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ لیکن ان کے متعلق حضور اکرم ﷺ کو کبھی خیال نہیں آیا کہ انہیں خفیہ طریقہ سے ٹھکانے لگا دیا جائے جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دشمنی کرتے تھے تو شریفانہ اور کھلے طور پر کرتے تھے۔ میدان جنگ میں سامنے بھی آتے رہے۔

لیکن جن چند افراد کو حضور اکرم نے خفیہ طور پر ٹھکانے لگوا دیا۔ وہ کمینہ دشمن تھے۔ معاہد تھے لیکن بد عہد' ان کا جرم بھی ایک نہیں تھا۔ پھر میدان جنگ میں آنے کی بجائے کمین گاہوں سے نقصان پہنچانے والے تھے۔ ان کی مختصر سرگزشت درج ذیل ہے:۔

کعب بن اشرف:

اشرف عربی النسل تھا اور اس کی بیوی بنونضیر قبیلہ یہود کے سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھی۔ لہٰذا مدینہ میں اس کا بہت وقار تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا جانی دشمن تھا۔ جنگ بدر میں کافروں کی شکست کے بعد ان میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ کعب بڑا چوٹی کا شاعر اور فصیح اللسان تھا۔ ابو سفیان کے دورہ مدینہ کے بعد یہ مکہ گیا اور قریش مکہ کو خوب بھڑکایا۔ حضور اکرم ﷺ کی ہجو بھی کرتا تھا۔ واپس مدینہ آ کر اس نے مسلمان عورتوں کے متعلق اشعار کہہ کر ان پردہ نشینوں کو رسوا اور بدنام کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا ''کون ہے جو کعب بن اشرف کی خبر لیتا ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو بہت تکلیف دی۔''

ایک صحابی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ[1] اٹھے اور کہنے لگے۔ ''آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ اسے قتل کر دوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں'' محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ ''اچھا پھر مجھے اجازت دیجئے میں جو چاہوں اس سے کہہ لوں۔'' (یعنی اپنی باتوں سے اسے اپنے دام میں پھنسا لوں)

---

[1] ایسے جاں نثاروں کو آج کی زبان میں کمانڈوز (Commandoes) کہا جاتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا- ''کہہ لینا-''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب بن اشرف کے پاس جا کر کہنے لگے- ''یار! یہ پیغمبر ﷺ ہم سے صدقہ وخیرات مانگتا ہے ہمارے تو اپنے پاس کھانے کو کچھ نہیں اسے کیا دیں؟''

کعب کو موقعہ ہاتھ آ گیا کہنے لگا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قصہ مختصر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کعب سے کچھ مانگا تو کہنے لگا کوئی چیز گروی رکھو تو ادھار ملے گا- محمد مسلمہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے ''مثلاً کیا گروی رکھیں؟'' کہنے لگا ''اپنی عورتیں گروی رکھ دو-'' محمد مسلمہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے تم ایک خوش شکل جوان ہو- ہمیں خطرہ ہے کہ عورتیں تم پر فریفتہ ہو جائیں گی- کعب کہنے لگا ''اچھا پھر اپنے لڑکے گروی رکھ دو- محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے'' کیا ہم لوگوں سے ساری عمر یہ طعنہ سنتے رہیں کہ ادھار کے لیے بیٹوں کو گروی رکھا تھا؟ البتہ ہم اپنے ہتھیار تمہارے پاس گروی رکھ سکتے ہیں- چنانچہ اس شرط پر معاملہ طے ہو گیا- اور دوبارہ ملاقات کا وقت مقرر ہوا-

رات کو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اپنے چار ساتھیوں سمیت ہتھیار وغیرہ لے کر آئے آپس میں بات گن رکھی تھی- محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں اس کے سر کی خوشبو سونگھنے کے بہانے اس کا سر تھام لوں گا- تم اسے قتل کر دینا- چنانچہ ایسا ہی ہوا- محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب سے کہنے لگے- ''یار! تمہارے سر کے بالوں سے بڑی نفیس خوشبو آ رہی ہے- کہو تو ذرا سونگھ لوں؟'' کعب اس بات پر پھولا نہ سمایا- کہنے لگا! ''ہمارے پاس عرب کی وہ عورت ہے جو سب عورتوں سے زیادہ معطر رہتی ہے اور سب سے زیادہ حسین وجمیل ہے-'' پھر اس نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو سر سونگھنے کی اجازت دے دی- چنانچہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس بہانے سے اس کا سر خوب تھام لیا اور ساتھیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے اس کا کام تمام کر دیا-

کعب بن اشرف گو معاہد قوم کا ایک فرد تھا- یہ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی ذمی ذمی ہونے کے باوجود اگر پیغمبر ﷺ کو گالیاں دیتا ہے تو اس شخص کا معاہدہ از خود ٹوٹ جاتا ہے-

(بخاری- کتاب المغازی- باب قتل کعب بن اشرف- معہ حاشیہ تیسیر الباری)

ابو رافع عبداللہ بن ابی الحقیق:

بنو نضیر کا رئیس تھا۔ خیبر میں رہتا تھا کعب بن اشرف کی طرح مسلمانوں اور پیغمبر اسلام ﷺ کا جانی دشمن تھا۔ یہ بہت بڑا بد زبان تھا۔ رات کو محفل جما کر اس میں مسلمانوں کے خلاف من گھڑت قصے بیان کرتا۔ ان کے خلاف نفرت پھیلاتا اور ان کی تضحیک و تمسخر اڑاتا۔ کئی بار معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ جنگ احزاب کے موقع پر کئی قبائل کو ترغیب دے کر اور روپیہ سے ان کی مدد کر کے مدینہ پر چڑھا لایا تھا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے جو قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ کعب بن اشرف کا خاتمہ کر دیا تو انصار میں رشک پیدا ہوا۔ چنانچہ ابو رافع کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے قبیلہ خزرج کے ایک فرد عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ تیار ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تین ساتھی اور بھی تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ:۔

رات کو ہم اس قلعہ کے قریب پہنچ گئے میں نے اپنے ساتھیوں کو قلعہ سے باہر ٹھہرنے کو کہا اور خود قلعہ میں داخل ہونے والے لوگوں میں مل کر اندر داخل ہوا۔ اور گدھوں کے طویلے میں ایک جگہ چھپ گیا۔ کچھ دیر بعد دربان نے آواز دی ''کوئی باہر تو نہیں رہ گیا؟ اور جب کوئی جواب نہ پایا۔ تو قلعہ کا دروازہ اندر سے مقفل کر کے چابی ایک جگہ رکھ دی میں وہ جگہ دیکھ رہا تھا۔

جب رات کا ایک حصہ گزر گیا۔ بتیاں بجھ گئیں اور سب لوگ سو گئے۔ میں نے چپکے سے چابی لے کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ تا کہ بھاگتے وقت یہ کام نہ کرنا پڑے۔ اس کے بعد سب کمروں کی باہر سے کنڈیاں لگا دیں۔ تا کہ کوئی ابو رافع کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ اب میں بالا خانے پر گیا جہاں وہ سو رہا تھا۔ کمرہ کھلا تھا مگر اندھیرے کی وجہ سے یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ ابو رافع کہاں ہے۔ میں نے آواز دی۔ وہ بولا تو میں نے آواز پر تلوار کی ضرب لگائی مگر وار خالی گیا اور وہ چیخ اُٹھا۔ ایک لمحہ کے بعد میں نے آواز کو بدل کر اُس سے پوچھا۔ ''ابو رافع کیا ہوا؟'' جیسے کوئی اس کا کارندہ اس کی مدد کو پہنچ رہا ہو۔ ابو رافع بولا۔ ''تیری ماں مرے ابھی مجھ پر کسی نے تلوار کا وار کیا ہے۔ میں نے پھر آواز پر ضرب لگائی۔ لیکن اب کی بار بھی وار کاری نہ لگا تو میں نے نزدیک جا کر اس کے پیٹ میں تلوار جھونک دی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ مر گیا ہے۔

میں گھبراہٹ میں نیچے اُترا سیڑھی سے پھسلا۔ میرے پاؤں میں موچ آ گئی۔ تاہم

اپنے ساتھیوں کو جا کر خوشخبری دی۔ اور کہا اب جاؤ میں اس وقت آؤں گا جب قلعے سے رونے کی آواز آئے۔ کچھ دیر بعد صبح ہوئی تو قلعہ سے موت کی خبر دینے والے نے کہا۔ لوگو! ابورافع گزر گیا۔ میں سن کر وہاں سے بھاگا۔ اس وقت مجھے خوشی سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے پاؤں میں کوئی درد ہے ہی نہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے پہلے مدینے پہنچ کر نبی ﷺ کو یہ خوشخبری دی۔

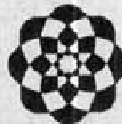
(بخاری۔ کتاب المغازی باب قتل ابورافع)

ان واقعات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) مندرجہ بالا واقعات میں مقتول صرف یہودی ہیں۔ جو بدعہد، دھوکہ باز، کمینہ دشمن، ہر وقت سازشیں کرنے والے اور مسلمانوں کو اور پیغمبر اسلام کو زبان اور عمل سے ایذا پہنچانے والے تھے اور اساطین کفر تھے۔ لیکن کھل کر میدان مقابلہ میں نہیں آتے تھے۔

(۲) ایسے بدعہد انفرادی شرپسندوں کی سرکوبی کے لیے ____ ان کو ختم کرنے کے لیے حیلہ بہانہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔

(۳) ایسی گوریلا جنگ بھی امیر کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔ ورنہ وہ فتنہ وفساد ہی شمار ہوگا۔ جس کی اسلام میں کسی صورت اجازت نہیں۔



باب چہارم

ایک عظیم جرنیل کے ذاتی اوصاف

پچھلے باب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق ان امور سے ہے جو فتح و کامرانی کے حصول کے لیے ایک جرنیل کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس باب میں ہم ایسے ذاتی اوصاف کا ذکر کریں گے جو کسی جرنیل کی عظمت کا مقام یا درجہ متعین کرتے ہیں:۔

(۱) شجاعت اور بہادری

جب معرکہ کارزار میں فوج کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں تو سپہ سالار کی شجاعت ہی وہ جوہر ہوتا ہے۔ جو فوج کو شکست سے بچا کر فتح سے ہمکنار کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ سپہ سالار کی شجاعت اور نجدت تھکے ہارے سپاہیوں کی زندگی میں نئی روح پھونک کر جنگ کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ نجدت اس صفت کو کہتے ہیں کہ جب موت بالکل سامنے نظر آنے لگے تو تب بھی اعتماد علی النفس بحال رہے۔ چنانچہ ایسے ہی چند واقعات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

(۱) مدینہ میں خوف و ہراس کی فضا:

جن دنوں مدینہ پر قریش مکہ کے حملہ کا خطرہ ہر وقت مسلط رہتا تھا انہیں ایام سے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:۔

((کَانَ النَّبِی صلی اللّٰہ علیه وَسَلَّمَ اَحْسَنَ النَّاسِ وَاَشْجَعَ النَّاسِ وَلَقَدْ فَزِعَ اَھْلُ الْمَدِیْنَةِ لَیْلَةً فَخَرَجُوْا نَحْوَ الصَّوْتِ فَاسْتَقْبَلَھُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ اسْتَبْرَ االْخَبَرَ وَھُوَ عَلٰی فَرَسٍ لِاَبِیْ طَلْحَةَ عُرْیٍ وَفِیْ عُنُقِهِ السَّیْفُ وَھُوَ یَقُوْلُ: لَمْ تُرَاعُوْا،

(آنحضرت ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ اک بار ایسا ہوا کہ رات کو اہل مدینہ (دشمن کے ڈر سے) گھبرا گئے۔ اور آواز کی طرف نکل کھڑے ہوئے کیا دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ادھر سے لوٹ کر واپس آرہے ہیں۔ آپ ﷺ لوگوں سے پہلے اکیلے ہی روانہ ہو گئے تھے اور صورت حال

لَمْ تُرَاعُوْا "۔)) (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب الحمائل و تعلیق السیف بالعنق) کی تحقیق کر آئے تھے۔ آپ ﷺ ابوطلحہ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے۔ گلے میں تلوار لٹکائی ہوئی تھی اور فرما رہے تھے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔)

اب دیکھئے مدینہ پر دشمن کے کسی بھی وقت حملے کا ہراس بھی طاری تھا۔ اس حال میں ایک معمولی افواہ بھی یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ پھر لوگوں نے کچھ اس قسم کی آواز بھی سنی تھی۔ آپ ﷺ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دشمن کس تعداد میں ہے اور ان سب باتوں کے باوجود آپ ﷺ نے نہ کسی کو ساتھ لیا اور نہ کسی کا انتظار کیا۔ اس صورت حال میں اکیلے بڑھ کر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا آپ کی شجاعت کی زبردست دلیل ہے۔

(۲) جنگ احد:

جنگ احد میں جب مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوا اور ابن قمیہٗ نے یہ افواہ پھیلا دی کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ قتل ہو گئے۔ تو اس وقت مسلمانوں پر اس قدر بدحواسی طاری ہو گئی تھی کہ انہیں دوست و دشمن کی بھی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہی ہاتھوں شہید ہو گئے۔ حالانکہ حضرت رضی اللہ عنہ پکار پکار کر کہتے رہے کہ یہ میرے والد ہیں۔ لیکن اس بدحواسی کے عالم میں کسی کی کون سنتا ہے؟ مسلمانوں میں سے ایک گروہ نے مایوس ہو کر جنگ بندی کر دی۔ ایک فریق میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس حال میں رسول اللہ ﷺ اکیلے میدان میں کھڑے مسلمانوں کو واپس بلا رہے تھے۔ اس حالت کا نقشہ اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:۔

﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ ـ﴾ (۳:۱۵۳) (جب تم بگٹٹ دوڑے جا رہے تھے اور باوجود یہ کہ پیغمبر پچھلے گروہ میں رہ کر تم کو بلا رہا تھا۔ لیکن تم مڑ کر بھی کسی کو نہیں دیکھتے تھے۔)

اس حالت میں آپ ﷺ تیزی سے دشمن کی طرف چلے جا رہے تھے۔ آپ نے شکستہ دل فوج کو اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ، اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ، اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ کے آوازے دے کر جمع کیا، جنگ کی پلاننگ میں فوری تبدیلی کی اور ایسا سنبھل کر مقابلہ کیا کہ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب نہ

ہو سکا۔

غور فرمایئے عام جنگوں میں اگر ایسی صورتحال پیش آجائے تو سپہ سالار کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ بھاگ کر اپنی جان بچائے۔ لیکن آپ خود پکار پکار کر اپنے دشمن کو مطلع کر رہے ہیں کہ میں اس جگہ ہوں۔

(۳) جنگ حنین:

جنگ حنین میں بھی ابتداءً مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کو دشمن کے تیروں کی باڑھ سے کوئی جائے پناہ نہیں ملتی تھی۔

قرآن کریم میں ہے:۔

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ۔﴾ (۲۵:۹)

(اور جنگ حنین میں جب تمہیں اپنی کثرت تعداد پر ناز تھا۔ لیکن وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آسکی۔ اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کسی نے جنگ حنین میں بھاگنے کی کیفیت پوچھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((لاوَ اللّٰهِ مَا وَلّٰى النَّبِى صلى الله عليه وسلم ولكنْ ولّٰى سرعان النَّاسِ فَلَقِيَهُمْ هُوَازِنَ بِا لنبل والنبى صلى الله عليه وسلم علىٰ بَغْلَتِهِ الْبَيْضَاءَ وَاَبُوْ سُفْيَانَ ابْنُ الْحَارِثِ اٰخِذٌ بِلِجَامِهَا والنبى صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ:)) [1]

(اللہ کی قسم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹھ نہیں موڑی (جبکہ دوسرے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے) ہوا یہ کہ جلد باز لوگوں نے پیٹھ پھیری (لوٹ پر لگ گئے) ہوازن کے کافروں نے ان کو تیروں پر دھر لیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفید خچر پر سوار تھے اور ابو سفیان بن حارث اس کی لگام تھامے ہوئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ شعر پڑھ رہے تھے)

اَنَا النَّبِىُّ لَا كَذِبْ　　اَنَا ابْنُ عَبْدُ الْمُطَّلِبْ

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر باب بغلۃ النبی)

---

[1] بخاری کتاب المغازی ۔ باب غزوۂ طائف

ہوں میں پیغمبر بلا شک و خطر اور عبد المطلب کا ہوں پسر

حدیث مذکورہ میں تین باتیں قابل غور ہیں جو آپ ﷺ کی شجاعت اور نجدت کے واضح دلائل ہیں:۔

(۱) فوج میں بھگدڑ مچی ہے۔ اس حال میں آپ ﷺ خچر پر سوار ہیں۔ کسی تیز گام گھوڑے پر نہیں کہ آپ ﷺ بھی کسی محفوظ مقام پر جلد پہنچ کر پناہ لے سکیں۔

(۲) خچر کا رنگ بھی سفید تھا۔ جو دشمن کو دور سے بخوبی نظر آ سکتا ہے۔

(۳) نعرہ بھی آپ ﷺ وہ لگا رہے ہیں جو دشمن کے کینہ وعداوت کا اصل سبب ہے۔

ایک دوسری روایت حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اس وقت نبی ﷺ خچر کو ایڑ لگانے اور دشمن کی طرف بڑھانے لگے۔ میں نے لگام اور ابو سفیان نے رکاب تھام لی۔ اس ارادہ سے کہ آنحضور ﷺ کو آگے بڑھنے سے روک دیں"۔ اور صحیح مسلم میں اس واقعہ کے بعد پھر یہ الفاظ ہیں۔ "نبی ﷺ اپنی خچر سے اُتر پڑے۔"

شجاعت ونجدت اور اللہ تعالیٰ پر توکل کی ایسی نظیر نہایت مشکل ہے۔ تیروں کی بوچھاڑ سے فوج تو دم دبا کر بھاگ نکلے اور سپہ سالار سواری کو ایڑ لگائے دشمن کی طرف بڑھنے پر مصر ہو۔ پھر جب آپ ﷺ کے چچا اور چچازاد بھائی نے آپ ﷺ کو روکا تو آپ ﷺ خچر سے اتر کر پیدل ہی اس طرف نعرہ لگاتے چل کھڑے ہوتے ہیں یہ آپ ﷺ کی اس بینظیر شجاعت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ نے ایک طرف منہ کر کے پکارا "یا معشر المہاجرین" اور دوسری طرف منہ کر کے پکارا "یا معشر الانصار! تو تمام صحابہ اس آواز پر لبیک کہہ کر واپس پلٹ آئے اور ایسی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا کہ شکست، شاندار فتح میں بدل گئی۔

(۴) دشمن کا تلوار سونت کر آپ ﷺ کے سر پر کھڑا ہونا:

غزوہ ذات الرقاع ۷ھ میں جو صلح حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔ بنو غطفان چند قبائل کے ساتھ اتحاد کر کے مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی تو آپ ﷺ چار سو صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر ان کی گوشمالی کو نکلے۔ اس غزوہ کو ذات الرقاع یا چیتھڑوں والا غزوہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس سفر میں سواری بہت کم تھی۔ چھ آدمیوں کے حصہ ایک اونٹ آتا تھا۔ اور اکثر صحابہ کو یہ

دشوار گزار سفر پیدل ہی کرنا پڑا۔ جس سے پاؤں پر آبلے پڑ جاتے تو ان کے گرد پٹیاں لپیٹ کر سفر جاری رکھتے تھے[1]۔ جب آپ ﷺ منزل مقصود پر پہنچے تو دشمن مرعوب ہو کر منتشر ہو گیا۔ اس سفر سے واپسی پر ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا جسے حضرت جابر بن عبداللہ ؓ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:۔

((انَّهُ غَزَا مَعَ رسول الله صلى الله عليه وسلم قِبَلَ نَجْدٍ فلمَّا قَفَلَ رَسول الله صلى الله عليه وسلم قَفَلَ مَعَهُ فَأَدْرَكَتْهُمُ الْقَائِلَة فِيْ وَادٍ كَثِيْرِ العضاهِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتفرَّق النَّاسُ فِي العِضاة يَسْتَظِلُّوْنَ بالشَّجَرَةِ وَنَزَلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عليه وَسَلَّمَ تَحْتَ سَمُرَةٍ فَعَلَّقَ بِهَا سَيْفَهُ قَالَ جابرٌ: فَنِمْنَا نَوْمَةً ثُمَّ إِذَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عليه وسَلَّمَ يَدْعُوْنَا ، فَجِئْنَاه فَإِذَا عِنْدَهُ أَعْرَابِيٌّ جَالِسٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عليه وسلم : إِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ سَيْفِيْ وَأَنَا نَائِمٌ فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَ فِيْ يَدِهِ صَلْتًا فَقَالَ لِيْ ! "مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّيْ؟ قُلْتُ ! اللهُ ! فَهَا هُوَ ذَا جَالِسٌ". ثُمَّ لَمْ يُعَاتِبْه رسول الله صلى الله عليه وسلم-)) (بخاری۔ کتاب المغازی باب غزوة ذات الرقاع)

(انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ نجد کی طرف جہاد کیا۔ جب آپ ﷺ وہاں سے لوٹے تو میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ لوٹا۔ اتفاق سے دوپہر کو ایسے مقام پر پہنچے جہاں خاردار درخت بہت تھے حضور اکرم ﷺ وہاں اتر پڑے۔ اور آپ ﷺ کے ساتھی الگ الگ درختوں کے سائے میں ٹھہرے۔ آپ ﷺ ایک کیکر کے درخت کے نیچے ٹھہرے اور تلوار درخت سے لٹکا دی (اور سو گئے) جابر کہتے ہیں ہم لوگ بھی سو رہے تھے۔ یکا یک رسول اللہ ﷺ ہم کو بلانے لگے۔ ہم آئے تو دیکھا آپ ﷺ کے پاس ایک گنوار (غورث بن حارث) بیٹھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پتہ ہے ابھی اس گنوار نے کیا کیا؟ میں سو رہا تھا کہ اس نے میری تلوار سونت لی۔ میں جاگا تو ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں دیکھی۔ کہنے لگا! اب تم کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا "میرا اللہ" دیکھو وہ گنوار یہ بیٹھا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کو کوئی سزا نہ دی۔)

اور بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ بچائے گا" تو اس بدو پر لرزہ طاری ہو گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی جو آپ ﷺ نے پکڑ لی اور سونت کر کہا۔ "بتاؤ! اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا۔ کہنے لگا آپ ﷺ کا رحم و کرم" آپ ﷺ نے

---

[1] بخاری۔ کتاب۔ المغازی۔ باب غزوہ ذات الرقاع۔

اسے کوئی سزا نہ دی۔

غور فرمایئے اس دشمن قبیلے کا ایک مشرک تلوار سونتے سر پر کھڑا ہے۔ جس سے جنگ کے لیے آپ ﷺ گئے تھے۔ اس حالت میں بھی آپ ﷺ کے پائے ثبات میں ذرہ بھر لغزش نہیں آئی...... پھر یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ جو لوگ جس قدر شجاع اور بہادر ہوتے ہیں اتنا ہی ان میں رحم و کرم بھی زیادہ ہوتا ہے چنانچہ اس پر پورا اختیار رکھنے کے باوجود آپ ﷺ نے اس کو معاف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گنوار بعد میں نہ صرف خود مسلمان ہوا بلکہ اس کے ذریعہ اس کے قبیلے کے بہت سے لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

غرض آپ ﷺ کی شجاعت کے واقعات تو بیشمار ہیں۔ لیکن ہم نے صرف ایسے واقعات درج کیے ہیں جن کا تعلق صرف جنگ سے ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی اپنی شجاعت ضرب المثل بن چکی ہے، جنہوں نے جنگ بدر اور خندق میں دعوت مبارزت دینے والے کفار کو ایک وار سے جہنم واصل کیا، جن کے ہاتھوں خیبر کا سب سے مضبوط قلعہ قموص فتح ہوا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

((اِنَّا كُنَّا اِذَا حَمِيَ الْبَاسُ وَاحْمَرَّتِ الْحَدَقُ اتَّقَيْنَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا يَكُوْنُ اَحَدًا اَقْرَبُنَا اِلَى الْعَدُوِّ مِنْهُ۔)) (مسند احمد ج ا ص ۱۲۶)

(جب گھمسان کا رن پڑتا اور لڑنے والوں کی آنکھوں میں خون اتر آتا اس وقت ہم نبی ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے۔ اور سب سے آگے دشمن کی جانب نبی ﷺ ہی ہوتے تھے۔)

ہجرت کے دوران جب آپ ﷺ سازشیوں کے مسلح پہرہ سے بچ کر نکل آئے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر غار ثور میں پناہ لی۔ قریش اپنی ناکامی پر بہت سیخ پا ہو گئے۔ اور ہر طرف آپ ﷺ کی تلاش میں آدمی روانہ کیے اور سو اونٹ انعام بھی مقرر کیا۔ آپ ﷺ حالات سے باخبر رہتے تھے۔ مسلسل تین دن آپ ﷺ کی تلاش جاری رہی اور آپ ﷺ اس غار میں پناہ گزیں رہے۔ غصہ سے بھرے ہوئے قریشیوں کے چند افراد غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ اگر وہ لوگ اپنے قدموں کی طرف دیکھتے تو غار کے اندر سے آپ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کو بآسانی نظر آ سکتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے بہادر اور جری انسان نے جب ان کو دیکھا

تو موت کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور آپ ﷺ سے کہنے لگے۔ ''اگر یہ لوگ اپنے قدموں کی طرف دیکھ پائیں تو پھر کیا ہو؟'' اس سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹: ۴۰) غم مت کیجئے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

گویا آپ نے سبق یہ دیا تھا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ! یہ خیال مت کرو کہ ہم دو ہیں۔ بلکہ ہمارے درمیان ایک تیسرا اللہ تعالیٰ بھی ہے۔

یہ تھا آپ ﷺ کے استقلال اور نجدت اور اللہ پر توکل کا نمونہ۔ ایک عیسائی مصنف ایف سی اینڈ ریوز اس واقعہ کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''میں مسلمان نہیں ہوں مگر غار ثور کے اس واقعہ کی مدح ضرور کرتا ہوں بصد احترام جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ابو بکر رضی اللہ عنہ اس بات کا خیال مت کرو کہ ہم دو نہیں ایک تیسرا اللہ تعالیٰ بھی ہمارے درمیان ہے''۔...... مہیب خطروں میں گھرے ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ کے پائے استقامت اور ایمان میں کوئی فرق نہیں آیا...... میں ان الفاظ کی تعریف وتوصیف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب میں کبھی ان الفاظ کو دھراتا ہوں تو وجدان روحانی جوش وخروش سے جھومنے لگتا ہے اور الفاظ بار بار میرے ذہن میں عود کر آتے ہیں ''ابو بکر رضی اللہ عنہ! یہ خیال مت کرنا کہ ہم دو ہیں۔ نہیں ہمارے درمیان ایک تیسرا ساتھی بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ''۔ (سرور کونین ص ۱۰۵/۱۰۶)

(۲) فوج سے ہمدردی اور مساوات

بلاشبہ سپہ سالار کی اصل ذمہ داری فوجوں کو کمان کرنا ہے اور افواج اس کے حکم کی تعمیل کی پابند ہوتی ہیں۔ لیکن کامیاب جرنیل وہ ہوتا ہے جو عند الضرورت اس بالاتر مقام سے نیچے اُتر کر سپاہیوں کے ساتھ گھل مل کر کام کرے۔ ان سے ہمدردی اور محبت سے پیش آئے اور خود کو انہیں میں کا ایک فرد تصور کرے۔ اس کے طرز عمل سے فوج کے سپاہی اس پر جان چھڑکنے لگتے ہیں۔

امریکہ کے ایک مشہور جرنیل واشنگٹن کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے۔ وہ سادہ کپڑے پہنے گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ راستہ میں اس نے دیکھا کہ چند سپاہی ایک بھاری شہتیر اٹھا رہے ہیں مگر وہ اُٹھتا نہیں۔ ان کا افسر پاس کھڑا ہدایات دے رہا تھا۔ کہ ادھر سے اُٹھاؤ، ادھر سے ہلاؤ، مگر خود ہاتھ نہیں ہلاتا تھا۔ واشنگٹن نے گھوڑا روک کر اس عہدہ دار سے کہا اگر آپ بھی

ساتھ شامل ہو جائیں تو یہ شہتیر اٹھایا جا سکے گا۔ عہدیدار نے کہا۔ "آپ کو پتہ نہیں میں کارپول ہوں"۔

واشنگٹن گھوڑے سے اترا، کوٹ اُتارا اور آستینیں چڑھا کر سپاہیوں کے ساتھ زور لگانے میں شامل ہو گیا۔ شہتیر اُٹھا کر منزل مقصود پر پہنچا دیا گیا اور کارپول صاحب یہ سب کچھ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ واشنگٹن جب جانے لگا تو کارپول سے کہا۔ "آئندہ جب کبھی کسی محنت کے کام میں ایک آدمی کی ضرورت پڑے تو آپ مجھے بلا لیا کریں۔ مجھے آپ آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں کیونکہ میں آپ کا سپہ سالار واشنگٹن ہوں"۔ واشنگٹن کا نام سنتے ہی کارپول زمین میں گڑ گیا۔ جبکہ واشنگٹن وہاں سے جا چکا تھا۔ (رہبر کامل ص ۹۲)

یہ بات صرف واشنگٹن تک محدود نہیں عموماً بڑے بڑے جرنیلوں میں یہ صفت ان کی عظمت کا نشان ہوتی ہے۔ نپولین بونا پارٹ کے متعلق مشہور ہے کہ خود بہت محنتی تھا اور اپنے سپاہیوں سے بھی کام لینا جانتا تھا۔ اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ اپنے سپاہیوں سے اتنا گھل مل کر رہتا تھا کہ اسے اکثر سپاہیوں کے نام تک بھی زبانی یاد تھے۔

اس پہلو سے بھی اگر ہم حضور اکرم ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ تو آپ ﷺ کی ہستی سب سے ممتاز نظر آئے گی۔ ہم ذیل میں چند مستند واقعات سے اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں:۔

(۱) خندق کی کھدائی:

غزوہ خندق یا احزاب کے موقعہ پر جب عرب کے تمام قبائل اور یہودی مدینہ پر یکبارگی حملہ آور ہونے پر متحد ہو گئے تو یہ مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا کا وقت تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مدافعانہ طریق جنگ سے متعلق مشورہ کیا تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خندق کھودنے کی تجویز پیش کی تو آپ ﷺ نے اسے پسند فرمایا اور سب صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس پر اتفاق ہو گیا۔

مگر یہ خندق کھودنے کا کام جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے نہایت جانفشانی سے بھوکے رہ رہ کر اس کام کو سرانجام دیا۔ آپ ﷺ نے دس دس گز زمین دس صحابہ رضی اللہ عنہم کو بانٹ کر دی۔ چنانچہ یہ پندرہ سو (۱۵۰۰) فٹ لمبی ۱۵ فٹ گہری اور بیس پچیس فٹ چوڑی خندق

بائیس دن میں تیار ہوئی۔ اتفاق کی بات کہ ادھر خندق مکمل ہوئی ادھر دشمن سر پر آ پہنچا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ خندق کی کھدائی کا منظر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

((جعل المهاجرون والانصار يحفرون الخندق حَوْلَ الْمَدِيْنَةِ وَيَنْقُلُوْنَ التُّرَابَ عَلٰى مُتُوْنِهِمْ وَيَقُوْلُوْنَ:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُجِيْبُهُمْ وَيَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اِنَّهُ لَا خَيْرَ اِلَّا الْاٰخِرَةَ فَبَارِكْ فِي الْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ۔

(بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب حفر الخندق)

(انصار اور مہاجرین مدینہ کے گرد خندق کھود رہے تھے اور اپنی پیٹھ پر مٹی ڈھو رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔ (ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جب تک زندہ رہیں جہاد پر بیعت کی ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یوں جواب دیتے جاتے تھے۔ فائدہ اگر کچھ ہے تو وہ صرف آخرت کا فائدہ ہے۔ اے اللہ انصار اور مہاجرین کو برکت عطا فرما۔)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شمولیت ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:۔

((رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الاحزاب ينقل التراب وقد وارى التراب بياض بطنه۔)) (بخاری۔ کتاب الجہاد باب حفر الخندق)

میں نے غزوہ احزاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود مٹی ڈھو رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گورے گورے پیٹ کو مٹی نے ڈھانپ لیا تھا۔

خندق کی کھدائی کے دوران ایک چٹان آ گئی جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے کسی صورت نہ ٹوٹتی تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر یہ مسئلہ پیش کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر پوری قوت سے گینتی کی ضرب لگائی تو وہ چٹان پاش پاش ہو گئی۔ اس وقت بھی بھوک کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ غزوہ احزاب)

(۲) بھوک کی شدت:

خندق تیار ہونے بھی نہ پائی تھی کہ دشمن سر پر آ پہنچا اور مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ رسد کے پہنچنے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ یہ محاصرہ بیس بائیس دن تک جاری رہا۔ خوراک کی قلت کا یہ حال تھا کہ تین تین دن مسلسل فاقے سے گزر رہے تھے۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک کی

حالت میں پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھوک سے بے تاب ہو کر آپ کے سامنے اپنے اپنے شکم کھول کھول کر دکھلائے کہ پتھر بندھے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھایا تو دو بندھے تھے۔ (شمائل ترمذی) اپنے ساتھیوں سے دکھ درد میں شرکت کی ایسی مثال تاریخ میں اور بھی کہیں مل سکتی ہے؟ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ ایسی تنگی ترشی صرف غریب سپاہیوں کا مقدر ہوتی ہے۔ افسر لوگ ایسی تکالیف کا پہلے سے انتظام کر رکھتے ہیں۔

(۳) سواری میں مساوات:

غزوہ بدر کے موقعہ پر جب مسلمانوں کے پاس آلات حرب کی بھی بہت کمی تھی اور سواریوں کی بھی۔ آپ ﷺ کے حصہ میں جو اونٹ آیا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مرثد بن ابی مرثد غنوی بھی شریک تھے۔ اس پر آپ صرف اپنی باری سے سوار ہوتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جاں نثارانہ طور پر اپنے سوار ہونے کی باری کی پیش کش کرتے اور کہتے کہ آپ ﷺ سوار رہیں اور ہم پیادہ چلتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''نہ تو تم مجھ سے زیادہ پاپیادہ چل سکتے ہو اور نہ ہی میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں''۔ (مسند امام احمد ج ۱ ص ۴۲۲)

(۴) کام کاج میں شرکت:

کسی غزوہ پر جاتے ہوئے آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ او وکھانا پکانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپس میں کام بانٹ لیے۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کام کاج میں مصروف ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ وہاں سے غائب ہو گئے۔ صحابہ ﷺ پریشان ہوئے تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ آپ ﷺ جنگل سے ایندھن اکٹھا کر کے لا رہے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کام ہم کر لیں گے آپ تکلیف نہ فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''ہاں ٹھیک ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھوں۔ اللہ اس بندہ کو پسند نہیں کرتا۔ جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔ (سیرۃ النبی ج ۲ ص ۴۱۲)

غور فرمایئے۔ جب یہ بات عقیدہ میں شامل ہو تو سپہ سالار یا دوسرے کمانڈر کیونکر امتیازی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں؟

ایک انگریز مصنف مسٹر ڈائل، اپنی تصنیف ''ہسٹری آف دی اسلامک پیپل'' میں

رسول اللہ ﷺ کے کردار کے اس پہلو پر یوں رقمطراز ہے۔ آپ ﷺ اتنے منکسر المزاج تھے کہ اپنے معتقدین کے ساتھ کسی ایسے سلوک کے بالکل روادار نہ تھے۔ جو آپ کو ان سے ممتاز کر دے۔ جس کام کو آپ کر سکتے تھے کبھی اپنے غلاموں سے بھی وہ کام نہ لیتے تھے۔ بارہا دیکھا گیا آپ ﷺ بازار میں سودا خرید رہے ہیں۔ اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگا رہے ہیں بکری کا دودھ اپنے ہاتھ سے دھو رہے ہیں۔ در نبوی ہر ایک کے لیے اور ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اور ہر شخص کی رسائی آپ ﷺ تک بلا روک ٹوک ہوتی۔ آپ ﷺ بیماروں کی عیادت کرتے اور ہر ایک کے ساتھ رحم و شفقت کا برتاؤ کرتے۔ اگر کوئی سیاسی وجہ حائل نہ ہوتی تو آپ ﷺ سلوک اور تواضع سے کبھی منہ نہ موڑتے"۔ (سرور کونین ص ۲۶)

آپ ﷺ کے اسی طرح کے سلوک کا یہ اثر تھا کہ یہ مقدس فوج اپنے عظیم سپہ سالار پر پروانہ وار جاں نثار کرتی تھی۔ غزوہ احد میں جب آپ ﷺ کو مشرکین نے ہر طرف سے گھیر لیا تو مسلمانوں نے اپنے جسموں سے ڈھال کا کام لے کر انہیں روکا اور حتی الوسع آپ ﷺ کو آنچ نہ آنے دی۔ عروہ بن مسعود ثقفی جو صلح حدیبیہ کے وقت قریش مکہ کی طرف سے سفیر بن کر آیا واپسی پر جا کر قریش مکہ سے صحابہ ؓ کی پروانہ وار شیفتگی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:۔

اے قریش! میں روم، ایران اور حبش کے بادشاہوں کے پاس بھی گیا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں نے کوئی بادشاہ ایسا نہیں دیکھا! جیسے محمد ﷺ اپنی قوم میں ہیں۔ جب وہ کوئی حکم دیتے ہیں تو اس کے اصحاب فوراً لپکتے ہوئے حکم بجالاتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں پانی نہیں گرنے دیتے اور اس کے لیے دوڑتے ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو اپنی آواز دھیمی کر لیتے ہیں اور ہمہ تن متوجہ ہو کر بات سنتے ہیں اور ادب و تعظیم کی وجہ سے نظر بھر کر ان کی طرف نہیں دیکھتے۔ محمد ﷺ کے ساتھی کبھی اسے تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ لہٰذا تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ تم محمد ﷺ کی بات مان لو۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے"۔ (بخاری۔ کتاب الشروط۔ باب الشرط فی الجهاد للمصالحة)

اور حضور اکرم ﷺ کو اپنے صحابہ کرام ؓ سے جس قدر ہمدردی، موانست اور محبت تھی ان کی شہادت اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں دی ہے:۔

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم (تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آئے۔ تمہاری تکلیف ان پر گرانبار ہے۔

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔﴾ (۹:۱۲۸)

وہ تمہاری بھلائی کے لیے حریص ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔)

(۳) جوہر شناسی

ایک سپہ سالار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی فوج کے افراد کی ذاتی صلاحیتوں سے واقف ہو تاکہ انکی صلاحیت کے مطابق ہر ایک سے کام لے سکے۔ آپ ﷺ میں جوہر شناسی کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فوج کے تمام افراد آپ ﷺ ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے:۔

(۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے آپ سے افسری کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم کمزور آدمی ہو۔ اور افسری تمہارے بس کا روگ نہیں۔ حالانکہ آپ ﷺ کو حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے بے پناہ محبت تھی۔

(۲) حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ زندگی بھر کفار کی ہجو کی بلیغ اشعار سے مدافعت فرماتے رہے۔ آپ ﷺ نے ان کے اشعار سن کر یہ بھی فرمایا تھا۔ کہ فی البدیہہ شعر گوئی میں روح القدس آپ۔۔۔ کی مدد کرتا ہے۔ لیکن اگر آپ کا دل جنگ کے لیے طاقتور نہیں تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ۔۔۔ انہیں بطور سپاہی میدان جنگ میں نہیں لے گئے۔ بلکہ احد اور خندق کے موقعہ پر عورتوں کی حفاظت کے لیے مدینہ میں چھوڑ دیا تھا۔

(۳) جنگ احد کے دن آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری اس تلوار کا حق کون ادا کرتا ہے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رشک بھری نظروں سے آپ ﷺ کو اور تلوار کو دیکھنے لگے۔ تو آپ ﷺ کی نظر انتخاب حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ پر پڑی جنہوں نے فی الواقع اس کا حق ادا کیا۔ اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔

(۴) جنگ خیبر کے موقعہ پر آپ ﷺ نے ایک جھنڈا تیار کیا اور فرمایا کہ کل میں یہ جھنڈا اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ خیبر کو فتح کرے گا۔ تمام بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے امیدوار تھے اور منتظر تھے کہ دیکھیں کہ جھنڈا کسے ملتا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے

جری اور بہادر صحابی فرماتے ہیں کہ مجھے خیبر کے دن کے علاوہ زندگی بھر کبھی امارت کی آرزو پیدا نہیں ہوئی۔ دوسرے دن جب جھنڈا سپرد کرنے کا وقت آیا۔ تو آپ ﷺ کی نظر انتخاب اس شخص پر پڑی جو حاضرین میں موجود بھی نہ تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا اور پوچھا وہ کہاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کی آنکھیں دکھنے میں آئیں ہیں۔ اور وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں طلب فرمایا۔ آنکھوں پر لب مبارک لگایا تو آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔ پھر آپ ﷺ نے جھنڈا ان کے حوالہ کر دیا۔ کیونکہ حضرت علی۔۔۔۔ میں بہادری کے تمام اوصاف موجود تھے جو ایسے موقع پر درکار تھے۔ اور واقعات نے یہ فیصلہ کر دیا کہ آپ ﷺ کا انتخاب بالکل درست تھا۔

(۵) اسی طرح آپ ﷺ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ کون لوگ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اپنی وفات سے قبل آپ ﷺ نے شام کی سرحدوں پر شورش کو دفع کرنے کے لیے جو لشکر ترتیب دیا۔ اس کا سپہ سالار حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے، کو مقرر کیا۔ جبکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے بہادر اور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک صحابہ موجود تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت بعض لوگوں کو ناگوار بھی محسوس ہوئی کہ اتنے اتنے بڑے معزز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک غلام زادے کی ماتحتی میں جہاد پر روانہ ہوں۔ لیکن آپ ﷺ جانتے تھے کہ حضرت اسامہ بن زید میں مطلوبہ قائدانہ صلاحیت اور بہادری موجود ہے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے تقرر سے آپ ﷺ کا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ نسلی تفوق کے بت کو ساتھ ہی پاش پاش کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تقرر سے یہ دونوں مقصد حاصل ہو گئے۔ اور آپ ﷺ نے ایک پنتھ سے دو کاج کا کام لیا۔

آپ ﷺ کی فتوحات کی وجوہ میں جوہر شناسی کو بہت بڑا دخل ہے۔ تھوڑی سی فوج سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر اپنے مقصد کو حاصل کر لینا آپ ﷺ کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتی۔

(۴) باہمی مشاورت

مشورہ امیر کی خودسری اور پندار نفس کا موثر علاج ہے جو اسے آمرانہ حیثیت سے نیچے

اتار کر مشورہ دہندگان کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ دوسری طرف مشورہ دہندوں میں خود اعتمادی اور عزت نفس بحال کر کے انہیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ سلطنت کے کاروبار میں برابر شریک سمجھے جا سکیں۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے کہ مشورہ حقیقی جمہوریت کی روح رواں ہے یہی وجہ ہے کہ آمر قسم کے لوگ مشورہ میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ وہ محض حکم چلانے میں ہی اپنی شان سمجھتے ہیں اور بسا اوقات ایسی خطرناک غلطیاں کر بیٹھتے ہیں جو بالآخران کی دوسری خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔

ہر قسم کے سربراہ اور اسی طرح ایک جرنیل کی عظمت کا راز اس بات میں ہے کہ وہ تمام اہم امور میں اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ لیتا رہے۔ اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ سے فرماتے ہیں:۔

((وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔)) (۳:۱۵۹)

(آپ ﷺ اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کیجئے۔ پھر جب کسی کام کا عزم کرلیں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کیجئے۔)

مشورہ کے فائدے:

مشورہ سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:۔

(۱) اس سے رائے عامہ اپنی اجتماعی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ آزادی سے اپنی رائے کے اظہار کا موقع میسر آتا ہے۔

(۲) شوریٰ کے فیصلے سے رائے عامہ مطمئن ہو جاتی ہے۔ مشیر اور عوام اسے اپنا ذاتی فیصلہ سمجھ کر اسے بروئے کار لانے میں مستعد ہو جاتے ہیں۔

(۳) معاملہ کے سب پہلو سامنے آجاتے ہیں اور درست نتائج تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

واضح رہے کہ دور نبوی اور خلافت راشدہ میں شوریٰ کے فیصلے امت کے لیے واجب التعمیل اور قانون کا ماخذ قرار پا گئے ہیں۔ آپ ﷺ حکومت کے ہر اہم معاملہ میں شوریٰ طلب فرماتے تھے۔ یہ معاملہ خواہ دین کی مصلحتوں سے متعلق ہوتا یا دنیوی مفاد سے، اجتماعی ہوتا یا شخصی قسم کا۔ صحابہ کرام آپ کو مشورہ کے لیے بے چین پاتے تھے۔ واقعہ افک جو آپ ﷺ کی عائلی زندگی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں بھی آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور رائے طلب فرمائی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی شوریٰ کے مستقل اور ممتاز اراکین تھے جنگ بدر کے قیدیوں سے متعلق مجلس مشاورت ہوئی تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا: لِوِ اجْتَمَعَا مَا عَصِيْتُكُمَا (دُرِّ منثور ج ۳ ص ۲۰۲)

اگر دونوں کا مشورہ ایک ہو جائے تو میں اس کا خلاف نہ کرونگا۔

مشورہ آپ کا معمول بن چکا تھا اور اس میں آزادی رائے کا پورا حق دیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سمجھ میں کوئی بہتر بات آجاتی تو وہ ازخود حضور اکرم ﷺ سے کہہ دیتے تھے۔ حضرت حباب بن منذر نے جنگ بدر میں پڑاؤ کے انتخاب کے لیے ازخود مشورہ دیا جو آپ ﷺ نے قبول فرمایا۔ جنگ احزاب کے دوران آپ ﷺ نے غطفان سے صلح کے متعلق صرف انصار کے دو رؤساء حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا اور ان کی رائے پر عمل فرمایا۔ جنگ خندق کے متعلق مشورہ کی مجلس قائم ہوئی تو خندق کی کھدائی کا مشورہ صرف ایک صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا تھا جسے قبول کیا گیا۔ آپ اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کہ مشورہ دینے والا بلا جھجک پوری آزادی سے اپنی رائے دے سکے۔ جنگ بدر کے آغاز میں آپ ﷺ نے مجلس مشاورت بلا کر فرمایا تھا: اَشِيْرُوْ عَلَىَّ اَيُّهَا النَّاسُ (سیرت ابن ہشام ج ا ص ۶۱) اے لوگو! مجھے اس معاملہ میں مشورہ دو۔

مشورہ اور آزادی رائے:

درج ذیل واقعہ سے معلوم ہوگا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رائے کے اظہار میں آزادی حق کو کیسے استعمال کرتے تھے:

غزوۂ احزاب میں اتحادیوں کا محاصرہ طویل ہو گیا۔ مسلمانوں کا خوارک کی قلت کی وجہ سے برا حال تھا۔ نبی اکرم ﷺ کو خیال آیا کہ غطفان کو مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی دینے کے وعدہ پر ان کا اتحاد توڑ دیا جائے تو اتحادیوں کا یہ محاصرہ جلد ختم ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے انصار کے دو سرداروں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بلا کر مشورہ کیا۔ دونوں نے عرض کیا کہ اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو مجال انکار نہیں لیکن اگر مشورہ کی غرض سے ہے تو عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی ہم سے کوئی شخص خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ انصار کا یہ استقلال دیکھ کر آپ ﷺ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ (طبری ج ا غزوہ خندق)

حکم کے بعد مشورہ ہے نہ اجتہاد:

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مشورہ کے بعد امیر کو اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس میں آراء کی کثرت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔ پھر جب امیر کسی کام میں مشورہ کے بعد یا بعض امور میں بغیر مشورہ محض اپنی صوابدید کے مطابق کوئی حکم نافذ کردے۔ تو اس کے بعد عوام کو دوبارہ مشورہ یا خود اجتہاد کرنے کا حق باقی نہیں رہتا۔

جنگ احد میں حضور اکرم ﷺ نے درّہ پر ۵۰ تیراندازوں کا ایک دستہ متعین کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی اس درّہ کو نہ چھوڑیں۔ فتح کے آثار دیکھ کر کچھ لوگ مال غنیمت سمیٹنے کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کا اجتہاد یہ تھا کہ مقصود جنگ تو فتح تھا۔ وہ حاصل ہو گئی تو اب یہاں ٹھہرنے کا کیا فائدہ؟ ان کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے ایک واضح حکم کے بعد اجتہاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس اجتہادی غلطی نے فتح کو شکست میں بدل دیا۔

صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ قربانی کے جانور ذبح کر دیئے جائیں اور یہ حکم آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی خفی کی صورت میں ملا تھا۔ صحابہ اس حکم کی تعمیل میں متردد اور وحی کے انتظار میں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جوش میں آکر کچھ غیر محتاط باتیں بھی کیں۔ جن کا مدت العمر انہیں افسوس رہا تو بہ و استغفار کرتے رہے۔

جنگ احد میں آپ ﷺ نے مشورہ کے بعد کھلے میدان میں لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ بعد میں کچھ بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس فیصلہ میں تبدیلی کی درخواست کی مگر آپ ﷺ نے ان کی اس دوبارہ تجویز کو قبول نہیں فرمایا۔

(۵) حربی فراست

دوران جنگ ایک عظیم جرنیل کی نظر بعض اوقات ایسے دوررس نتائج پر جا پہنچتی ہے جو عام لوگوں کی نظروں میں واضح طور پر خطرناک ہوتے ہیں۔ اور انہیں اس میں واضح طور پر اپنی شکست کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسی دوررس فراست کی مثالیں بھی ہمیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے سوا اور کہیں کم ہی نظر آتی ہیں۔ البتہ ایسی مثالیں ضرور مل جاتی ہیں کہ کسی جرنیل نے بڑی سوچ بچار کے بعد کوئی اقدام کیا تو اس کے نتائج اس کی توقع کے بالکل برعکس نکلے۔ نپولین بوناپارٹ کی

تجارتی ناکہ بندی (BLOCKAGE) کی سکیم جو بالآخر اس کو لے ڈوبی اس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ یا جنگ واٹرلو میں اس کی شکست کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ اپنے دو حریف جرنیلوں کو الگ الگ شکست دینا چاہتا تھا۔ ان میں سے پرشیا کے جرنیل بلوشر کو اس نے شکست دی۔ اور اپنے جرنیل گروجی کو اس کے تعاقب میں بھیجا۔ اور خود اتحادیوں کے جرنیل ولنگٹن کی طرف پیش قدمی کی اس کے جرنیل گروجی نے تعاقب میں تساہل سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلوشر کی فوجیں بھی ولنگٹن سے آکر مل گئیں۔ اور دونوں نے مل کر نپولین کو شکست فاش دی۔ اس کی فوجی تدبیر کی ناکامی اس کی شکست کا سبب بن گئی۔ دوران جنگ ایسے ''اتفاقی حوادث'' کا پیش آجانا معمولی بات ہوتی ہے۔ ایک کامیاب جرنیل کے لیے یہ بات ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتی ہے کہ اگر ایسی صورت حال پیش آجائے تو اس کا چارہ کار کیا ہو؟

اب آپ ﷺ کی حربی فراست کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) محاصرہ طائف:

غزوہ حنین کے بعد طائف کا جنگ جو قبیلہ بنو ثقیف مسلمانوں کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ لوگ مضبوط قلعہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اسی غزوہ میں آپ ﷺ نے دبابہ اور منجنیق بھی استعمال کی۔ تاکہ قلعہ کو کسی مقام سے شکستہ کیا جا سکے۔ لیکن اس میں کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ دشمن کے اوپر سے آنے والے تیروں سے گاہے گاہے کوئی مسلمان شہید ہو جاتا۔ ان شہداء کی تعداد ۱۲ تک پہنچ گئی تھی۔

طائف کا محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بالآخر آپ ﷺ نے محاصرہ اُٹھانے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ جنہیں خوارک وغیرہ کی بھی کمی تھی۔ ان حالات میں محاصرہ اُٹھا لینا دوسرے لفظوں میں اپنی شکست کا کھلا اعتراف تھا۔ جو مسلمانوں پر گرانبار تھا۔ لیکن حکم کی تعمیل میں محاصرہ اُٹھا لیا گیا۔ کوئی اور جرنیل ہوتا تو اپنے جھوٹے وقار کو بحال رکھنے کے لیے تمام افواج کٹوا دیتا مگر محاصرہ نہ اُٹھاتا۔ مگر آپ کی نگاہ دوررس نے ان حالات کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ لوگ ذہنی طور پر آپ ﷺ کے مطیع و منقاد ہو چکے تھے۔ صرف کسی بہانہ کی ضرورت تھی۔ آپ ﷺ نے عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے محاصرہ اُٹھا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یہ سب مسلمان ہو گئے۔

(۲) میثاق مدینہ:

میثاق مدینہ اوراس کی تمام دفعات کا ذکر ہم پہلے تفصیل سے کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ آپ ﷺ نے جنگی لحاظ سے اس معاہدہ سے کیا کچھ فوائد حاصل کیے اور وہ یہ ہیں کہ مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے:۔

(۱) مدینہ کو ایک سیاسی وحدت قرار دیا۔ اور بیرونی حملوں کی صورت میں دفاع کی ذمہ داری تمام آبادی پر ایک جیسی ڈال دی مگر سیاسی برتری اپنی تسلیم کروالی۔

(۲) بیرونی دشمنوں سے معاہدہ وفاداری پر پابندی عائد کردی گئی۔

(۳) جنگی مصارف کا بار بھی حصہ رسدی طے ہوا۔

گویا میثاق مدینہ آپ ﷺ کی حربی فراست کی ایک بے نظیر مثال پیش کرتا ہے۔ مدینہ اور اس کے مضافات کو اپنے حق میں ایسی بہتر شرائط پر متفق کر لینا آپ کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کی اہمیت کو مسلم مورخین سے زیادہ مستشرقین نے محسوس کیا۔ پروفیسر نکلسن لکھتا ہے:۔

''یہ ظاہر میں ایک محتاط اور دانشمندانہ اصلاح ہے۔ حقیقت میں یہ ایک انقلاب تھا۔ محمد ﷺ نے قبائل کی آزادی پر کھلم کھلا تو ضرب نہ لگائی لیکن اسے ختم کر ڈالا۔ ہر چند کہ اس وحدت میں یہودی۔ مشرکین اور مسلمان سبھی شریک تھے لیکن آپ بخوبی اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ اس نوزائیدہ ریاست میں فعال اور بااثر حصہ دار مسلمان ہی ہیں۔ اس حقیقت کو آپ ﷺ کے مخالفین پہلے نہ دیکھ سکے''۔

میثاق مدینہ کو بلاشبہ اسلام کی آئینی تاریخ میں میگنا کارٹا کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں یہ ضمیر کی آزادی کا پہلا چارٹر تھا اس میں محض وہاں اس دور کے لیے نہیں بلکہ آئندہ زمانہ کے لیے بھی بہترین رہنما اصول موجود ہیں۔ اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے۔ تو بعد کے تمام دساتیر اس کا چربہ معلوم ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ کے سیاسی تدبر اور دوراندیشی کی ایک مثال نبوت کے پہلے کے دور میں ملتی ہے۔ جس کے ذریعے آپ ﷺ نے سرداران قریش کو ایک ہونے والی خونریز لڑائی سے بچا لیا تھا۔ یہ مشہور واقعہ حجر اسود کی تنصیب ہے۔

(۳) صلح حدیبیہ:

صلح حدیبیہ کن حالات میں ہوئی اور کن شرائط پر ہوئی۔ اس کی تفصیل ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ اس صلح نامہ کی درج ذیل شرائط کو ہم زیر بحث لائیں گے۔

(۱) اس سال مسلمان واپس چلے جائیں۔ اگلے سال عمرہ کی غرض سے آئیں۔ صرف تلوار نیام میں ساتھ لا سکتے ہیں۔ اور تین دن مکہ میں رہ کر واپس چلے جائیں۔

(۲) جو مسلمان مکہ میں ہیں اگر وہ اپنے والی کی اجازت کے بغیر مدینہ میں جا کر پناہ لینا چاہیں تو مسلمان انہیں پناہ نہیں دے سکتے۔ اور جو مسلمان مکہ میں آ کر رہنا چاہیں تو قریش انہیں واپس نہیں کریں گے۔

(۳) قبائل عرب جس فریق کے ساتھ چاہیں محالفہ کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ یعنی مسلمان یا کفار مکہ جس فریق کے حلیف بننا چاہیں انہیں پوری آزادی ہوگی۔

(۴) یہ صلح دس سال کے لیے برقرار رہے گی۔

بظاہر یہ شرائط مسلمانوں کے لیے بڑی توہین آمیز تھیں۔ خصوصاً جبکہ بیعت رضوان بھی ہو چکی تھی اور مسلمان مرنے مارنے پر تلے بیٹھے تھے پھر اس دوران ایک اور واقعہ پیش آ گیا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ قریش کے اسی سفیر سہیل بن عمرو کے لڑکے ابو جندل مسلمان ہو چکے تھے اور قریش مکہ کی قید میں تھے جن پر ہر طرح کی سختیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ وہ بیڑیوں میں جکڑے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر مسلمانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ مسلمانوں کو اپنے زخم دکھلا دکھلا کر رحم اور پناہ دینے کی اپیل کر رہے تھے۔ کہ انہیں قریش مکہ کی قید سے چھڑا کر اپنی حفاظت میں لے لیا جائے۔ صلح کی شرائط طے ہو چکی تھیں۔ مگر تحریر اور دستخط کرنا باقی تھے۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ از روئے معاہدہ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو پناہ میں نہیں لے سکتے۔ حضور اکرم ﷺ نے عہد کی پاسداری کرتے ہوئے ابو جندل کو صبر کی تلقین کی۔ اور قریش کو واپس دے دیا۔ جبکہ دوسرے مسلمانوں کا جی اس قدر بھر آیا تھا کہ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو کسی قیمت پر واپس دینے کو تیار نہ تھے۔

آپ ﷺ نے از روئے معاہدہ واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ قربانی کے جانور ذبح کر دیے جائیں۔ لیکن مسلمان متردد تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ شاید ابھی

کوئی وحی نازل ہو جس سے مسلمانوں کا یہ ذہنی کرب دور ہو سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے مدبر سیاستدان بھی ان شرائط کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ بیقراری کی حالت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ لیکن ابو بکر رضی اللہ عنہ تسلیم و رضا کے پیکر تھے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ایسی ہی تلقین کی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور پوچھنے لگے۔ "کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے پیغمبر نہیں؟ کیا ہم حق پر نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں باتوں کا جواب اثبات میں دیا تو کہنے لگے تو پھر ہم یہ توہین آمیز شرائط کیوں قبول کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی صبر کی تلقین کی۔ اس دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لہجہ بھی قدرے تلخ تھا۔ جس کا آپ رضی اللہ عنہ کو ساری زندگی افسوس رہا اور توبہ استغفار فرماتے رہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مسلمان کہنے کے باوجود قربانی پر آمادہ نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی کا جانور ذبح کیا۔ جس کی دیکھا دیکھی سب مسلمانوں نے اپنے اپنے جانور ذبح کیے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ وحی نازل ہوئی۔

﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا﴾ (۱/۴۸) (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تمہیں فتح مبین عطا فرمائی۔)

گویا وحی الٰہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت سے پوری طرح ہمنوا تھی۔ اور وہ شرائط جنہیں مسلمان توہین آمیز سمجھ رہے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح مبین قرار دیا۔

اب ہم دیکھیں گے تو یہ توہین آمیز شرائط کیسے فتح مبین ثابت ہوئیں اور نیز یہ بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اتنی دور رس تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے مدبر سیاست دان کی نگاہ اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکی تھی۔

صلح کیوں کی گئی؟

اس واقعہ میں سب سے نمایاں چیز جو ہمیں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سوائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قیمت پر جنگ کرنے سے گریز کرتے رہے اور صلح پر مصر رہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی افواہ غلط تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی طور پر لڑائی کا خیال چھوڑ دیا اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) اگر اس وقت صلح نہ کی جاتی اور جنگ چھڑ جاتی تو وہ مرد اور عورتیں جو مکہ میں مسلمان ہو

چکے تھے اور جنہیں مسلمان جانتے بھی نہیں تھے۔ سب پیس ڈالے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو سورہ فتح میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

﴿وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۴۸:۲۵)

(اور اگر "شہر مکہ میں" کچھ مسلمان مرد اور کچھ مسلمان عورتیں نہ ہوتیں کہ تم ان سے ناواقف تھے (اور لڑائی کی صورت میں) تم ان کو پامال کر ڈالتے اور بے خبری میں تم کو ان کی طرف سے نقصان پہنچ جاتا۔)

(۲) جب سے آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے ایک دن بھی امن وچین کا نہیں گزرا تھا۔ ادھر قریش مکہ دشمن تھے اور یہود مار آستین بنے ہوئے تھے۔ جو دوسرے قبائل کو ساتھ ملا کر ہر وقت جنگ کی فضا قائم رکھتے تھے کیونکہ یہود کے حملے کا خطرہ تھا۔ اندریں صورت حضور اکرم ﷺ دو دشمنوں میں ایک سے ہر قیمت پر صلح کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہاں سے واپس جا کر سب سے پہلے خیبر فتح کر کے یہودی فتنہ کا استیصال کیا گیا۔

(۳) آپ ﷺ اس لیے بھی قریش سے صلح چاہتے تھے کہ ادھر سے فارغ ہو کر اپنا فریضہ رسالت بیرونی دنیا تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے واپس جا کر ۷ھ میں شاہان عجم کو تبلیغی خطوط لکھے۔ آپ ﷺ تبلیغ کے نتائج سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ بعد میں سریہ موتہ اور غزوۂ تبوک انہیں تبلیغی خطوط کے نتیجے میں سامنے آئے۔ لہٰذا آپ ﷺ قریش سے صلح اور یہود کا استیصال کر کے فریضہ رسالت کی سرانجام وہی کے لیے اندرونی طور پر مطمئن ہونا چاہتے تھے۔

(۴) صلح حدیبیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک صلح جو اور اصول پرست قوم ہے۔ انہی باتوں سے متاثر ہو کر صلح حدیبیہ کے بعد بہت سے قبائل نے اسلام قبول کیا۔ ان نو مسلموں میں خالد بن ولید فاتح ایران اور عمرو بن عاص فاتح مصر جیسے جرنیلوں کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

(۵) قریش کا جنگ سے ہٹ کر صلح پر اُتر آنا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اب وہ مسلمانوں کو خانماں برباد اور ستم رسیدہ مہاجر نہیں سمجھتے بلکہ اپنا ہم پلہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے مدینہ کی آزاد ریاست کو قبول کر لیا تھا۔ اور نیز یہ بھی کہ وہاں کا سرکاری

مذہب اسلام ہے۔

(۶) چونکہ یہ صلح مسلمانوں کی امن پسندی کا واضح ثبوت تھا۔ لہٰذا بہت سے قبائل نے مسلمانوں سے معاہدے کرنے شروع کر دیئے۔

شرائط صلح کے نتائج

اب ہم دیکھیں گے کہ صلح حدیبیہ کی بظاہر ان توہین آمیز شرائط کے نتائج مسلمانوں کے حق میں کتنے مفید ثابت ہوئے؟

شرط نمبر 1 کا نتیجہ:

صلح نامہ کی شرط نمبر 1 کی رو سے مسلمان ۷ھ کو عمرہ کر سکتے تھے۔ اور تین دن مکہ میں قیام کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اگلے سال اعلان کر دیا کہ جو لوگ صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ سب عمرہ کے لیے تیار ہو جائیں۔ جب حضور ﷺ اس جمعیت کو لے کر مکہ پہنچ گئے۔ تو قریش مکہ اس قدر ذلت برداشت کرنے کی تاب نہ لا سکے۔ کہ مسلمان اس قدر آزادی سے کعبہ کا طواف کریں۔ مگر معاہدہ کی رُو سے اس بات کی اجازت دے چکے تھے۔ اس کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیا۔ اور کوہ ابو قعیس پر چڑھ گئے۔ جہاں سے مسلمانوں کی ہر نقل و حرکت بخوبی نظر آتی تھی۔

اب شہر خالی تھا اور ایک طرح مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اگر آپ ﷺ کی بجائے کوئی موقعہ شناس جرنیل ہوتا تو اس موقعہ سے ضرور فائدہ اُٹھاتا۔ لیکن آپ نے دشمن کا ایک پیسہ کا بھی نقصان نہیں کیا اور امن و امان کو برقرار رکھ کر وعدہ وفائی کی ایک اور مثال قائم کر دی۔

اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ کعبہ میں صرف قریش ہی تو نہیں تھے۔ دیگر تمام قبائل عرب بھی عمرہ کرنے آئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعداد کو دیکھ کر اندازہ کر لیا۔ کہ اب کعبہ کا سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آنے ہی والا ہے۔ جس کی یہ تمہید ہے۔ پھر آنے والے واقعات نے ان تاثرات کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔

شرط نمبر 2 کے نتائج:

حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو اس کے والد اور قریش کے سفیر سہیل بن عمرو اپنے ساتھ لے

گئے تو انہوں نے وہاں جا کر قید کے نگران کو تبلیغ شروع کر دی جس سے وہ مسلمان ہو گیا۔ پھر اس نے بھی تبلیغ شروع کر دی۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور ہوتے ہوتے مکہ میں مسلمانوں کی تعداد ۳۰۰ تک پہنچ گئی۔ لہٰذا اس شرط سے قریش کو سخت تکلیف پہنچی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ عتبہ بن اسید وہ پہلے مسلمان ہیں جو کفار مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر مدینہ میں پناہ لینے کے لیے راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب آپ ﷺ مدینہ میں پہنچے تو قریش نے بھی دو آدمی ان کو واپس لانے کے لیے مدینہ بھیج دیئے۔ آپ ﷺ نے عتبہ بن اسید کو ابو جندل رضی اللہ عنہ کی طرح واپس کر دیا۔ صبر کی تلقین کی اور یوں تسلی دی کہ "اللہ کوئی بہتر تدبیر پیدا کر دے گا۔

یہ لوگ جب عتبہ بن اسید رضی اللہ عنہ کو حراست میں لے کر واپس ہوئے تو راستہ میں ذوالحلیفہ کے مقام پر حضرت عقبہ بن اسید رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرا فرار ہو کر واپس مدینہ پہنچا تا کہ حضور ﷺ سے فریاد کرے۔ لیکن ساتھ ہی عتبہ بن اسید خود بھی حاضر ہو گئے۔ اور حضور ﷺ سے عرض کی "آپ ﷺ نے حسب معاہدہ مجھے واپس کر دیا۔ اب آپ ﷺ ذمہ دار نہیں"۔ یہ کہہ کر بحیرہ قلزم کے کنارے مقام عیص پر پہنچ کر اقامت اختیار کر لی۔ اور قریش کے تجارتی قافلوں کی ناکہ بندی کر دی۔ اب دوسرے مظلوم مسلمان بھی مدینہ کی بجائے اس طرف کا رُخ کرنے لگے رفتہ رفتہ یہاں ایک ایسی آبادی قائم ہو گئی۔ جو قریش اور ان کے قافلوں کے لیے وبال جان بن گئی۔ ان دونوں باتوں سے تنگ آ کر قریش مکہ نے خود اس شرط کو منسوخ قرار دینے کی درخواست کر دی۔ اور کہا کہ آئندہ جو مسلمان مدینہ جا کر رہنا چاہیں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا جسے آپ ﷺ نے منظور فرما لیا۔ چنانچہ عیص کی نو آبادی کے سب مسلمان مدینہ چلے گئے اور اس طرح قریش کے تجارتی قافلوں کا رستہ بدستور کھل گیا۔

(شرح مسلم۔ کتاب الجہاد۔ باب صلح حدیبیہ)

اور اس شرط کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ مسلمان آزادانہ مکہ میں آنے جانے لگے۔ میل جول بڑھا۔ تو کفار کو مسلمانوں کے کردار اور اسلام کے سمجھنے کا صحیح ذوق پیدا ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ابتدائے ہجرت سے صلح حدیبیہ تک مسلمانوں کی تعداد تین چار ہزار سے بڑھنے نہ پائی تھی۔ لیکن اس کے صرف دو سال بعد فتح مکہ

کے وقت مسلمان فوجیوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ اور یہ صرف وہ تعداد تھی جو آپ ﷺ کے ہمراہ مکہ آئے تھے جبکہ تمام مسلمانوں کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی۔

شرط نمبر 3 کے نتائج:

اس شرط کی رُو سے عرب قبائل اس بات میں آزاد تھے کہ وہ فریقین میں سے کسی کے حلیف بن جائیں۔ اس شرط کی رو سے قبیلہ بنوخزاعہ تو مسلمانوں کے حلیف بن گئے اور قبیلہ بنوبکر قریش کے۔ ان دونوں قبائل کی دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی۔ صلح حدیبیہ کے قریباً ڈیڑھ سال بعد بنو بکر نے قبیلہ بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔ تو قریش نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے علانیہ ان کی مدد کی اور بہت سے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا انہوں نے حرم میں پناہ لی لیکن قریش نے اس کا بھی لحاظ نہ کیا۔ بنوخزاعہ کے چالیس شتر سوار مدینہ میں فریاد لے کر پہنچے۔ تو آپ کو اس بد عہدی کا سخت صدمہ ہوا۔ آپ ﷺ اگر چاہتے تو اس عہد شکنی پر جنگ کا فوری اعلان کر سکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ کی امن پسند طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے قریش کو تین شرطیں پیش کیں۔

(۱) خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش بنوبکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قاصد نے جب یہ شرائط پیش کیں تو نوجوان طبقہ بھڑک اُٹھا۔ انہیں میں سے ایک شخص فرط بن عمر نے قریش کی طرف سے اعلان کیا کہ ''صرف آخری شرط منظور ہے''۔

قاصد واپس چلا آیا تو قریش کے سنجیدہ طبقہ نے اس اعلان کے نتائج وعواقب پر غور کیا۔ تو جلد ہی ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ چنانچہ ابوسفیان کو مدینہ بھیجا گیا کہ معاہدہ کی تجدید کر آئیں۔ ابوسفیان نے آنحضرت ﷺ کے سامنے گزارش پیش کی تو آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ثالثی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں نے معذرت کر دی۔ اب ابوسفیان . . . نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سفارشی بنانا چاہا اور حضرت حسن کا واسطہ دے کر تجدید عہد کے لیے کہا۔ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا۔

''بچوں کو ایسے معاملات میں کیا دخل؟'' جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو خود ہی مسجد نبوی میں جا کر یک طرفہ اعلان کر دیا کہ ''میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ (طبری۔ ج ا۔ باب فتح مکہ)

ظاہر ہے کہ ابوسفیان . . . کی ایسی بے بسی اس بات کی واضح دلیل تھی کہ کفر ذہنی اور اخلاقی ہر دو پہلوؤں سے اسلام کے مقابلہ میں شکست کھا چکا ہے۔ اب صرف جسمانی فتح باقی ہے۔ چنانچہ یہی واقعہ فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

یہ تھے صلح حدیبیہ اور اس کی توہین آمیز شرائط کے نتائج جسے اللہ تعالیٰ نے ''شاندار فتح'' سے تعبیر فرمایا۔

(۶) حصولِ مقصد کے لئے کم از کم جانی و مالی نقصان

ایک عظیم جرنیل کی پالیسی یہ ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے، کہ فتح کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور جانی یا مالی نقصان بھی کم سے کم ہونے پائے۔ خواہ یہ نقصان اپنی فوج اور علاقہ سے تعلق رکھتا ہو یا دشمن کے مقتولین اور علاقہ سے۔ اگر کوئی جرنیل کشتوں کے پشتے لگا کر کوئی ملک فتح کر بھی لیتا ہے تو ایسی فتح فوج کی بہادری کا کارنامہ تو قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن سپہ سالار کی دانشمندی اور حکمت عملی کو اس سے کم ہی تعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل مقصد علاقہ کو فتح کرنا ہوتا ہے۔ نہ کہ انسانی خون بہانا۔ لہذا اگر ایسے نقصان کے بغیر کم از کم نقصان برداشت کر کے یہ مقصد حاصل ہو جائے تو سپہ سالار کی عظمت کی دلیل ہوتی ہے۔

اس پہلو سے اگر ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو آپؐ دنیا بھر کے جرنیلوں سے ممتاز نظر آتے ہیں:۔

آپ ﷺ نے شب خون مارنے، غیر مقاتل (یعنی بچے، بوڑھے، عورتیں، معذور افراد درویش اور صوفی قسم کے لوگ) سے لڑنے یا ان کو قتل کرنے سے منع فرما دیا۔ فتح کے بعد قتل عام کو گناہ عظیم قرار دیا۔ اسی طرح فتح کے بعد کھیتوں کو جلانے اور غیر مقتول افراد کے محفوظ اموال لوٹنے سے منع فرما دیا۔ فتح کے بعد قتل کو گناہ عظیم قرار دیا۔ اسی طرح فتح کے بعد کھیتوں کو جلانے اور غیر مقاتل افراد کے محفوظ اموال لوٹنے سے بھی منع فرما دیا۔ گویا صرف ایسے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت ہے جو میدان جنگ میں مرنے مارنے کا ارادہ کر کے نکل آئے ہوں۔ اس طرح آپ

ﷺ نے حکماً قتل وغارت اور مالی نقصان کا دائرہ انتہائی محدود کر دیا۔ اور ایسی پابندیاں عائد کر دیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ اور کسی جنگ میں نہیں پائی جاتیں۔ نہ ہی کوئی جرنیل ان باتوں کا کبھی لحاظ رکھتا ہے۔ بڑے بڑے جرنیلوں کے حالات دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے معرکہ کارزار میں اتنے لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اتارے۔ فتح کے بعد اتنے دن قتل وغارت کا بازار گرم رکھا شہر کو آگ لگا دی گئی۔ مسجدوں کو اصطبل بنا لیا گیا۔ مفتوح علاقہ کی عورتوں کی بے آبروئی کے لیے سپاہیوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن آپ ﷺ نے تمام ایسی حرکات کو ممنوع قرار دیا گو اتنی بات سے بھی آپ ﷺ کی حکمت عملی کی امتیازی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے زندگی بھر جو جنگیں لڑیں۔ ان میں فریقین کا کس قدر جانی نقصان ہوا اور اس نقصان کے عوض کتنا علاقہ اسلام کے زیر نگیں آیا۔ ذیل میں ان تمام غزوات وسرایا کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ جن میں فریقین میں سے کسی کا بھی کوئی آدمی کام آیا:۔

غزوات سرایا	لشکر اسلام اور قائد	لشکر دشمن اور قائد	شہداء	مقتولین	کیفیت
(۱) غزوہ بدر رمضان ۲ھ	۳۱۳ خود نبی اکرمؐ	۱۰۰۰ ابوجہل	۲۲	۷۰	
(۲) غزوہ سویق ذی الحجہ ۲ھ	۲۰۰ خود نبی اکرمؐ	۲۰۰ ابوسفیان	۲	x	مقابلہ نہیں ہوا۔
(۳) غزوہ بنوسلیم محرم ۳ھ	۲۰۰ خود نبی اکرمؐ	قبیلہ غطفان وبنوسلیم	۲	؟	ابوسفیان ۲ مسلمان شہید کر کے چلا گیا
(۴) سریہ محمد بن مسلمہ ربیع الاول ۳ھ	۵ محمد بن سلمہ	کعب بن اشرف	x	۱	
(۵) غزوہ احد شوال ۳ھ	۶۵۰ خود نبی اکرمؐ	۳۰۰۰ ابوسفیان	۷۰	۳۰	
(۶) سریہ عبد اللہ بن انیس محرم ۴ھ	عبداللہ بن انیس	سفیان ہذلی	x	۱	
(۷) سریہ رجیع صفر ۴ھ	۱۰۔ عاصم بن ثابت	۱۰۰۔ قبیلہ عضل وقارہ	۱۰	x	

(۸) سریہ بئر معونہ صفر	۷۰ قاری و ممتاز عالم	ایک بڑی جماعت عل وذکوان کے قبائل	۶۹	x	
(۹) سریہ عمرو بن امیہ الضمری ربیع الاول ۴ھ	عمرو بن امیہ	بنوکلاب	x	۲	عمرو بن الضمری بچ گئے۔
(۱۰) غزوہ بنو مصطلق شعبان ۵ھ	خود نبی اکرمؐ	بنو مصطلق ـ حارث بن ضرار	x	۱۰	
(۱۱) غزوۂ احزاب ذیقعدہ ۵ھ	۳۰۰۰ خود نبی اکرمؐ	دس ہزار ابوسفیان	x	۱۰	
(۱۲) سریہ عبداللہ بن عتیک ۵ھ	۴ عبداللہ بن عتیک	ابورافع سلام بن ابوالحقیق	x	۱	
(۱۳) غزوۂ بنوقریظہ ذی الحجہ ۵ھ	خود نبی اکرم ﷺ	بنوقریظہ	۳	۴۰۰	
(۱۴) غزوۂ ذی قرد ربیع الثانی ۶ھ	سلمہ بن اکوع	بنوغطفان	۳	۱	
(۱۵) غزوۂ ذی القصہ ربیع الثانی ۶ھ	۱۰ محمد بن سلمہ	۱۰۰ بنوثعلبہ	۹	x	ڈکیتی کا واقعہ ۹ عالمان دین شہید محمد بن مسلمہ بچ نکلے بطور گشت گئے تھے کہ دشمن نے حملہ کردیا۔
(۱۶) سریہ وادی القریٰ رجب ۶ھ	۱۲ ـ زید بن حارثہ	ساکنان وادی القریٰ	۹	x	
(۱۷) سریہ عبداللہ بن رواحہ شوال ۶ھ	۳۰ عبد اللہ بن رواحہ	۳۰ اُسیر بن رزام	x	۵۲۶ ۳۰ یہودی	یہ بڑی غلط فہمی کی بنا پر ہوئی تھی

(۱۸) غزوہ عرینین شوال ۶ھ	۲۰ سوار کرز بن جابر الفہری	قبیلہ عکل وعرینہ کنانہ بن ابوالحقیق	x	۸	بیمار علاج کرانے آئے تھے پھر ڈکیتی کی۔
(۱۹) غزوۂ خیبر محرم ۷ھ	۱۴۰۰ حضور خود	۱۰۰۰۰ یہود خیبر	۱۸	۹۳	
(۲۰) غزوہ وادی القریٰ ۷ھ	۱۳۸۲ حضور خود	وادی القریٰ	۱	۱۱	
(۲۱) سریہ حسمی جمادی ۲۔ ۷ھ	۵۰۰ زید بن حارثہ	۱۰۲ ہنید بن عوص جزری	x	۲	
(۲۲) سریہ ابن ابو العوجاء ذی الحجہ ۷ھ	۵۰ ابن ابی العوجاء	بنو سلیم	۴۹	x	
(۲۳) سریہ ذات اطلح ربیع الاوّل ۸ھ	۱۵ کعب بن عمیر انصاری	بنو قضاعہ	۱۴	x	
(۲۴) سریہ موتہ جمادی الاولیٰ ۸ھ	۳۰۰۰ زید بن حارثہ	ایک لاکھ شرحبیل غسانی	۱۲	نامعلوم	
(۲۵) غزوہ مکہ رمضان ۸ھ	دس ہزار۔ حضورؐ خود	قریش مکہ	۲	۱۲	
(۲۶) سریہ خالد بن ولید شوال ۸ھ	۳۵۰- خالد بن ولید	بنو خزیمہ		۹۵	مقتولین کا خون بہا ادا کیا گیا۔
(۲۷) غزوہ حنین ۸ھ	۱۲ ہزار۔ حضور خود	بنو ہوازن ۔ بنو ثقیف وغیرہ	۶	۷۱	محاصرہ روک لیا گیا۔ سب مسلمان ہوگئے۔
(۲۸) غزوہ طائف	۱۲۰۰۰- حضور اکرم ﷺ	بنو ثقیف	۱۲	x	
			۳۲۴	۸۴۲	

یہ نقشہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق رحمۃ اللعالمین جلد دوم سے پیش کیا گیا ہے۔ گو آپ نے کل غزوات وسرایا کی تعداد ۸۴ گنوائی ہے۔ لیکن ہم نے صرف ان غزوات وسرایا کا ذکر کیا ہے۔ جن میں فریقین میں سے کسی کا کوئی آدمی مارا گیا ہو۔ ان میں سے اکثر سرایا

ایسے ہیں کہ بعض قبائل نے تبلیغ کے لیے آنحضرت ﷺ سے معلمین کا مطالبہ کیا تو کفار نے راستہ میں دھوکہ سے انہیں شہید کر ڈالا۔ کچھ ایسے ہیں جو گشتی دستوں کی صورت میں نکلے اور دشمن کے ہتھے چڑھ گئے۔ بعض ڈکیتی کے کیس تھے۔ بعض ایسے سرایا ہیں جنہیں مقبروں کو مسمار کر کے زمین کے برابر کرنے یا بتوں کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اگر صرف ان جنگوں کا ذکر کیا جائے جن میں با قاعدہ فریقین میں معرکہ کارزار گرم ہوا تو ان مقتولین کی تعداد صرف درج ذیل رہ جاتی ہے۔

	مسلمان	دشمن
(۱) غزوۂ بدر	۲۲	۷۰
(۲) غزوۂ احد	۷۰	۳۰
(۳) غزوۂ احزاب	۶	۱۰
(۴) غزوۂ بنو قریظہ	۴	۴۰۰
(۵) غزوۂ خیبر	۱۸	۹۳
(۶) سریہ موتہ	۱۲	نامعلوم
(۷) غزوہ مکہ	۲	۱۲
(۸) غزوہ حنین	۶	۷۱
(۹) غزوہ طائف	۱۲	x
کل تعداد	۱۵۲	۶۸۶

گویا حضور اکرم ﷺ کے زندگی بھر کے معرکوں میں مقتولین کی اصل تعداد ایک ہزار تک نہیں پہنچتی۔ ان جنگوں میں آٹھ سال کا عرصہ لگا اور دس لاکھ مربع میل پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ وسعت ۲۷۴ مربع میل فی دن نکلتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس مدت کو ۸ سال کے بجائے تقریباً دس سال شمار کرتے ہیں۔

فتح مکہ کی سرگزشت

پھر اگر دورِ نبوی کے معرکوں سے بھی انتخاب کیا جائے تو فتح مکہ جیسی ''پُر امن جنگ'' کی

مثال کہیں دنیا میں نہیں مل سکے گی۔ آپ نے حجاز کے مرکزی شہر مکہ کو فتح کیا تو صرف ۲ مسلمان شہید ہوئے۔ اور ۱۲ مشرکین مکہ۔ آپ ﷺ کو حرم میں اتنی خونریزی بھی گوارا نہ تھی۔ تاہم مکہ کی زیریں جانب سے آنے والے دستہ جس کی کمان خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی...... سے کچھ مشرکین الجھ گئے۔ جھڑپ ہوئی تو اتنے آدمی خلاف توقع تہ تیغ ہو گئے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس شاندار فتح کے حصول کے لیے آپ ﷺ نے کیا تدابیر اختیار فرمائی تھیں؟ اور وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) آپ ﷺ نے مکہ کی طرف اقدام کا مسئلہ انتہائی رازداری سے سرانجام دیا۔ آپ ﷺ نے حلیف قبائل کو جو پیغامات بھیجے۔ ان میں بھی پوری طرح یہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی تھی۔

(۲) آپ ﷺ نے فتح مکہ سے ایک دن پیشتر رات کو مضافات مکہ مرّ الظہر ان پر پڑاؤ ڈالا تو لشکر اسلامی کو میلوں میں پھیلا دیا۔ اور انہیں حکم دیا کہ ہر خیمہ میں آگ کے الاؤ روشن کیے جائیں۔ دشمن اس واقعہ سے نفسیاتی طور پر اتنا مرعوب ہوا کہ مقابلے کی تاب ہی ختم ہو گئی۔

(۳) ابوسفیان سپہ سالار دو آدمیوں کو ساتھ لے کر حالات کا جائزہ لینے نکلا۔ لیکن گرفتار ہو گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے گھوڑے پر بٹھایا تاکہ جلد از جلد دربار نبویؐ سے امان کا پروانہ حاصل کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو وُہ بھی جلد از جلد دربار نبوی میں پہنچے تاکہ امان لینے سے پیشتر قتل کر دیا جائے۔ حضرت عباسؓ پہلے پہنچ گئے۔ تو آپ ﷺ نے ابوسفیان کو دیکھ کر فرمایا:۔

''ابوسفیان ابھی وقت نہیں آیا کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں؟''

ابوسفیان نے جواب دیا۔ ''ہاں میں سمجھتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود ہوتا تو ضرور میری مدد کرتا''۔

پھر آپ ﷺ نے پوچھا۔ ''کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟''۔

ابوسفیان نے جواب دیا۔ ''البتہ اس میں ابھی مجھے کچھ تردد ہے''۔

حضور ﷺ اگر چاہتے تو اس سوال کے جواب سے پیشتر ہی اس ازلی دشمن اسلام اور جاسوس کو قتل کا حکم دے سکتے تھے۔ اور تاریخ عالم میں یہ واحد مثال ہے کہ اتنے بڑے دشمن کو کمال فراخ دلی اور عالی حوصلگی سے معاف کر دیا گیا ہو۔ لیکن آپ ﷺ کو اس کے قتل سے اس کا اسلام لانا زیادہ عزیز تھا۔ پھر وہ بھی کسی جبر و اکراہ یا دباؤ سے نہیں بلکہ ضمیر کے اطمینان کے ساتھ۔ ابو سفیان کا یہ جواب سن کر آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا ابھی اسے اپنے خیمے میں اپنے پاس لے جائیں۔ حضور ﷺ کے اس کردار نے ابوسفیان کے ضمیر کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔

(۴) دوسرے دن آپ ﷺ نے ابوسفیان کو پہاڑی کے ایک بلند مقام پر کھڑا کیا۔ اور اسلامی لشکر کو...... جو قبائل کے لحاظ سے مختلف فوجی دستوں میں بٹا ہوا تھا۔ حکم دیا کہ ابو سفیان کے سامنے سے پوری شان و شوکت سے گزرتے جائیں۔ یہ فوجی دستے اپنے الگ الگ علم سنبھالے ابوسفیان کے سامنے سے پہروں گزرتے رہے۔ اس نظارہ نے صرف ابوسفیان کو نہیں بلکہ تمام دیکھنے والوں کے دلوں میں اسلام کی دھاک بٹھا دی۔ مخالف فریق کے کسی فرد کو نہ یہ فرصت ملی، نہ تاب ہی باقی رہی کہ مقابلہ کے لیے کھڑا ہو۔ اس طرح یہ مرکزی شہر بلا مقابلہ ہی فتح ہو گیا۔

(بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب این رکز النبی الرایۃ یوم الفتح)

(۵) آپ ﷺ فاتحانہ حیثیت سے سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ عثمان بن طلحہ کلید بردار سے چابی منگوائی۔ کعبہ کو اس کے اندر پڑے ۳۶۰ بتوں کی آلائش سے پاک کیا۔ آپ ﷺ اپنی چھڑی سے بتوں کو گراتے اور توڑتے جاتے اور ساتھ یہ قرآنی آیت پڑھتے جاتے تھے:۔

﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ (۱۷ : ۸۱) (حق آ گیا اور باطل بھاگ کھڑا ہوا۔ بیشک باطل بھاگ کھڑا ہونے والا ہے۔)

(۶) فتح مکہ کے بعد بھی آپ ﷺ نے کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی۔ کعبہ میں کھڑے ہو کر اسلام کی حقانیت پر خطبہ ارشاد فرمایا اور اہالیان مکہ سے پوچھا۔ "بتاؤ آج تم مجھ سے کیسے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"۔ وہ بھیڑیئے جو آج تک پیغمبر اسلام کے خون کے پیاسے رہے اور جن کی مظالم کی داستانیں سُن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اگر ان میں کچھ بھی

انصاف اور جرأت ہوتی تو کبھی رحم کی اپیل نہ کرتے۔ انہیں اپنے مظالم خوب یاد تھے۔ مگر جب جان پر بن گئی تو کہنے لگے:۔

خَيْرًا اَخٌ كَرِيْمٌ وَابْنُ اَخٍ كَرِيْمٍ۔ ہمیں بھلائی کی توقع ہے آپ ﷺ شریف بھائی اور شریف برادرزادہ ہیں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں بھی حضرت یوسفؑ کی طرح تم سے وہی کچھ کہوں گا، جوانہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ یعنی

((لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔)) (آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔)

(طبری ج ا۔ باب فتح مکہ)

آپ ﷺ معافی کے اس عام اعلان سے پہلے ہی مندرجہ ذیل فرامین جاری کر چکے تھے:۔

(۱) جو شخص ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے۔

(۲) جو خانہ کعبہ کے اندر پہنچ جائے اسے قتل نہ کیا جائے گا۔

(۳) جو شخص ابوسفیان یا حکیم بن حزام کے گھر میں پناہ لے لے اسے بھی قتل نہ کیا جائے۔

(۴) معذور کا تعاقب نہ کیا جائے۔

(۵) بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور زخمیوں کو قتل نہ کیا جائے۔

(مسلم، کتاب الجہاد والسیر۔ باب فتح مکہ)

اب دیکھ لیجئے کہ باقی کون رہ جاتا ہے جسے قتل کیا جائے؟ الا یہ کہ کوئی شخص خود ہی اپنی موت کو دعوت دے رہا ہو۔

(۶) مہاجرین مکہ نے حضور اکرم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ انہیں ان کی مملوکہ جائیداد تو واپس دلا دیجائے۔ جس پر بعد میں قریش قابض ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''جو چیز اللہ کی راہ میں چھوڑ چکے ہو اب اس کا مطالبہ نہ کرو''۔ چنانچہ مہاجرین نے آپ ﷺ کے اس ارشاد کے سامنے برضاء و رغبت سر تسلیم خم کر دیا۔

(سیرت النبی ج ا ص ۵۳۵)

یہ تھی سرزمین حجاز کی وہ مرکزی جنگ جس میں نہ قتل ہوا نہ قتل عام، نہ قیدی بنائے گئے

اور نہ مال غنیمت تقسیم ہوا۔ بلکہ مہاجرین اپنی مملوکہ جائیداد سے بھی دستبردار ہو گئے۔ اب اس سپہ سالارِ اعظم کے عظیم کردار کا نتیجہ قرآن کی زبان سے سنیئے!

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِیْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ (۱۱۰: ۱،۲)

(جب اللہ تعالیٰ کی مدد آ پہنچی اور فتح حاصل ہو گئی تو تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول در غول اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔)

قبائل عرب کی ایک کثیر تعداد معرکہ مکہ کے انجام کی منتظر تھی۔ ان کے خیال کے مطابق مکہ کی فتح ہی اسلام کی حقانیت کی دلیل بن سکتی تھی۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا تو بہت سے قبائل حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور سرزمین حجاز کا بیشتر علاقہ مسلمانوں کے زیر نگین آ گیا۔

ان حقائق کی وضاحت کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ یا یہ کہ مسلمانوں کی جنگیں بھی ملک گیری کی ہوس اور لوٹ مار کی رغبت کی بنا پر ہوئی تھیں؟

جہاد اور دوسری جنگوں کا تقابل

فتح مکہ اور اس کے نتائج کے مطالعہ کے بعد اب ذرا عرب کی قبائلی جنگوں کی طرف نظر دوڑائیے۔ یا اس دور کی مہذب حکومتوں...... ایران و روم کی باہمی جنگوں پر...... انسانوں کے بے دریغ کشت و خون اور وحشت و بربریت کی جو تصویر سامنے آتی ہے۔ اسلام کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ایسی لڑائیوں سے تقابل لاحاصل ہے۔ ہم تقابل کے لیے صرف دو قسم کی لڑائیاں ملحوظ رکھیں گے۔

(۱) مقدس لڑائیاں یعنی مذہب کے نام پر لڑی جانے والی جنگیں۔

(۲) عصر حاضر کی مہذب ترین اقوام کی جنگیں۔ جنہیں بین الاقوامی قانون صلح و جنگ پر ناز ہے۔ اور یہ امن و بقا اور تکریم انسانیت کا دعویٰ لے کر اٹھی ہیں۔

(۱) مذہبی جنگیں

(۱) صلیبی جنگوں کے مقاصد پر ایک عیسائی مصنف کا تبصرہ:

دنیا صلیبی جنگوں کو دینی جنگیں شمار کرتی ہے۔ ان جنگوں کا آغاز عیسائی دنیا کی طرف

سے ہوا جنہوں نے دینِ عیسیٰ کی حمایت میں تلوار اُٹھائی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ قوانین عیسیٰ کی جو بے حرمتی ان عیسائیوں نے کی وہ اور کسی جگہ نہ ہوئی تھی۔ ان نام نہاد دینی جنگوں کا مقصد گبن کے الفاظ میں یہ تھا۔

''انہیں امید تھی کہ ترک امیروں سے ہاتھ آئی ہوئی لوٹ کھسوٹ ہر ایک شریک شہری کو امیر بنا دے گی۔ غیروں کی بیویوں کی خواہش اور یونان کی تمنا صلیب کے ان علمبرداروں کے قلب سے اتنی ہی قریب تھی۔ جتنا کہ ان کی زبانوں سے دور تھی''۔

(رومی سلطنت کا زوال اور تباہی از ایڈورڈ گبن)

(۲) فتح کے بعد بے دریغ کشت وخون:

صلیبی جنگوں میں پاپائے روم نے اپنی پوری طاقت سے امراء کے باہمی تنازعات ختم کرا کے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ متحد ہو کر حضرت عیسیٰؑ کے مدفن کو مسلمانوں سے آزاد کرائیں۔ ان جنگوں کے متعلق یہی عیسائی لکھتا ہے کہ: ''یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صلیبی جنگوں میں شمولیت کا مقصد دین کی نسبت دنیوی فوائد کا حصول زیادہ تھا۔

۱۰۹۶ء کے موسم گرما میں صلیبی فوج نے ارض مقدس کا رُخ کیا۔ ارض مقدس کے چند حکمرانوں کے سوا پوری دنیائے اسلام بے حسی کا شکار تھی۔ جبکہ یورپ کے اکثر ممالک اس صلیبی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ ۱۰۹۸ء کو بیت المقدس بھی صلیبی فوج نے فتح کر لیا۔ فتح کے بعد کشت وخون کا بازار گرم ہوا۔ عورتیں اور بچے بھی بے دریغ قتل کیے گئے۔ گلیوں میں ہر طرف خون بہہ رہا تھا۔ اور جب ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہا تو ان بے رحم سپاہیوں نے اپنے کپڑوں سے گرد اور خون کو جھاڑا اور عیسیٰ کے گرجا میں شکرانہ بجالانے کے لیے دوزانو ہو گئے''۔

(صلیبی جنگوں کی کہانی صفحہ ۲۷۳ بحوالہ جہاد ص ۵۵)

یہ وہی بیت المقدس تھا کہ جب اسے مسلمانوں نے فتح کیا تو عیسائیوں کا ایک قطرہ بھی خون نہ بہایا گیا۔ اور باوجود بطریق کے اصرار کے حضرت عمرؓ نے کلیسا میں نماز اس لیے ادا نہ کی کہ بعد میں کہیں کلیسا کو مسجد بنانے کی ریت نہ پڑ جائے۔

ببیں تفاوت ایں از کجا ست تا بکجا

(۳) عہد شکنی اور پاپائے روم کا کردار:

اب عیسائیوں کے ہاں عہد نامہ کے احترام کا حال بھی سن لیجئے۔ مسلمانوں سے عہد شکنی میں اہل یورپ کو اولیت حاصل ہے۔ یورپ کے ایک جرنیل ہولیڈی نے ترکوں پر کئی بار حملے کیے اور ہر بار شکست کھائی پھر صلح کا عہد کرتا۔ پھر دوسرے ہی سال مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر دیتا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس پوپ کا فتویٰ موجود تھا۔ کہ ''مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے عہد ناموں کو توڑنا جائز ہے''۔ ہولیڈی اور اس دور کے دوسرے بادشاہوں کو پاپائے روم عہد ناموں کو توڑنے کے احکام جاری کرتا تھا۔ اوڈیسی آس ODYSSEOUS لکھتا ہے کہ پولینڈ اور ہنگری کے نوجوان بادشاہ کو پوپ کے نمائندے نے عہد نامہ توڑنے پر اُکسایا۔

(ترکی یورپ میں ص ۴۵ بحوالہ جہاد از بریگیڈیئر گلزار احمد ص ۲۶۷)

موقع کو دیکھ کر عہد نامہ توڑنے کی داستان تو بڑی پرانی ہے۔ البتہ اسے توڑنے کے لیے مذہب کی طرف سے مقدس اختیارات مل جانا یہ مسیحیت کی مقدس جنگوں کو ہی شرف حاصل ہوتا رہا۔

(۴) امان دینے کے بعد لوٹ مار اور قتل:

اب صلیبی جنگوں میں ''امان'' کے احترام کا قصہ بھی سُن لیجئے:

پہلی صلیبی جنگ کے بعد طرابلس کے مسلمان بادشاہ نے کاؤنٹ بوہیمانڈ کو پیغام بھیجا کہ وہ معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔ ساتھ ہی دس گھوڑے اور سونا بھی خیر سگالی کے طور پر بھیجا۔ مگر کاؤنٹ نے کہا کہ وہ صرف ایک شرط پر معاہدہ کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ وہ عیسائی ہو جائے۔ (پہلی صلیبی جنگ' ص ۷۹ بحوالہ جہاد) اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب کاؤنٹ امان دے چکنے کے بعد پورے شہر کے زن و مرد کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔ بوہیمانڈ نے ترجمان کے ذریعہ مسلمان امیروں کو بتایا کہ اگر وہ صدر دروازے کے اوپر والے محل میں پناہ لے لیں، تو ان کو، ان کی بیویوں اور ان کے بچوں کو پناہ دے دی جائے گی اور ان کا مال واپس کر دیا جائیگا شہر کا ایک کونہ بھی مسلمانوں کی لاشوں سے خالی نہ تھا اور چلنا پھرنا دشوار ہو گیا تھا بوہیمانڈ نے جن کو امان دی تھی ان کو پکڑ وا کر ان کا سونا چاندی اور زیورات ان سے لے لیے اور ان میں بعض کو مروا دیا اور باقی ماندہ کو غلام بنا کر انطاکیہ بھیج دیا گیا۔ (ایضاً ص ۷۷)

صلیبی جنگوں سے متعلق جو چند واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ان سب میں ایک بات قدر مشترک کے طور پر بھی پائی جاتی ہے۔اور وہ ہے بے دریغ کشت وخون اور قتل ناحق ۔فتح کے بعد صلح کرنے کے بعد بھی اور امان دینے کے بعد بھی اور یہی بات ہم اس وقت دیکھنا چاہتے ہیں۔کہ جہاد میں انسانی خون کی قدر و قیمت کیا تھی اور ان میں کیا نسبت رہی۔

یہ تو تھا عیسائیوں کا مفتوح مسلمانوں سے سلوک۔اب دیکھئے انہوں نے آپس میں کیا کچھ کیا۔قاضی سلیمان منصور پوری رحمۃ للعالمین ج ۲ کے صفحہ ۲۱۴ پر رقمطراز ہیں کہ:۔

(۱) یورپ کی مقدس مذہبی انجمنوں نے جس قدر نفوس کو ہلاک کیا۔ان کی تعداد لاکھوں سے زائد ہے۔

(۲) جان ڈیوڈ پورٹ نے اپنی کتاب ''اپالوجی آف محمد اینڈ قرآن'' میں مذہبی عدالت کے احکام سے ہلاک شدہ نفوس کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی ہے۔جو عیسائیوں کے ہاتھوں عیسائیوں کی ہوئی تھی۔

(۳) اکیلی سلطنت سپین نے تین لاکھ چالیس ہزار عیسائیوں کو قتل کیا تھا۔جس میں بتیس ہزار زندہ جلائے گئے تھے۔دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے پانچ لاکھ یہودیوں کو محض اس بنا پر قتل کر دیا تھا کہ وہ یہودی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔

جنگ مہابھارت:

یہ ہندوؤں کے دو بڑے خاندانوں ......کورو اور پانڈو...... کے درمیان ہوئی۔خالص مذہبی جنگ تھی۔جس میں کرشن مہاراج...... جو ہندوؤں میں اوتار تسلیم کیے جاتے تھے پانڈوؤں کے سرپرست اور طرفدار تھے۔اور حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کو بھڑکانے اور اسے طویل تر بنانے میں کرشن جی کے اُپدیشوں کو بہت دخل تھا۔اس مقدس مذہبی جنگ میں فریقین کے مقتولوں کی تعداد کروڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ (رحمۃ للعالمین ج ۲ ص ۲۱۴ اور تاریخ پاک و ہند۔ایم شمس الدین ص ۷)

پھر ہندوؤں میں مذہب کے نام پر ہندوؤں ہی کو قتل کرنے کا ایک اور محاذ بھی کھلا ہے۔وہ ہے ان میں ذات پات کی تمیز اور اونچ نیچ کا تفاوت......اونچی ذات کی ہر وقت شودر سے چپقلش اور جنگ جاری رہتی ہے۔ابھی پچھلے دنوں خبر شائع ہوئی تھی کہ ہندوستان میں ۱۹۷۵ تا ۱۹۸۰ء

سال کے دوران اونچی ذات والے ہندوؤں نے نیچی ذات والے ہندوؤں (ہریجنوں) پر نجی طور پر جو حملے کیے اس میں ۱۸۵۲ ہریجن قتل ہوئے۔ اور ۱۹۴۱ کو اغوا کیا گیا۔

(نوائے وقت ۱۰ جولائی ۱۹۸۱ء)

(ب) عصر حاضر کی مہذب اقوام کی جنگیں

یوں تو ایسی جنگیں بہت ہیں۔ ہم یہاں صرف جنگ عظیم اول اور دوم کا ذکر کریں گے۔ کیونکہ ان جنگوں میں حصہ لینے والے سب کے سب انسانیت کے علمبردار تھے جو آپس میں بے دریغ کشت و خون بہا کر انسانیت اور امن و آشتی کا علم بلند کر رہے تھے۔

پہلی جنگ عظیم میں ابتداءً ۶ ممالک نے حصہ لیا، جنگ کے اختتام تک یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۴۱ تک پہنچ گئی تھی۔ جرمنی اور آسٹریا ایک طرف تھے۔ دوسری طرف حق پرست اتحادی تھے یعنی برطانیہ، اٹلی، فرانس اور روس۔

اتحادی اس جنگ کا یہ مقصد بتاتے تھے کہ چھوٹی سلطنتوں کی آزادی اور حفاظت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ جنگ لڑی جارہی ہے اس چھوٹے سے مقصد کے حصول کے لیے جس قدر قتل و غارت ہوئی اس کا نقشہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ اس نقشہ کو پیش کرنے سے مقصد صرف یہی نہیں کہ ہلاک شدہ نفوس کی تعداد کا صحیح پتہ چل جائے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ آئندہ ابواب میں جنگوں کے مقاصد یورپی اقوام کے خفیہ معاہدات اور اندرونی جھگڑے، عربوں سے غداری اور عہد شکنی کے بیشمار واقعات کے حوالہ جات آئیں گے۔ یہ نقشہ آپ کو ابتدائی معلومات مہیا کرے گا۔

سردست اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ حق پرست اتحادیوں نے ظاہری اتحاد کے پردے میں خفیہ معاہدات کے ذریعہ اس ''غرض و غایت'' کی اس قدر مٹی پلید کی کہ چھوٹی سلطنتوں کا کچومر نکل گیا۔ اس جنگ میں مقتولین کی تعداد ایک محتاط اندازہ کے مطابق پچاسی لاکھ اٹھائیس ہزار کے لگ بھگ مجروحین، قیدی اور لاپتہ لوگوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ مصارف جنگ اربوں ڈالر تک جا پہنچے اور اس کا نتیجہ کیا نکلا! صرف یہ کہ بڑی طاقتوں نے بندر بانٹ کے ذریعہ چھوٹی سلطنتوں کی آزادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دوسری جنگ عظیم میں (۱۹۳۹-۴۵) میں ۲۸ ممالک شریک ہوئے۔ مقتولین کی تعداد

ایک کروڑ ۵۰ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم پھینک کر جان و مال اور زمین کی جو بربادی کی گئی وہ سب کے سامنے ہے۔

	پہلی جنگ عظیم 1914 تا 1918		دوسری جنگ عظیم 1939 تا 1945	
	ہلاک	قیدی یا لاپتہ	ہلاک	قیدی یا لاپتہ
آسٹریلیا ہنگری صرف پہلی جنگ			26976	
آسٹریا	1200000	2200000	280	
اٹلی	650	600	149496	
امریکہ	126	4500	291557	
برازیل			943	
برطانیہ	908371	991652	357116	
بلجیئم	13716	34659	8460	
بلغاریہ	87500	27029	6671	
پرتگال	7222	12318		
پولینڈ			664	
ترکی	325	250		
جاپان	300	3	1270	
جرمنی	1773700	1152800	3250	
جنوبی افریقہ			2473	
چیکوسلواکیہ			6683	
چین			1324516	

ڈنمارک			4339	
روس	1700	2500	6115000	
رومانیہ	335706	80	350	
سربیہ	45	152958		
فرانس	1357800	537	201568	
فن لینڈ			79047	
کینیڈا			32412	
ناروے			200	
نیدرلینڈ			6500	
نیوزی لینڈ			11625	
ہندوستان			32121	
ہنگری			147435	
یوگوسلاویہ			305	
یونان	5	1	17024	
	8528315	8543919	14942962	

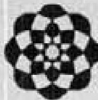
مندرجہ بالا اعداد و شمار عالمی معلومات مطبوعہ فیروز سنز سے انتہائی احتیاط سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس نقشہ سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) پہلی جنگ متواتر ۴ سال جاری رہی۔ اس میں ۱۴ ممالک نے حصہ لیا۔ ۸۵ لاکھ سے زائد آدمی مارے گئے اور اتنے ہی ہلاک ہوئے۔ اور مقتولین ڈیڑھ کروڑ تھے۔ عرصہ جنگ ڈیڑھ گنا، شریک ممالک دوگنا اور مقتولین ۲ گنا ہے۔

(۲) دوسری عظیم متواتر چھ سال جاری رہی اس میں ۲۸ ممالک نے حصہ لیا اور مقتولین ڈیڑھ کروڑ تھے۔ عرصہ جنگ ڈیڑھ گنا شریک ممالک دوگنا اور مقتولین بھی دوگنا تھے۔

(۳) پہلی جنگ میں جن ۲۴ ممالک نے حصہ لیا۔ ان میں صرف دو ممالک پرتگال اور ترکی نے دوسری جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ باقی سب کے سب دوسری جنگ میں شریک رہے۔

(۴) ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت جنگیں اور ان کے بعد سمجھوتے علاقہ میں امن قائم نہیں کرتے بلکہ فتنہ و فساد اور ظلم کو اور زیادہ بھڑکا دیتے ہیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد معاہدہ فرسائی میں شرائط طے پاگئیں تو اکثر سیاسی مبصرین نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ اس معاہدہ میں آئندہ جنگ کا بیج بو دیا گیا ہے۔



باب پنجم

اسلام کے قوانین صلح و جنگ (۱)

اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ میں تفصیلی ہدایات دی ہیں۔اور رسول اللہ ﷺ نے ان ہدایات پر عمل کر کے اس کا عملی نمونہ بھی پیش فرمادیا ہے۔ان احکام و ہدایات کی اتباع ہر مسلمان پر حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ پر بھی واجب تھی۔اور آج بھی واجب الاتباع ہیں اور غیر متبدل ہیں۔یہاں ہم صرف ان قوانین کا ذکر کریں گے جو جنگ اور صلح سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) جنگ کن صورتوں میں ضروری یا جائز ہے ؟

اگر مندرجہ ذیل اسباب میں سے کوئی ایک سبب یا زیادہ پیدا ہو جائیں تو جنگ کرنا ضروری ہو جاتا ہے:

(۱) جان و مال کی حفاظت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔﴾ (۳۹/۲۲)

(جن مسلمانوں سے لڑائی کی جاتی رہی ہے ان کو بھی لڑائی کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اتنی بات کہنے پر ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے۔)

جہاد سے متعلق سب سے پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ یہی آیت ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں یا ان کے گھر بار چھین کر انہیں ان کی ملکیتوں سے بے دخل کر دیا ہے اور ان کے مذہبی عقائد پر تشدد کر کے انہیں دکھ پہنچایا ہے۔ان سے اپنی

مذہبی آزادی اور بنیادی حقوق کی بحالی کی خاطر جنگ کرنا ضروری ہے۔

(۲) مدافعانہ جنگ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔﴾ (۱۹۰/۲)

(اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں، تم بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان سے لڑو۔ مگر زیادتی نہ کرنا کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔)

جب کوئی قوت اسلام کو مٹانے اور اسلامی نظام کو فنا کرنے کے لیے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابلہ میں نکل آئیں۔

(۳) مظلوم مسلمانوں کی فریاد:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوا۔ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ۔﴾ (۷۲/۸)

(اور جو لوگ ایمان لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کو ان کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں ہاں وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد چاہیں۔ تو ان کی مدد کرنا لازم ہے۔)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی جگہ مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھائے جا رہے ہوں۔ اور وہ کسی مسلمان ملک سے امداد طلب کریں تو ان پر ان کی امداد کرنا اور جنگ کے ذریعہ ان کو آزادی دلوانا فرض ہو جاتا ہے۔

(۴) احکام شرعیہ کی تکمیل میں رکاوٹ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ

(اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو اس شہر سے نکال جس

هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا﴾ (۷۵/۴)

کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔)

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مظلوم مسلمان امداد طلب نہ بھی کریں تب بھی ان کی مدد کو پہنچنا یا ان کی تکالیف کا مداوا کرنا ایک آزاد مسلم ریاست پر فرض ہوتا ہے۔

(۵) بدعہدی یا عہد شکنی:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (۹:۱۳)

(اور اگر عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں طعن کرنے لگیں تو ان کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو۔ یہ بے ایمان لوگ ہیں اور ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ بھلا تم ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور اللہ کے رسول ﷺ کو جلاوطن کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور انہوں نے تم سے (عہد شکنی کی) ابتدا کی۔ کیا تم ایسے لوگوں سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ ڈرنے کے لائق صرف اللہ ہے بشرطیکہ تم ایمان رکھتے ہو۔)

یعنی معاہدہ صلح کے بعد بدعہدی کرنا دراصل جنگ کے لیے الٹی میٹم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں معاہد قوم کو انتباہ کرنا چاہیے اگر وہ باز نہ آئے تو جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

(۶) دفعیہ فتنہ و فساد:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ (۱۹۳/۲)

(اور ان سے اس وقت تک لڑائی کرو کہ فتنہ نیست و نابود ہو جائے اللہ ہی کا دین (نظامِ حیات رائج) ہو جائے۔)

فتنہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اور اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو جنگ کے جواز کی سب صورتوں میں فتنہ ہی کی کوئی نہ کوئی قسم پائی جاتی ہے۔ یہاں فتنہ سے مراد خدا فراموش اور لادینی حکومت ہے۔ جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس صورت میں یہ جنگ مدافعانہ نہیں بلکہ اصلاحی جنگ کہلائے گی۔ دنیا سے فتنہ کا خاتمہ ہی اسلام کا حقیقی نصب العین ہے۔

(۷) قتل سفراء:

بین الاقوامی تعلقات کی استواری کے لیے ''ایفائے عہد'' کے بعد دوسری ضروری چیز سفارتی آداب کو اچھے طریقے پر ملحوظ رکھنا ہے۔ سفارتی آداب اور وفود کا احترام اتنا ہی اہم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وفات کے وقت اس کی خصوصی وصیت فرمائی تھی۔

سفارتی آداب کا انتہائی بگاڑ یہ ہوتا ہے کہ سفیر کو قتل کر دیا جائے۔ مغرور حکمران بالعموم ایسی حرکت کرتے تھے۔ سفیر کا قتل درحقیقت جنگ کا الٹی میٹم ہوتا ہے۔ اور کوئی خوددار حکومت اسے برداشت نہیں کرتی۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کیے جائیں۔ مسیلمہ کذاب نے جب اپنا قاصد عبادہ بن حارث بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:۔

((لَوْلَا اَن الرسل لَا تُقْتَل لَضَرَبْتُ غُنُقَکَ ۔)) (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب الرسل) (اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔)

صلح حدیبیہ کے وقت جب یہ افواہ مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے پورے کے پورے چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم سے خون پر بیعت لی۔ کیونکہ یہ قومی وقار کا مسئلہ تھا اور اگر خدانخواستہ یہ خبر صحیح ہوتی۔ تو اس موقعہ پر جنگ یقیناً ناگزیر تھی۔ جنگ موتہ بھی اسی لیے شام کے ساحل پر جا کر لڑی گئی تھی کہ عیسائیوں کے رئیس شرحبیل بن عمرو نے رسول اللہ ﷺ کے پہلے قاصد دحیہ کلبی کو لوٹ لیا تھا اور دوسرے حارث بن عمرو کو قتل کر دیا تھا۔ لہذا اقصاص کی خاطر آپ ﷺ نے یہ لشکر کشی کی تھی۔ (سیرۃ النبی از شبلی نعمانی ص ۵۱۹ مطبوعہ ناشرین قرآن لمیٹڈ لاہور)

داخلی انتشار

داخلی انتشار بعض دفعہ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ اس سے ریاست کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور فوج طلب کرنا پڑتی ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

ارتداد:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (۲/۲۱۷)

(اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر کافر ہو جائے گا اور کافر ہی مرے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔)

اسلام ہر شخص کو دین اختیار کرنے میں پوری آزادی دیتا ہے۔ لیکن اسلام لانے کے بعد دین سے پھر جانے کو سخت جرم قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام ایک تحریک ہے اور اس سے پھر کے دشمن سے جا ملنا بغاوت کے مترادف ہے۔ جس کی سزا دنیا کے ہر قانون میں قتل ہے۔ مرتد ہونے والے فرد یا جماعت کو پہلے گفت وشنید کے ذریعہ توبہ کی تلقین کی جائے گی۔ یہ تلقین تین بار ہونی چاہیے اور مرتدین کو سوچنے کا موقع دینا چاہیے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حلولیوں کو، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا سمجھتے تھے تین دفعہ تلقین کے بعد زندہ جلا دیا تھا یا گروہ کثیر کی صورت میں ان سے باقاعدہ جہاد کیا جائے گا جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ اور دوسرے مرتدین سے کیا۔ اسی طرح جو لوگ نبوت کا دعویٰ کریں، ان سے اور ان کے حواریوں سے بھی جنگ کی جائے گی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف فوج کشی کی۔ اور جہاد کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچایا۔

(۹) بغاوت:

بغاوت کی وجوہ عموماً یہ ہوتی ہیں کہ:

(۱) سربراہ مملکت کا اپنا کردار ٹھیک نہ ہو۔ یا اس کے عقائد و نظریات سے اختلاف ہو۔

(۲) وہ رعایا پر ظلم کرتا ہو۔ اپنے حقوق تو جبراً وصول کرے لیکن رعایا کے حقوق پر توجہ نہ دے۔

(۳) ذاتی مفادات مثلاً ہوس ملک گیری کی بنا پر کوئی طبقہ سربراہ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو۔ یا کوئی اطاعت گزار قوم اطاعت گزاری یا جزیہ کی ادائیگی سے انکار کردے۔

ان تمام صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی اسلام بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اگر امام کا رعایا پر ظلم کرنا جرم ہے۔ تو اس کے خلاف بغاوت کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا اس سے بڑا جرم ہے البتہ اسلام سے پھرنے والوں کے خلاف جہاد کر کے ان کا خاتمہ کیا جائے گا۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ اَتَاكُمْ وَاَمْرُكُمْ جَمِيعٌ عَلٰى رَجُلٍ وَاحِدٍ يُرِيدُ اَنْ يَّشُقَّ عَصَاكُمْ اَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوْهُ-)) (مسلم، کتاب الامارۃ والقضاء)

(اگر تمہارے معاملات کسی ایک شخص پر اکٹھے ہوں (یعنی تم سب کا کسی ایک شخص کی امارت پر اتفاق ہو) پھر کوئی شخص تمہاری قوت یا تمہاری جماعت میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرے تو اسے قتل کردو۔)

نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ:۔

((اِذَا بُوْيِعَ الْخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الْاٰخِرَ مِنْهُمَا-)) (مسلم، ایضا)

(جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو بعد والے کو قتل کردو۔)

اور ظاہر ہے کہ باغی عنصر بھی اپنے الگ سردار کے ماتحت ہو کر بغاوت کرتا ہے۔ خلافت راشدہ میں بغاوت کے خلاف جہاد کی مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خوارج کے خلاف جنگ کر کے اس فتنہ کو دبانا ہے۔ دور نبوی میں اکثر معاہد قبیلے اور بالخصوص یہود عہد شکنی کر کے بغاوت کرتے رہے جن کی بروقت سرکوبی کی جاتی رہی۔

(۱۰) رہزنی اور ڈکیتی:

رہزنی اور ڈکیتی کے انفرادی مقدمات تو عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے۔ البتہ اگر ایسی غنڈہ گردی شدید صورت اختیار کر جائے تو فوج طلب کی جاسکتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ﴾ (۳۳:۵)

لڑائی لڑیں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیے جائیں یا ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک بدر کر دیا جائیں۔)

آیت مذکور میں یہ مختلف سزائیں ان کی تخریب کاری کی نوعیت کوملحوظ رکھ کر تجویز کی گئی ہیں حاکم وقت ان کے جرم کی نوعیت کا لحاظ رکھ کر ایک سزا بھی تجویز کرسکتا ہے۔ اور بیک وقت کئی سزائیں بھی دے سکتا ہے۔

شوال ۶ ھ میں قبیلہ عکل اور عُرینہ کے کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس آ کر اسلام لائے اور وہیں رہنا شروع کیا۔ ان لوگوں کو مدینہ کی آب وہوا راس نہ آئی اور آپ ﷺ سے اس تکلیف کی شکایت کی۔ حضور ﷺ نے انہیں بیت المال کی چراگاہ میں رہنے کو کہا کہ وہاں رہ کر خوب اونٹنیوں کا دودھ پئیں اور یسار نامی ایک چرواہا ساتھ کر دیا۔ یہ لوگ چند دنوں میں خوب موٹے تازے ہو گئے۔ ان کو شرارت جو سوجھی تو یسار چرواہے کو بڑی بے دردی سے مار ڈالا۔ اور اونٹ ہنکا کر چلتے بنے۔ آپ ﷺ نے ان کے تعاقب میں آدمی بھیجے جو جا کر انہیں پکڑ لائے۔ آپ ﷺ نے اسی بے دردی سے ان کو مروایا جو سلوک انہوں نے چرواہے کے ساتھ کیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ پھر حرہ کے ایک کونے میں ڈال دیئے گئے جہاں وہ مر گئے۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب قصة عكل و عُرينة)

(۲) تخریب کار یا منافق:

ایسے لوگوں سے باقاعدہ جنگ تو نہیں البتہ ان کی ہر ممکن طریقہ سے سرکوبی ضروری ہے۔ اور وہ ہے تخریب کار یعنی (ففتھ کالمسٹ FIFTH COLOUMAST) یا منافقین کا طبقہ۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے کوئی جنگ نہیں کی تاہم بوقت ضرورت اس طبقہ کی سرکوبی کے لیے اگر ضرورت ہو تو فوج کی مدد بھی لی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اسلام میں جنگ کا مقصد محض فتنہ وفساد کا دفعیہ ہے وہ ملک کے اندر ہو یا باہر ایک ہی بات ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾ (۷۳/۹)

(اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے لڑو اوران پر سختی کرو۔)

جنگ اُحد کے موقعہ پر منافقین نے اسلامی فوج کو سخت نقصان پہنچایا ایک ہزار کی جمعیت مقابلہ کو نکلی۔ تو عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس چلا آیا اور کہنے لگا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے میرا مشورہ (مدینہ کے اندر رہ کر لڑنے کا) قبول نہیں کیا۔ لہذا میں اس جنگ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس واقعہ سے ایک تو اسلامی فوج میں بے دلی پھیلی دوسرے باقی مسلمان فوج دو طرح کے نظریات میں بٹ گئی۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ اب ہمیں پہلے ان منافقوں سے نبٹ لینا اور ان سے جنگ کرنا چاہیے۔ اور دوسرا گروہ اور اکثر صحابہ اور حضور اکرم ﷺ یہ چاہتے تھے کہ کفار کے ساتھ لڑائی کی طرف توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اگر مسلمان اس وقت منافقین سے اُلجھ جاتے تو یہ داخلی انتشار ان کی شکست فاش کا موجب بن سکتا تھا۔ قرآن حکیم نے اس کا نقشہ یوں پیش فرمایا ہے:۔

﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا﴾ (۸۷/۴)

(مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ ہو گئے ہو حالانکہ اللہ نے ان بدکاریوں کی سزا میں ان کو (کفر کی طرف پھیر) اُلٹ دیا ہے۔)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

((اِنَّهَا طَيْبَةُ تَنْفِي الذُّنُوْبَ كَمَا تَنْفِي النَّارُ خَبَثَ الْفِضَّةِ)) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ احد)

(مدینہ کا نام طیبہ (پاکیزہ) ہے وہ گنہگاروں کو اس طرح نکال پھینک دیتا ہے جیسے بھٹی چاندی کا میل نکال دیتی ہے۔)

چونکہ اس موقعہ پر منافقین کی خبر لینا شدید خطرہ شکست کا باعث بن سکتا تھا۔ لہذا اس موقعہ پر بھی منافقین مسلمانوں کی سختی سے بچ گئے۔

منافقین کا طبقہ دراصل اقتدار کی پیداوار ہوتا ہے۔ جنگ بدر سے پیشتر جبکہ مسلمانوں کے پاس اقتدار نہ تھا یہ طبقہ بھی وجود میں نہیں آیا تھا منافقین کا نفاق یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق تو سارے وصول کر لیتا ہے لیکن فرائض سے حتی الوسع گریز کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر منافق کا اصول مفاد پرستی ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنا مفاد کفار کی طرف دیکھے تو درپردہ اس کے ساتھ روابط قائم کر لیتا ہے۔ جنگ میں یہ لوگ صرف اس وقت شریک ہوتے تھے جب مال غنیمت کا یقینی مفاد ان کے سامنے ہوتا تھا۔ غزوۂ حدیبیہ میں کسی منافق نے شرکت نہیں کی۔ اس لیے کہ یہ لوگ عمرہ کی نیت

سے گئے تھے۔ وہاں مال غنیمت کا سوال ہی نہ تھا۔ غزوۂ تبوک میں سفر طویل اور تکلیف دہ موسم شدید گرم۔ فصلیں پک کر تیار کھڑی تھیں۔ دشمن لاکھوں کی تعداد میں تھا لہذا اس موقعہ پر بھی منافقین نے زیادہ تر بہانہ سازی سے کام لیا۔

منافقوں کی فتنہ انگیزیاں:

دورِ نبوی میں ان کی فتنہ انگیزیوں کے کارنامے کچھ اس طرح ہیں۔

(۱) جنگ بدر سے پہلے اور بعد قریش اور عبداللہ بن ابی کی خط و کتابت۔

(۲) غزوہ بنو قینقاع کے موقعہ پر عبداللہ بن ابی کی یہود کے لیے طرفداری۔ یہود جب محاصرہ کے بعد صلح پر اُتر آئے تو عبداللہ بن ابی جو ان کا حلیف تھا رسول اللہ ﷺ سے پرزور سفارش کی تھی کہ انہیں جلاوطن کردیا جائے اور اس سے زیادہ کوئی سزا نہ دی جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کی بات مان لی۔

(۳) جب بنو نضیر کو آپ ﷺ نے جلاوطنی کا حکم دیا تو عبداللہ بن ابی انہیں امداد کے پیغامات بھیجتا اور انہیں تسلی دیتا رہا کہ اگر چاہو تو یہ حکم قبول کرو۔ ورنہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کرلیا تو عبداللہ بن ابی نے ان سے منافقت کی اور ان کے نزدیک تک نہ پھٹکا۔

(۴) غزوہ بنو مصطلق میں ایک دفعہ چشمہ سے پانی لینے پر ایک انصار اور ایک مہاجر میں جھگڑا پیدا ہوگیا۔ انصار نے قدیم دستور کے موافق یاللانصار کا نعرہ مارا۔ اسی طرح مہاجر نے بھی ایسا ہی نعرہ لگا یا دیا۔ قریب تھا کہ لڑائی چھڑ جائے لیکن آپ ﷺ نے وہاں پہنچ کر بیچ بچاؤ کرادیا۔ اس موقعہ پر عبداللہ بن ابی نے انصار سے مخاطب ہوکر کہا:

"تم نے مہاجرین کو اپنے ہاں پناہ دے کر خواہ مخواہ بلا مول لے لی۔ تم نے انہیں پال کر اتنا موٹا کردیا کہ وہ اب تمہارے مقابلے پر آگئے ہیں۔ اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا، دستگیری سے ہاتھ اُٹھالو۔ تو یہ لوگ تتر بتر ہوجائیں گے"۔ اسی تقریر کی طرف قرآن کریم نے یوں اشارہ کیا ہے:۔

﴿يَقُولُونَ لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ﴾ (۸/۶۳) (کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینے پہنچے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔)

اس موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور عبداللہ بن ابی کے قتل کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ لوگ کہنے لگیں کہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں''۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر تحت سورۃ منافقون ۶۳)

(۵) اسی غزوہ سے واپسی پر واقعہ افک پیش آیا۔ منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا کر جیسے اُسے مشہور کیا اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔

(۶) جنگ احزاب کے موقعہ پر مدینہ کے اندر موجود بنو قریظہ کے ساتھ منافقین مل گئے اور فتنہ گری میں برابر کے شریک رہے۔

(۷) جنگ خیبر کی تیاریوں کی خفیہ اطلاع عبداللہ بن ابی نے یہودیوں کو پہنچائی۔ ساتھ ہی یہ پیغام بھی بھیجا کہ:۔ ''تم مسلمانوں سے نہ ڈرنا۔ ان کی ہستی کیا ہے۔ مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک موجود نہیں''۔ اس پیغام پر یہود چوکس ہو گئے اور بنو غطفان وغیرہ سے اتحاد کے معاہدے کیے۔

(۸) اپنی تخریبی سرگرمیوں کو منظم بنانے کے لیے ۹ ھ میں مسجد ضرار تعمیر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسجد کا افتتاح فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ بھی فرمالیا کہ غزوہ تبوک کے بعد اس میں افتتاحی نماز پڑھائیں گے۔ دریں اثنا اس مسجد کو جو امت میں افتراق وانتشار کا ایک سبب بن سکتا تھا۔ مسمار کرا دیا۔

یہ ہے منافقین کے کارناموں کی مجمل فہرست۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کو قتل کرا سکتے تھے۔ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ کی رُو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اجازت بھی تھی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کی نرمی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع پر درگزر فرماتے رہے۔ ان سے باقاعدہ جنگ اس لیے مشکل ہوتی ہے کہ نفاق کا تعلق باطن سے ہوتا ہے۔ ظاہر سے نہیں۔ ظاہری طور پر وہ مسلمان ہوتے ہیں۔ اور احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے۔ باطن پر نہیں۔ ان پر سختی کا مطلب ان سے جنگ یا جہاد نہیں بلکہ ان سے باز پرس میں نرمی کے بجائے سختی کرنا ہے۔

یہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے منافقین کی بات تھی۔ آج کے منافقین کی فتنہ گری کے اطوار بدل چکے ہیں۔ حکومت وقت کے خلاف خفیہ سازشیں، دشمن کو خفیہ راز مہیا کرنا۔ سرکاری املاک کو برباد کرنا، بیرونی طاقتوں اور ان کے نظریات کے لیے میدان ہموار کرنا، ادب وثقافت کے نام پر

لوگوں کو اسلامی شعائر سے متنفر کرنا اور باطل نظریات کا پرچار کرنا وغیرہ ہیں۔ ان کے متعلق یہ احکام ہیں کہ جس منافق کے جرم کے متعلق ثبوت مہیا ہو جائے۔ اس کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ہرگز دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ منافقین کا طبقہ کھلے دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

(۲) جنگ کن صورتوں میں ناجائز ہے؟

(۱) دنیوی اغراض و مقاصد:

ذاتی اغراض خواہ ہوس ملک گیری پر مبنی ہوں یا مفادات کے تحفظ یا نسلی مفاخرت پر مبنی ہوں۔ وطنیت اور قومیت کی جنگ ہو۔ یا محض انتقام کے جوش میں لڑی جائے، ان سب قسموں کی جنگ ناجائز بلکہ حرام ہے۔ اس جنگ میں مرنے والوں کا خون حملہ آور کی گردن پر ہوگا۔ اور جو مال یا زمین حاصل کی جائے گی وہ غصب میں شمار ہوگی۔

خون ناحق، غصب کردہ اموال کے متعلق جو احکام قرآن کریم میں آئے ہیں۔ وہ سب کو معلوم ہیں تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ صرف وہ ہے جو اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے لڑا جائے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی جنگ حرام ہے۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

(۲) عہد کی پابندی (جب تک میعاد ختم نہ ہو):

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْــًٔا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ﴾ (۹/۴)

(مگر جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کر رکھا ہے اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور بھی نہیں کیا۔ نہ ہی تمہارے مقابلے میں کسی دوسرے کی مدد کی تو جس مدت تک ان کے ساتھ عہد کیا ہو، اسے پورا کرو۔)

اگر کسی ملک کے مسلمان فریاد بھی کریں۔ تو اگر اس ملک سے معاہدہ ہے۔ تو جنگ نہیں کی جا سکتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ (۷۲/۸)

(اگر (مظلوم مسلمان) دین کے معاملہ میں مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے الا یہ کہ تمہارے اور اُن کے درمیان (صلح کا) معاہدہ ہو چکا ہو۔)

(۳) غیر جانبدار قوم:

جو لوگ ظالم یا بدکار نہیں۔ نہ وہ دین حق کو مٹانے یا دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو خلق خدا کے امن کو غارت نہیں کرتے وہ خواہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور ان کے دینی عقائد کیسے ہی باطل ہوں، ان سے جنگ نہیں کی جا سکتی۔ ارشاد باری ہے:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (۹،۸/۶۰)

(اللہ تمہیں ان لوگوں سے بھلائی کرنے اور انصاف کا سلوک کرنے سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین کے سلسلہ میں لڑائی نہیں لی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے روکتا ہے۔ جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہیں نکالنے میں دشمنوں کی مدد کی ہے۔ انہیں جو کوئی دوست بنائے وہ ظالم ہے۔)

(۴) صلح کی پیشکش:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝﴾ (۹۰:۴)

(پھر اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی کریں اور نہ لڑیں۔ اور تمہاری طرف صلح (کا پیغام) بھیجیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان پر (زیادتی کرنے کی) کوئی گنجائش نہیں رکھی۔)

اور ایک دوسرے مقام پر یہ صراحت بھی فرما دی کہ اگر تمہیں خطرہ ہو کہ دشمن اس صلح سے دغا دے جائے گا تو بھی صلح کی پیشکش قبول کرنا ہی چاہیے۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ﴾ (۸:۶۱'۶۲)

(اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم لوگ بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو بلا شبہ اللہ تعالیٰ سننے جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ یہ چاہیں کہ تمہیں فریب دیں تو اللہ تمہیں کفایت کریگا۔)

یہ آیات اس بات کی واضح شہادت ہیں کہ اسلام دنیا میں تخریب کاری کے لیے نہیں بلکہ اسے مٹانے آیا ہے۔

پھر اگر کسی قوم سے بدعہدی اور خیانت کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ تو کھلے بندوں معاہدہ کو منسوخ قرار دے دینا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ﴾ (۸:۵۸)

(پھر اگر تمہیں کسی قوم سے دغابازی کا خطرہ ہو تو معاہدہ برابری کی بنیاد پر فسخ کر دو۔ اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ دغابازوں کو پسند نہیں کرتا۔)

اس معاہدہ کی تنسیخ کے بعد ہی ان سے جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ پہلے نہیں۔

(۵) سیاسی پناہ یا امان:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ﴾ (۹:۶)

(اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا طلب گار ہو تو اس کو پناہ دو۔ حتی تک کہ اللہ کا کلام (اچھی طرح) سن لے۔ پھر (بھی اسلام نہ لائے تو) اسے امن کی جگہ واپس پہنچا دو۔)

یہ پناہ خواہ میدان جنگ میں دی گئی ہو یا پہلے سے۔ دونوں صورتوں میں اس پناہ کا احترام لازم ہے پناہ کا جائز اختیار خواہ وہ کسی فرد کو دی جائے یا کسی قوم کو امیر یا سپہ سالار کو ہی ہوتا ہے۔ تاہم ایک عام مسلمان، حتّٰی کہ غلام یا عورت بھی اگر پناہ دے دے تو وہ موثر ہوتی ہے۔

(بخاری کتاب الجہاد والسیر۔ باب امان النساء' اور باب ذمة المسلمین و جوارهم واحدة یسعٰی بها اَدنا هم)

اور اسکو نبھانا مسلمانوں کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔ امان دراصل عہد ہی کی ایک قسم ہے۔ عہد وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ امان صرف جان و مال و آبرو کی حفاظت کا عہد

ہے۔ مستامن کے کچھ حقوق و فرائض معین ہوتے ہیں۔ مثلاً جاسوسی اور بغاوت کے سوا کوئی جرم اس کی امان کو ختم نہیں کر سکتا۔ البتہ اس کے جرم کی سزا ملکی قانون کے مطابق دی جائے گی جہاں وہ رہائش پذیر ہے۔

آج کل حکومتیں جو دوسرے ملکوں کے بعض افراد کے لیے visa جاری کرتی ہیں۔ ان کی حقیقت بھی امان ہی سے ملتی جلتی ہے۔ یہ ویزا سسٹم تو دو مسلم ریاستوں میں بھی چلتا ہے۔ جبکہ امان صرف مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ہوتی ہے۔

(۶) اظہار اسلام یا کوئی علامت دیکھنے پر:

اگر حریف مقابلہ پر آ کر زبان سے یا کنایتاً اسلام کا اظہار کر دے۔ تو جنگ سے دستبردار ہو جانا چاہیے:۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ (۴/۹۴)

(اے ایمان والو۔ جب تم اللہ کی راہ میں (جنگ کے لیے) نکل کھڑے ہو تو تحقیق سے کام لیا کرو اور جو شخص تم سے سلام علیکم کرے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔)

اب دور نبوی ﷺ کے درج ذیل واقعات ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا غَزَا قَوْمًا لَمْ يَغْزُ حَتّٰى يُصْبِحَ فَاِنْ سَمِعَ اَذَانًا اَمْسَكَ وَاِنْ لَمْ يَسْمَعْ اَذَانًا اَغَارَ)) (بخاری۔ کتاب الجهاد والسير۔ باب دعاء النبي الى الاسلام والنبوة)

(رسول اللہ ﷺ جب کسی قوم پر جہاد کرتے تو صبح تک حملہ نہ کرتے پھر اگر (صبح کی) اذان سن لیتے تو حملہ کرنے سے رک جاتے اور اگر نہ سنتے تو حملہ آور ہو جاتے۔)

(۲) ابن عصام المزنی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک سریہ پر روانہ کیا اور یہ ہدایت فرمائی کہ:۔

((اِذَا رَاَيْتُمْ مَسْجِدًا وَسَمِعْتُمْ مُؤَذِّنًا فَلَا تَقْتُلُوْا اَحَدًا)) (ابوداود۔ کتاب الجهاد۔ باب في دعاء المشركين)

(جب تم مسجد دیکھ لو یا اذان کی آواز سن لو۔ تو پھر کسی شخص کو قتل نہ کرو۔)

(۳) امام بخاریؒ نے درج ذیل عنوان سے باب قائم کیا ہے۔

((اِذَا قَالُوْا صَبَانَا وَلَمْ يُحْسِنُوْا اَسْلَمْنَا وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ فَجَعَلَ خَالِدٌ يَقْتُلُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْرَءُ اِلَيْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ وَقَالَ عُمَرُ اِذَا قَالَ "مترس" فَقَدْ اٰمَنَهٗ اِنَ اللّٰهَ يَعْلَمُ الْاَلْسِنَةَ كُلَّهَا-)) (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب مذکورہ)

اگر کافر لڑائی کے وقت (گھبرا کر) اچھی طرح یوں نہ کہہ سکیں کہ ہم مسلمان ہوئے بلکہ یوں کہیں کہ دین بدل دیا۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ خالد بن ولیدؓ نے (بنی جذیمہ کی جنگ میں) کافروں کو مارنا شروع کر دیا (حالانکہ وہ کہتے جاتے تھے ہم نے دین بدلا۔ ہم نے دین بدلا) آنحضرت ﷺ نے جب یہ سنا تو فرمایا۔ یا اللہ میں خالد کے کام سے بیزار ہوں اور حضرت عمرؓ نے کہا۔ جب کسی مسلمان نے کلمہ کہا "مترس" (یعنی نہ ڈرو) تو اس کو امان دے چکا (اس کو مارنا درست نہیں) کیونکہ اللہ تو سب زبانیں جانتا ہے۔ "مترس" کے معنی ہیں "نہ ڈرو" یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔

(۴) علامہ طبری اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ نے بعض سرایا صرف دعوت اسلام کے لیے بھیجے تھے لڑنے سے منع کیا گیا تھا اس کے باوجود حضرت خالد بن ولیدؓ نے تلوار سے کام لیا۔ آپ ﷺ نے سُنا تو قبلہ رو کھڑے ہو کر تین بار کہا یا اللہ! میں خالد کے کام سے بری ہوں۔ پھر حضرت علیؓ کو بھیجا۔ جنہوں نے ایک ایک بچے کا یہاں تک کہ کتوں کا خوں بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی۔

(تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۶۵۱)

(۵) حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ:۔

((بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَرِيَّةً اِلَى الْحُرَقَاتِ فَنَذِرُوْا بِهَا فَهَرَبُوْا فَاَدْرَكْنَا رَجُلًا فَلَمَّا غَشِيْنَاهُ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَضَرَبْنَاهُ حَتّٰى قَتَلْنَاهُ، فَذَكَرْتُهٗ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(ہمیں حضور اکرم ﷺ نے حُرقات کی طرف ایک سریہ پر بھیجا...... وہ لوگ ہمیں دیکھ کر اپنا علاقہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ایک شخص کو ہم نے جا لیا۔ تو اس نے کہہ دیا...... لا الہ الا اللہ، ہم نے اُسے تلوار سے مارا یہاں

فَقَالَ: مَنْ لَکَ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیَامۃِ؟" فقلت یا رسول اللہ : انما قالھا مخافۃ السلاح. قال: افلا شققت عن قلبہ حتّٰی تعلم من اجل ذلک قالھا ام لا؟ من لک بلا الٰہ الا اللّٰہ یوم القیٰمۃ" فمازال یَقُوْلُھَا حَتّٰی وَدِدْتُ اَنّی لَمْ اُسْلِمْ اِلَّا یَوْمَئِذٍ)) (ابوداود۔کتاب الجہاد۔باب علی ما یقاتل المشرکون بخاری۔ کتاب المغازی۔باب بعث النبیؐ اسامہ بن زید الی الحرقات)

تک کہ جان سے مار ڈالا۔ پھر میں نے حضور ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن جب وہ اس کلمہ کے ساتھ تم سے جھگڑے گا تو تمہارا کیا حال ہوگا؟" میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اس نے تو ہتھیاروں کے ڈر سے کلمہ کہہ دیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی اسی وجہ سے اس نے کلمہ پڑھا۔ پھر آپ برابر یہی الفاظ دہراتے رہے۔ "قیامت کے دن تمہارا کیا حال ہوگا" یہاں تک کہ میں چاہنے لگا۔ کاش! میں آج کے دن ہی اسلام لایا ہوتا۔)

(۶) حضرت مقداد بن عمر الکندی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:۔

((اَنَّہُ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ علیہ وَسَلَّمَ اَرَاَیْتَ اِنْ لَقِیْتُ رَجُلًا من الْکُفَّارِ فَاقْتَتَلْنَا فَضَرَبَ احدی یَدَیَّ بِالسَّیْفِ فَقَطَعَھَا ثُمَّ لَاذَ مِنِّیْ بِشَجَرَۃٍ فقال اَسْلَمْتُ لِلّٰہِ اَقْتُلُہٗ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ بَعْدَ اَنْ قَالَھَا؟ فَقَالَ رَسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا تَقْتُلْہُ " فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّہٗ قَطَعَ اِحْدٰی یَدَیَّ ثُمَّ قَالَ ذٰلِکَ بَعْدَ مَا قَطَعَھَا؟ فَقَالَ رَسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وَسَلَّمَ: لَا تَقْتُلْہُ)) (بخاری۔کتاب المغازی باب بلا عنوان)

(حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بتلائیے۔ اگر میں ایک کافر سے مقابلہ کروں پھر وہ کافر تلوار سے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اُس کے بعد ایک درخت کی پناہ لے کے مجھ سے کہے میں اللہ کا تابعدار بن گیا۔ (مسلمان ہوگیا) اب میں اسے قتل کردوں جبکہ وہ الفاظ کہہ چکا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں اس کو قتل نہ کر"۔ مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اس نے تو میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا اور ہاتھ کاٹنے کے بعد ایسا کہنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ (کچھ بھی ہو) اس کو قتل نہ کرو"۔)

(۷) حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کسی شخص کے متعلق حضور اکرم ﷺ سے سوال کرتے ہیں:۔

((قَالَ خَالِدُ بن الولید یا رسول اللہ اَلَا

(خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ میں اس

اَضْرِبُ عُنُقَهُ قَالَ لَا: لَعَلَّهُ اَنْ يَكُوْنَ يُصَلِّيْ؟ فَقَالَ خَالِدٌ وَكَمْ مِنْ مُصَلٍّ يَقُوْلُ بِلِسَانِهِ مَالَيْسَ فِيْ قَلْبِهِ. قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنِّيْ لَمْ اُوْمَرْ اَنْ اَنْقُبَ قُلُوْبَ النَّاسِ وَلَا اَشُقَّ بُطُوْنَهُمْ")) (بخاری۔ کتاب المغازی)

کی گردن اڑادوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "نہیں شاید نماز پڑھتا ہو۔ خالد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ بہت سے نمازی ایسے ہیں۔ جو زبان سے کچھ کہتے ہیں اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ کو یہ حکم نہیں ملا کہ میں لوگوں کے دل کی بات کھود کر نکالوں یا ان کے پیٹ چیروں"۔)

ان سب احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(۱) کوئی کافر اگر محض جان بچانے کی خاطر یا دھوکہ سے ہی اپنے اسلام کا کسی طرح اظہار کردے تو اس سے فوراً ہاتھ روک لینا چاہیے۔

(۲) اسلام نے نہ تو انتقامی کاروائی کو جائز قرار دیا ہے اور نہ ہی لوٹ مار اور ذاتی مفادات کو بلکہ ان کے مقابلہ میں کسی شخص کا ایمان لانا خواہ وہ کیسا ہو۔ اسے سب سے زیادہ عزیز ہے۔

(۳) جنگ سے قبل

(۱) لوٹ مار اور تباہ کاری کی ممانعت:

ایک مدت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جہاں کہیں فوج ڈیرے ڈالتی تو چاروں طرف پھیل جاتی۔ راستے بند ہوجاتے۔ اور راہگیروں کا مال ومتاع لٹ جاتا۔ کسی لڑائی کے دوران اسلامی فوج سے بھی ایسی حرکات سرزد ہوئیں تو آپ ﷺ نے منادی کرادی کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا جہاد ہی نہیں۔ چنانچہ معاذ بن انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:۔

((غَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَزْوَةَ كَذَا وَكَذَا فَضَيَّقَ النَّاسُ الْمَنَازِلَ وَقَطَعُوا الطَّرِيْقَ فَبَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلم مُنَادِيًا يُنَادِيْ فِي النَّاسِ اَنْ مَنْ ضَيَّقَ مَنْزِلًا وَقَطَعَ طَرِيْقًا

(میں فلاں غزوہ میں آپ ﷺ کے ساتھ تھا، لوگوں نے دوسرے کی منازل کو تنگ کردیا اور راہگیروں کو لوٹنا شروع کردیا۔ آپ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹ مار

فَلا جِهَادَ لَهُ۔)) (ابوداود۔ کتاب الجهاد۔ باب مایؤمر من انضمام العسکر) کرے تو اس کا جہاد قبول نہیں۔)

(۲) دشمن پر جنگ کی شرائط پیش کرنا:

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کا یہ دستور تھا کہ لڑائی شروع کرنے سے پیشتر تین باتیں دشمن کی پیش کی جاتی تھیں اور اسے اختیار دیا جاتا تھا کہ ان میں سے جونسی شرط چاہے قبول کر لے۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) دشمن کو بذریعہ سفارت پیغام بھیجا جاتا تھا کہ وہ اسلام لے آئیں۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جس طرح مسلمان دنیا سے فتنہ وفساد کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اگر وہ اسلام لے آتے اور مسلمانوں کے مشن میں ان کے ممد و مددگار ثابت ہوتے تو ان کو مسلمانوں جیسے جملہ حقوق مل جاتے تھے۔ اور ان کا ملک، علاقہ انہی کے پاس رہنے دیا جاتا تھا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہوتی تھی کہ اگر وہ اسلام لانا گوارا نہیں کرتے تو مسلمانوں کے مشن میں کم از کم رکاوٹ نہ بنیں۔ اندریں صورت انہیں اپنے مذہبی حکام بجالانے اور اپنی شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کی مکمل آزادی ہوتی تھی۔ البتہ سیاسی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ آ جاتا تھا پھر انہیں اسلام یا پیغمبر اسلام کے خلاف زہر اگلنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اور اس قوم کی دفاعی ذمہ داریاں مسلمانوں پر آ پڑتی تھیں۔ جس کے عوض انہیں معمولی ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ جسے شرعی زبان میں جزیہ کہتے ہیں:۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ۔﴾ (۲۹/۹)

(جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ زیردست ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کریں۔)

ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نہ تو کسی قوم کا دشمن ہے، نہ نسل کا اور نہ علاقہ یا ملک کا۔ اسے ان امور میں سے کسی سے بھی دلچسپی نہیں۔ اسے غرض ہے تو صرف دنیا سے فتنہ وفساد مٹانے سے اور اللہ تعالیٰ کا بول بالا کرنے سے یہ مقصد اگر بلا جنگ حاصل ہو جائے تو اسے جنگ کسی قیمت پر گوارہ نہیں۔

دستور تھا کہ اسلامی فوج کا سپہ سالار ارسال دعوت کے بعد تین دن تک انتظار کرتا۔ اگر اس مدت انتظار میں دشمن گفت وشنید پر آمادہ ہوتا تو اس کا انتظام کیا جاتا۔ گفت وشنید کا اکثر نتیجہ یہ نکلتا کہ لڑائی رُک جاتی۔ مثلاً شام وعراق میں مخالفوں نے چند شہر مسلمانوں کے حوالے کر کے صلح کر لی۔ لیکن بعض اوقات اختلاف فکر ورائے باقی رہتا تو اس صورت میں جنگ چھڑ جاتی۔ جنگ قادسیہ کے موقع پر رستم کی انتہائی کوشش تھی کہ لڑائی کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر دی جائے۔ لیکن مسلمانوں کے نمائندہ مغیرہ بن شعبہؓ نے یہی تین شرائط پیش کیں اور ان میں کچھ بھی کمی بیشی نہ کی پہلی دونوں باتوں کو رستم اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ لہذا چاہتا تھا کہ مسلمان ویسے ہی کچھ مال و دولت لے کر واپس چلے جائیں۔ جب مسلمانوں نے انہی شرائط پر اصرار کیا تو مایوس ہو کر کہنے لگا۔ ''میرے اور مسلمانوں کے درمیان صلح کا کوئی امکان نہیں رہا''۔ چنانچہ قادسیہ کی جنگ ہو کر رہی جس میں رستم کو اور ایرانیوں کو فیصلہ کن شکست نصیب ہوئی۔

اسلام کی اصل غرض یہ ہے کہ لوگ علیٰ وجہ البصیرت اور برضا ورغبت اسلام قبول کر کے فتنہ وفساد سے رُک جائیں اور احکام الٰہی کے تحت امن وعافیت کی زندگی بسر کریں۔ جہاد سے درحقیقت یہی غرض ہوتی ہے۔ اسلام کو نہ جزیہ سے رغبت ہے، نہ اموال غنیمت سے یہ تو دوسری اور تیسری قسم کی چیزیں ہیں۔ جنگ خیبر اور دور نبوی میں پہلا غزوہ تھا جب آپ ﷺ نے کوئی علاقہ فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کیا۔ اس موقعہ پر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عنایت فرمایا تو انہوں نے عرض کی۔ ''کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں؟ ارشاد ہوا کہ نرمی سے ان پر اسلام قبول کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمہاری تبلیغ سے اسلام لے آئے تو تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے''۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوہ خیبر)

(۳) اور اگر وہ جزیہ ادا کرنے پر، جو ان کی زیردستی کی علامت کے طور پر ان سے وصول کیا جاتا ہے، بھی رضامند نہ ہوں یا بالفاظ دیگر فتنہ وفساد کرنے پر مصر ہوں یا اسے روکنے کی

کوششوں میں رکاوٹ بنے رہیں تو پھر ان سے جنگ کی جائے جیسے کہ آیت بالا سے ثابت ہے۔ اور جنگ کسی مخصوص علاقہ یا قوم سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فتنہ کو ختم کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بموجب ارشاد باری تعالیٰ:۔

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔﴾ (۱۱۳/۲) (اور ان سے اس وقت تک جنگ کرو کہ فتنہ باقی نہ رہے۔)

(۴) معرکہ کارزار میں

(۱) شبخون کی ممانعت:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وَسَلَّمَ اَتٰی خَیْبَرَ لَیْلًا وَکَانَ اِذَا اَتٰی قَوْمًا بِلَیْلٍ لَمْ یُغْزِیْهِمْ حَتّٰی یصبح)) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوہ خیبر) (آنحضرت ﷺ خیبر میں رات کو پہنچے اور آپ ﷺ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب تک صبح نہ ہوتی ان پر حملہ نہ کرتے۔)

لیکن اگر جنگ گوریلا قسم کی ہو اور یہ خطرہ ہو کہ حملہ کے وقت دشمن سامنے آنے کے بجائے اپنی کمین گاہوں میں گھس جائے گا۔ اور بعد میں فوج کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر ان پر حملہ آور ہوگا۔ تو اس صورت میں بے خبری میں بھی حملہ کرنے کی اجازت ہے۔ جیسے غزوہ بنولحیان اور ذات الرقاع میں بدوؤں نے اسلامی دستے دیکھ کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر پناہ لے لی تھی۔ چنانچہ سریہ علی بن ابی طالب (۶ھ) میں اسلامی دستہ کے ۱۰۰ آدمی تھے جو رات کو سفر کرتے اور دن کو چھپ جاتے۔ اس طرح انہوں نے بنو سعد کو جا لیا۔ پھر بھی وہ مستورات کو لے کر فرار ہو گئے تھے البتہ کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اور سریہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (۷ھ) میں بھی یہی کچھ ہوا اور ہوازن کے لوگ فرار ہو گئے۔

(۲) دشمن سے مڈبھیڑ کی آرزو نہ کرنی چاہیے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

((لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ فَإِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا)) (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب کان النبی اذالم یقاتل اول النہار)

(دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کی آرزو مت کرو۔ اور جب ہو جائے تو پھر ثابت قدم رہو۔)

عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

((یاایہاالناس لا تتمنوا لِقَاءَ الْعَدُوِّ واسئلوا اللّٰہ العافِیَةَ فَإِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ)) (ابوداود۔ کتاب الجہاد فی کراھیة تمنی لقاء العدو بخاری حوالہ ایضا)

(اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی آرزو نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو۔ پھر اگر کبھی مڈ بھیڑ ہو جائے تو صبر واستقلال سے کام لو۔ اور خوب جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔)

پھر اگر دشمن سے مقابلہ کرنا پڑے تو پورے صبر وثبات اور استقلال سے یہ فریضہ سرانجام دینا چاہیے۔

(۳) اسلحہ بیکار ضائع نہ کیا جائے:

حضرت ابواُسید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

((قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ بَدْرٍ إِذَا أَكْثَبُوْكُمْ فَارْمُوْهُمْ وَاسْتَبْقُوْا نَبْلَكُمْ)) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوہ بدر)

(رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن ہم سے فرمایا۔ جب کافر تمہاری زد پر آجائیں اس وقت تیر چلاؤ۔ اور اپنے تیروں کو بچائے رکھو۔)

اسلحہ کا محتاط استعمال اور اس سے حتی الوسع بھرپور استفادہ کرنا اقتصاد یا کفایت شعاری میں داخل ہے جو اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔

(۴) امیر اور بنیادی حقوق کا احترام:

اسلام میں امیر کی اطاعت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور میدان جنگ میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مگر اسلام نے اطاعت کے بارے میں ایک عام اصول بیان فرما دیا ہے کہ:۔

﴿لا طَاعَةَ فِيْ مَعْصِيَةٍ إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ﴾ (متفق علیہ)

(خدا کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف بھلائی کے کاموں میں ہے۔)

اس مضمون کی دوسری حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:۔

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعصِیَةِ الْخَالِقِ)) (شرح السنة)

(خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔)

مثلاً اگر خاوند بیوی کو نماز سے یا فریضۂ حج ادا کرنے سے یا پردہ کرنے سے روکے تو بیوی پر خاوند کی اطاعت واجب نہیں۔ اسی طرح اگر حاکم رعایا کو یا سپہ سالار فوج کو یا آقا غلام کو کسی کام کے کرنے کو کہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو تو اس صورت میں اطاعت جائز نہ ہوگی۔

میدان جنگ میں بھی یہ اصول برقرار رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی حقوق میدانِ جنگ میں بھی برقرار رہتے ہیں۔ آج کل اکثر حکومتیں ہنگامی حالات کا سہارا لے کر عوام الناس کے بنیادی حقوق کو تا اطلاع ثانی معطل کر دیتی ہیں۔ یہ بات از روئے اسلام جائز نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:۔

((بَعَثَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وَسَلَّمَ سَرِیَّةً فَاسْتَعْمَلَ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ وَاَمَرَهُمْ اَنْ یُطِیعُوهُ. فَغَضِبَ وَقَالَ: اَلَیْسَ اَمَرَكُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُطِیعُونِی؟ قَالُوا بَلٰی، قَالَ فَاجْمَعُوا حَطَبًا فَجَمَعُوا فَقَالَ: اَوْقِدُوا نَارًا فَاَوْقَدُوْ. فَقَالَ ادْخُلُوهَا فَهَمُّوا وَجَعَلَ بَعْضُهُمْ یُمْسِكُ بَعْضًا وَیَقُولُونَ فَرَرْنَا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ النَّارِ فَمَا زَالُوا حَتّٰی خَمِدَتِ النَّارُ فَسَكَنَ غَضَبُهُ فَبَلَغَ النَّبِیَّ صَلَّی اللہ علیہ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "لَوْ دَخَلُوهَا مَا خَرَجُوا

(آنحضرت ﷺ نے ایک دستہ بھیجا اور ایک انصاری (عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سہمی) کو امیر لشکر بنایا۔ اور لوگوں کو حکم دیا کہ امیر کی اطاعت کریں۔ یہ امیر کسی بات پر مشتعل ہو گیا اور ساتھیوں سے کہنے لگا۔ "کیا حضور ﷺ نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا؟"۔ لوگ کہنے لگے کیوں نہیں"۔ امیر نے کہا۔ "اچھا لکڑیاں جمع کرو"۔ انہوں نے اکٹھی کیں تو کہنے لگا: آگ روشن کرو"۔ انہوں نے آگ بھڑکا دی تو کہنے لگا۔ "اب اس میں داخل ہو جاؤ"۔ لوگوں نے قصد کیا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے" آگ (عذاب قیامت) سے بچنے کے لیے ہی تو ہم حضور

مِنْهَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ الطَّاعَۃُ فِی الْمَعْرُوْفِ"۔)) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب سریہ عبداللہ بن حذافہ سہمی)

اکرم ﷺ کی طرف بھاگ آئے (تو اب اس میں کیوں داخل ہوں) اسی بحث تمحیص میں آگ بجھ گئی اور اتنے میں امیر کا غصہ فرو ہو گیا۔ جب یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا:۔ "اگر تم آگ میں داخل ہو جاتے تو قیامت تک اس سے نہ نکلتے۔ (یاد رکھو) اطاعت صرف ان باتوں میں ہے جو خلاف شریعت نہ ہوں۔)

اس حدیث سے مندرجہ ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:۔

(۱) شریعت کے خلاف حکم دینے والا خواہ بادشاہ ہو یا امیر لشکر، مولوی ہو یا امیر لشکر، مولوی ہو یا پیر، ولی ہو یا قطب، خاوند ہو یا آقا والد ہو یا والدہ کسی کی اطاعت نہ کرنی چاہیے۔

(۲) جو خلاف شریعت کاموں میں اطاعت کرے گا۔ وہ خود بھی گناہ گار ہوگا۔ اگر یہ فوجی دستہ حکم مان لیتا۔ تو ایک اسے غیر معروف میں اطاعت کی سزا ملتی دوسرے خودکشی کی۔

(۳) بادشاہ یا امیر لشکر کو بنیادی حقوق جو شریعت کے مقرر کر دیئے ہیں انہیں پامال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ خواہ حالات کتنے ہی ہنگامی ہوں رعایا کی جان کی حفاظت امیر کی ذمہ داری ہے اور رعایا کا حق ہے۔ حق کے بغیر بادشاہ بھی نہ کسی کی جان لے سکتا ہے۔ نہ دوسرے بنیادی حقوق معطل کر سکتا ہے۔

(۵) امیر کی اطاعت:

یہ ایک پہلو چھوڑ کر باقی ہر طرح کے معاملات میں امیر کی اطاعت لازم ہے۔ خواہ اس کے حکم کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور خواہ یہ حکم بظاہر صریح زیادتی معلوم ہو رہا ہو۔ اور میدان جنگ میں تو اس اطاعت کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ میدان جنگ میں امیر سے تنازعہ کا واضح مطلب خود شکست کو دعوت دینا ہے۔ جنگ احد میں یہی کچھ ہوا۔ پہاڑی درہ پر رسول اللہ ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کیا۔ ان کا امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ انہیں حکم یہ تھا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں یہ دستہ اسی جگہ پر ڈیوٹی دیتا رہے گا۔ پھر جب مسلمانوں کو فتح کے آثار نظر آگئے اور وہ غنیمت کا مال سمیٹنے لگے۔ تو اس دستہ میں اختلاف پیدا

ہوا۔ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ اب مقصد حاصل ہو چکا لہٰذا اب یہاں ڈیوٹی دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب مال غنیمت کے اکٹھا کرنے کے لیے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل جانا چاہیے۔ دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے حالات کچھ بھی ہوں یہاں سے نہیں ٹلنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی فیصلہ تھا کہ یہاں سے ہٹنا نہیں چاہیے۔ چنانچہ اس تنازعہ میں صرف بارہ اصحاب امیر کا حکم مان کر وہیں رہے اور باقی ۳۸ درّہ کو چھوڑ کر غنیمت لوٹنے میں مشغول ہو گئے۔ درّہ خالی دیکھ کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (جو اس وقت کفار کی طرف سے لڑ رہے تھے) نے اس طرف سے بھر پور حملہ کیا اور مسلمانوں کی حاصل شدہ فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔

اس موقعہ پر درّہ چھوڑنے والے مسلمانوں نے دو غلطیاں کی تھیں۔ ایک تو اپنے غلط اجتہاد کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے سرتابی کی حالانکہ حکم کے بعد اجتہاد کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ دوسرے امیر لشکر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تنازعہ بھی کیا اور ان کے حکم سے سرتابی بھی کی۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (۳:۱۵۲)

(اللہ تعالیٰ نے تو اپنا وعدہ (فتح) تم سے پورا کر ہی دیا جبکہ تم دشمن کو اس کے حکم سے تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم نے نامردی دکھلائی (یعنی درّہ چھوڑ دیا) اور معاملہ میں تنازعہ پیدا کر دیا اور (امیر لشکر اور حضور ﷺ) کی نافرمانی کی جب تم نے وہ چیز دیکھی جس کو تم چاہتے تھے (یعنی مال غنیمت)

(۶) عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے قتل کی ممانعت:

دشمن کے لشکر میں اگر عورتیں یا بچے اور بوڑھے شامل ہوں اور معرکہ کارزار میں موجود ہوں تو بھی مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ ان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ ارشاد نبوی ہے:۔

(۱) ((لَا تَقْتُلُوْا امْرَاَةً وَلَا صَغِيْرًا وَلَا شَيْخًا فَانِيًا۔)) (کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرو۔)

(مشکوٰۃ۔ کتاب الجہاد۔ باب القتال فی الجہاد)

(۲) اور حضرت عبداللہ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

((وُجِدَتْ امْرَأَةٌ مَقْتُولَةً فِي بَعْضِ مَغَازِي رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ))

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب قتل النساء فی الحرب)

(رسول اللہ ﷺ کے غزوہ میں ایک دفعہ میدان جنگ میں ایک مقتولہ عورت کو پایا گیا تو آپ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کے قتل کرنے سے منع فرمادیا۔'')

(۳) آپ ﷺ نے ایک دفعہ میدان جنگ میں عورت کی ایک لاش پڑی دیکھی تو ناراض ہوکر فرمایا۔

(مَاكَانَتْ هٰذِهِ تُقَاتِلُ فِيمَنْ يُقَاتِلُ -)

(ابن ماجہ۔ کتاب الجہادؐ۔ باب الغارۃ والبیات و قتل النساء والصبیان)

(کس نے قتل کیا۔ یہ تو لڑنے والوں میں شامل نہ تھی۔)

اس حدیث سے صرف یہی معلوم ہوتا کہ میدانِ جنگ میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانا ممنوع ہے۔ بلکہ اس حدیث سے مقاتل اور غیر مقاتل لوگوں کے حقوق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

جنگ احد میں قریش مکہ کے سپہ سالار ابو سفیان کی بیوی ہندہ اور دیگر ۱۴ عورتیں بھی ساتھ آئی تھیں۔ ان کا اصل کام یہ تھا کہ وہ بھاگنے والوں کو عار دلائیں تا کہ پورا لشکر جم کر لڑے اور فتح حاصل ہو۔ یہ عورتیں جنگ شروع ہونے سے پیشتر جلوس کی شکل میں دف بجاتی ہوئی سامنے آئیں۔ یہ بدر کے مقتولین کے مرثیے پڑھ پڑھ کر کفار کے جوش انتقام کو بھڑ کا رہی تھیں۔ پھر بھی نسلی فخر و مباہات اور رجز کے اشعار پڑھنے کی خدمات بھی انجام دے رہی تھیں۔

جنگ شروع ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلوار بلند کر کے فرمایا۔ ''کون ہے جو آج اس تلوار کا حق ادا کرے گا؟'' سب صحابہ ؓ اس سعادت کے آرزومند تھے اور دیکھ رہے تھے کہ انتخاب نگاہ کس پر پڑتی ہے۔ آپ ﷺ نے وہ تلوار حضرت ابو دجانہ ؓ کو عطا کی۔ آپ ؓ پہلوانوں کی طرح بڑی ناز و ادا سے اکڑتے ہوئے بڑھے انہیں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ چال عام حالات میں پسند نہیں مگر آج بہت پسند ہے۔ صفوں کو زیر و زبر کرتے کشتوں کے پشتے لگاتے چلے جا رہے کہ ابوسفیان کی بیوی ہند جو عورتوں کی سالار تھی سامنے آگئی آپ کی تلوار اس کے سر تک پہنچ چکی تھی کہ آپ ﷺ کا فرمان یاد آ گیا آپ نے فوراً تلوار روک لی اور

فرمایا۔ ''رسول اللہ ﷺ کی تلوار کے شایانِ شان نہیں کہ ایک عورت کے خون سے رنگین ہو''۔

(طبری۔ ج ا۔ غزوۂ احد)

(۷) مقاتل اور غیر مقاتل:

مقاتل ہر وہ شخص ہے۔ جو عملاً جنگ میں حصہ لے رہا ہو یا کم از کم عرفاً جنگ میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسے اشخاص سے قتال جائز ہے۔ اور ہر وہ شخص جو عرفاً جنگ کے قابل نہ ہو یا مزاجاً جنگ میں حصہ لینے کا مزاج نہ رکھتا ہو وہ غیر مقاتل ہے۔ اور اس کا قتل جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں مندرجہ ذیل اشخاص کو غیر مقاتل قرار دیا ہے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں۔ درویش اور صوفی قسم کے لوگ، معبدوں سے تعلق رکھنے والے، اندھے، لنگڑے لولے اور دوسری قسم کے معذور لوگ۔ بعد میں خلفائے اسلام نے غیر مقاتل میں کاشتکاروں اور تاجروں کو بھی شامل کر دیا تھا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا مزاج طبعاً جنگ سے لگا نہیں کھاتا۔

(۸) جنگ کے دوران ہر وقت مسلح رہنا چاہیے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عليكم مَيْلَةً وَّاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾ (۴:۱۰۱)

(کافر لوگ تو بہت چاہتے ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تاکہ وہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں ہاں اگر تم بارش کی تکلیف یا بیماری کی وجہ سے ہتھیار اتار دو تو تم پر گناہ نہیں۔ مگر ہوشیار رہنا ضروری ہے۔)

آیت مذکورہ میں ہتھیار اتارنے کی صرف دو صورتوں میں اجازت ہے۔ بارش ہو رہی ہو۔ کپڑے اور ہتھیار وغیرہ بھیگ رہے ہوں یا کوئی شخص بیماری کی وجہ سے ہتھیار بند رہنے کا متحمل نہ ہو۔ اس کے علاوہ ہتھیار اتارنے کی اجازت نہیں۔ اسی لیے آخر میں تاکیداً پھر فرما دیا وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اور وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ کے الفاظ بڑے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے معنی ہوشیار اور چوکنا رہنا مسلح رہنا اور اپنے بچاؤ کے تمام ذرائع اختیار کرنا ہے۔ مورچوں کی

حفاظت کرنا اور ان میں پناہ پکڑنا، لڑائی سے پیشتر سامانِ جنگ تیار رکھنا، دشمن کے نقل و حرکت سے باخبر رہنا اس کا مداوا سوچنا، دشمن کی بے خبری میں حملہ کے لیے تیار رہنا سب کچھ خُذُوْا حِذْرَكُمْ کے مفہوم میں سما جاتا ہے:۔

دورِ نبوی میں اسلحہ جنگ ہر سپاہی کی انفرادی ملکیت ہوتا تھا۔ لیکن آج اسلحہ جنگ مہیا کرنا حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا اسلحہ جنگ تیار کرنے والے کارخانوں سٹوروں کا تحفظ اور بچاؤ بھی خُذُوْا حِذْرَكُمْ میں آتا ہے۔ غرض قوم وملک کا تحفظ افرادِ فوج کے تحفظ کی تدابیر، آلات جنگ کا تحفظ، لڑائی کے منصوبوں کو راز میں رکھنا۔ سب کچھ اس حکم میں داخل ہے۔ آج دشمن سب سے پہلے اسلحہ کے محفوظ ذخائر کو اچانک حملے کے ذریعہ تباہ کر دیتا ہے۔ ان سب امور کی طرف اس آیت میں مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے۔

(۹) میدان جنگ سے فرار گناہ عظیم ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ (۸:۱۵،۱۶)

(اے ایمان والو! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا۔ اور جو شخص جنگ کے روز، سوائے اس کے کہ پینترا بدل کر لڑنا چاہتا ہو یا اپنی فوج سے جا ملنا چاہتا ہو، دشمن سے پیٹھ پھیرے گا تو سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہو گیا۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔)

وجہ یہ ہے کہ اسلام میں بھاگنے، ہتھیار ڈالنے اور شکست کھانے کا کوئی تصور نہیں۔ مسلمان کے لیے بس دو ہی راستے ہیں یا تو فتح یاب ہو کر واپس لوٹے اور غازی کہلائے۔ یا پھر شہید ہو کر شہادت کا بلند مقام حاصل کرے۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾ (۴/۷۴)

(اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرے، پھر مارا جائے یا غالب آجائے۔ تو دونوں صورتوں میں ہم اس کو بہت بڑا اجر دیں گے۔))

جنگ سے فرار کی کوئی شکل اللہ نے نہیں بتائی البتہ اس کا گناہ بہت بڑا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ سے فرار انفرادی جرم نہیں جب ایک شخص راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ تو اس کے ساتھیوں کے دلوں میں بھی خوف کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح دو چار آدمیوں کے بھاگ کھڑا ہونے سے پوری ٹولی کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ اس طرح صف یعنی محاذ میں شگاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور دشمن اس شگاف سے داخل ہو کر پورے لشکر کو گھیرے میں لے سکتا ہے۔ اسی لیے محاذ سے بھاگنے والوں کو دنیا کی ہر فوج میں گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔

فرار ہونے والا سپاہی اپنی ہی موت کا سبب نہیں ہوتا بلکہ پوری قوم کے تحفظ و بقا پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ ماؤں بہنوں، بیٹیوں کی عصمت کے نگہبان ہاتھ جب دشمن کی ہتھکڑیاں پہن لیں یا بھاگتے ہوئے مارے جائیں تو پھر قوم کی ماؤں بہنوں کی عصمت بھی پناہ سے عاری ہو جاتی ہے۔

(۱۰) معرکہ کارزار میں نماز کی ادائیگی:

﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ﴾ (۴:۱۰۲)

(اور اے پیغمبر ﷺ! جب تم ان مجاہدین کے لشکر میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ مسلح ہو کر کھڑی رہے۔ جب وہ سجدہ ادا کر چکیں تو پرے ہو جائیں۔ پھر دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی، ان کی جگہ آجائے اور ہوشیار اور مسلح ہو کر تمہارے ساتھ نماز ادا کرے۔)

جنگ کے دوران نماز صرف دو رکعت ہوتی ہے۔ (یعنی قصر اس کی ادائیگی کی صورت):

(۱) آدھی فوج امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ کر مقابلے کو چلی جائے۔ مگر ہتھیار نہ اتارے۔

(۲) بقایا آدھی فوج امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ لے۔

(۳) اب امام کی دو رکعت پوری ہو گئیں۔ اور فوج کی ایک ایک بقایا ایک رکعت وہ خود اکیلے اکیلے حسب موقعہ پڑھ لیں۔

(۴) شام کی نماز ۳ رکعت ہی رہے گی۔ پہلی فوج دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے گی اور دوسری ایک رکعت۔ بقایا اکیلے پڑھ لیں۔

(۵) اگر جماعت کی فرصت نہ ملے۔ تو اکیلے پڑھنے کی بھی اجازت ہے۔ سواری سے اترنے کا موقع نہ ملے تو سواری پر ہی اشارہ سے پڑھ لی جائے۔

دور حاضر میں فوج کے مختلف شعبوں میں نماز اور قصر کے احکام مختلف ہوں گے۔ مثلاً ایک ہوائی جہاز کا پائلٹ محض اشاروں سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ جب کہ اس جہاز میں سوار دوسرے فوجی اپنی جگہ پر بیٹھے ارکان نماز بھی ادا کر سکتے ہیں۔ اور ٹینک کے اندر بیٹھنے والے غالباً نماز با جماعت بھی ادا کر سکتے ہیں۔ غرض موقع ومحل کی مناسبت سے نماز کی جو صورت بھی عملی طور پر ممکن ہو اسے ہی اختیار کرنا چاہیے لیکن کسی صورت میں بھی نماز کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۱) کھیتوں' باغات اور درختوں کی تباہ کاری کی ممانعت:

بعض دفعہ دشمن کسی جنگی تدبیر یا فوجی مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض دہشت پھیلانے کے لیے وسائل خوراک کو تباہ و برباد اور شہری املاک کا نقصان کر دیتا ہے۔ مکانات کو منہدم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس بے جا ضیاع اموال سے آپ ﷺ نے منع فرما دیا۔

اب ہم رسول اللہ ﷺ کی وہ ہدایات درج کرتے ہیں۔ جو آپ نے موتہ کی طرف لشکر روانہ کرتے وقت ارشاد فرمائیں۔ یہ دراصل میدان جنگ سے تعلق رکھنے والے جملہ احکام کا خلاصہ ہے۔ آپ ﷺ نے فوج کو وداع کرتے ہوئے فرمایا۔ "پہلے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا۔ اگر قبول کر لیں تو لڑنے کی ضرورت نہیں"۔ پھر حسب ذیل احکام دیئے:۔

((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَلِمَنْ مَعَكُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا اُغْزُوْا بِسْمِ اللّٰهِ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ، لَا تَغْدِرُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا وَلَا امْرَاَةً، وَلَا كَبِيْرًا فَانِيًا وَلَا مُنْعَزِلًا بِصَوْمَعَةٍ وَلَا تَقْرَبُوْا نَخْلًا وَلَا تَقْطَعُوْا شَجَرًا وَلَا تَهْدِمُوْا بِنَاءً۔))

(میں تمہیں وصیت کرتا ہوں (۱) اپنے اللہ کے ساتھ پرہیز گاری کی (۲) مسلمانوں کے ساتھ نیکی کرنے کی (۳) جو اللہ سے کفر کرے اس سے اللہ کے نام سے فی سبیل اللہ جہاد کی (۴) وعدہ شکنی نہ کرنا (۵) بچے' عورت' بوڑھے کھوسٹ اور گوشہ نشینوں کو قتل نہ کرنا (۶) درخت نہ کاٹنا اور نہ باغ کے

نزدیک جانا اور عمارتوں کو نہ ڈھانا۔)

مگر جب یہ چیزیں کسی فوجی ضرورت میں رکاوٹ بن رہی ہوں۔ تو ان کو دُور کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ بنونضیر کے محاصرہ کے وقت مسلمانوں کو یہود کی چند کھجوروں کا کاٹنا پڑا تھا۔ مسلمان اس سلسلہ میں متردد تھے کہ آیت نازل ہوئی۔

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۵/۵۹) (مسلمانو! کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کی جڑوں پر قائم رکھے تو یہ اللہ کے حکم سے تھا۔)

اور مفسرین نے یہ بھی تصریح کی ہے۔ کہ لینہ کھجور نکمی قسم کی کھجور تھی۔ جس کے درخت کاٹے گئے تھے۔ اچھی قسم مثلاً عجوہ اور برنی کے درختوں کو کاٹنے سے احتراز کیا گیا تھا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۲۶۶)

(۱۲) صبر وثبات اور ذکر الٰہی:

اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ مسلمان مادی مسائل سے بھرپور استفادہ کرنے کے بعد بھی اس کا انجام اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے میدان جنگ میں ثابت قدمی' الٰہی نصرت کا طلب گار رہتا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۴۵/۸) (مسلمانو! جب تمہاری کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہوجائے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔)

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ مومنوں کی صفت یہ بیان فرماتے ہیں:۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً -﴾ (۱۲۳/۹) (اے ایمان والو! اپنے نزدیک والے کافروں سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی محسوس کریں۔)

گویا کفار سے جنگ کے وقت صبر وثبات کے یہ معنی ہیں کہ ان پر تابڑ توڑ حملے کیے جائیں۔ وہ مسلمانوں میں کسی قسم کی کمزوری محسوس نہ کریں۔ اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہنی چاہیے جب تک کہ فتح حاصل نہ ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے میدان جنگ میں خطبہ جو دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

﴿یاایھاالناس لا تتمنوا لقاء العدو واسئلوا اللہ العافیۃ فاذا لقیتموھم فاصبروا واعلموا ان الجنۃ تحت ظلال السیوف قال: اللھم منزل الکتب ومجری السحاب وھازم الاحزاب اھزمھم وانصرنا علیھم﴾

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر - باب کان النبیؐ اذا الم یقاتل اول النہار)

(اے لوگو! (۱) دشمن سے بھڑنے کی آرزو نہ کرو۔ (صلح پسند رہو)۔ (۲) اللہ تعالیٰ سے سلامتی مانگو۔ (۳) اور جب لڑائی آن پڑے تو صبر کیے رہو۔ اور یاد رکھو کہ بہشت تلواروں کے سایہ تلے ہے۔ پھر یوں دعا کی: ''اے اللہ قرآن نازل کرنے والے! بادل کو چلانے والے! فوجوں کو شکست دینے والے ان کافروں کو شکست دے اور ہم کو ان پر فتح دے۔)

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے باب ہذا زیر عنوان مسلمان اور شکست)

(۱۳) پابندیٔ عہد:

اسلام میں عہد کی پاسداری اتنی ہی اہم ہے۔ کہ عین میدان جنگ میں بھی اس کا پورا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے خواہ اس سے کتنا ہی نقصان ہو رہا ہو۔

جنگ سے پیشتر دو صحابی ابو حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ابو حُسیل رضی اللہ عنہ مکہ سے مدینہ جا رہے تھے۔ راستہ میں کفار نے روک لیا پھر جب ان دونوں نے شریک جنگ نہ ہونے کا عہد کیا تب جا کر ان کی جان چھوٹی۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کے پاس سامان اسلحہ اور افرادی قوت ہر چیز کی شدید کمی تھی یہ دونوں صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت چاہی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''وعدے کا پورا کرنا ہر حال میں مقدم ہے۔ ہم صرف اللہ تعالیٰ کی مدد چاہتے ہیں۔ (مسلم۔ کتاب۔ الجہاد والسیر - باب الوفاء بالعہد)

(۱۴) میدان جنگ اور رجزیہ اشعار:

رجزیہ اشعار کا مقصد فوج کو جوش دلانا ہوتا ہے۔ جنگ حنین میں مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑنے لگے تو آپ بلند آواز سے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ   اَنَا ابْنُ عَبْدُ الْمُطَّلِبْ

(میں سچا نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں)

اسی طرح جنگ خندق کے دوران مٹی ڈھو رہے تھے تو ترنم سے درج ذیل اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَوْلَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا
وَلَا تَصَدَّقْ وَلَا صَلَّیْنَا
وَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا
وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَّاقَیْنَا
اِنَّ الْاُولٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا
اِذَا اَرَادُوْ فِتْنَۃً اَبَیْنَا

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب حفر الخندق)

ترجمہ: (اے اللہ! اگر تو ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہمیں کیسے مل سکتی تھی اور ہم کیونکر نمازیں ادا کرتے اور زکوۃ دے سکتے تھے۔ تو ہی ہم پر تسلی اور اطمینان نازل فرما۔ اور اگر دشمن سے مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ دشمن ہم پر بلا وجہ چڑھ آیا ہے۔ جب بھی انہوں نے فتنہ (جنگ) کا ارادہ کیا ہم انکار ہی کرتے رہے۔)

آپ ﷺ آخری مصرعہ پر زور دے کر پڑھتے اور دوبارہ سہ بارہ پڑھتے تھے۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کے پاس رجزیہ اشعار کا نعم البدل بھی موجود ہے۔ اور وہ ہے نعرہ تکبیر اور یہ بات تجربہ میں آچکی ہے کہ مسلمانوں کے بلند آواز سے اللہ اکبر کہنے سے دشمن کا دل سہم جاتا ہے۔ جنگ بدر، احد، احزاب اور حنین میں دعوت مبارزت دینے والوں کو جن مسلمانوں نے جہنم واصل کیا وار کرنے کے ساتھ ہی بلند آواز سے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ جب خیبر پہنچے تو فرمایا:۔

اللہ اکبر خربت خیبر۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر - باب التکبیر عند الحرب)

(۱۵) شان و شوکت کا مظاہرہ:

مسلمانوں کے لئے عام حالات میں متکبرانہ چال منع ہے مگر جب دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے میدان جنگ میں اختیار کی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اعلائے کلمۃ الحق کی حمایت میں اختیار کی جاتی ہے۔

جنگ اُحد میں حضور اکرم ﷺ نے اپنی تلوار بلند کر کے فرمایا: کون اس کا حق ادا کرے گا؟ سب صحابہ اس سعادت کے حصول کے لیے متوجہ ہوئے۔ آپ ﷺ کی نگاہ انتخاب حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو اس عزت افزائی نے بجا طور پر فخر کا موقع بخشا۔ آپ پہلوانوں کی طرح اکڑتے ہوئے صف سے میدان کی طرف نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: یہ چال ناپسندیدہ ہے۔ لیکن اس وقت یہ بھی اللہ کو پسند ہے۔ (طبری۔ ج ا۔ غزوۂ احد)

اسلامی جھنڈا:

اسی طرح کا مظاہرہ مکہ میں داخلے کے وقت لشکر اسلام نے کیا۔ آپ ﷺ نے کفار مکہ کے سپہ سالار ابو سفیان کو بلند مقام پر کھڑا کیا اور افواج اسلام کو حکم دیا کہ وہ بڑی آن بان سے اپنے جھنڈے بلند کیے سامنے سے باری باری گزریں۔ حالانکہ عام حالات میں یہ باتیں فخر و تکبر پر محمول کی جاتی ہیں۔

جھنڈے کو بلند رکھنا بھی افواج کے حوصلے بلند رکھتا ہے۔ فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے اپنا جھنڈا ایک بلند مقام پر گاڑنے کا حکم فرمایا تھا اور آپ ﷺ کا جھنڈا قیس بن سعد انصاری اٹھائے ہوئے تھے۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب ماقیل فی لواء النبیؐ)

جب آپ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا۔ تو خیبر کا ایک مضبوط ترین قلعہ سر ہونے میں نہ آتا تھا۔ ایک دن آپ ﷺ نے فرمایا۔ میں کل جھنڈا اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر خیبر فتح ہوگا۔ چنانچہ دوسرے دن آپ ﷺ نے جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا۔ جنہوں نے یہ قلعہ بھی سر کر لیا۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

اسلام میں جھنڈے کی ابتدا غزوہ خیبر سے ہوئی۔ اور یہی وہ پہلا معرکہ ہے جس میں مسلمانوں نے کچھ علاقہ سر کیا تھا۔ اس سے پہلے کی جنگیں بیشتر مدافعانہ قسم کی تھیں۔ اس کے بعد ہر جنگ میں جھنڈا قومی شعار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ (اسلام کے قوانین صلح و جنگ)



باب:۶

اسلام کے قوانین صلح و جنگ (۲)

فتح مکہ کے بعد

(۱) رنگ رلیوں کی بجائے سجدۂ تشکر:

دنیا کا یہ پرانا دستور ہے اور آج تک موجود ہے کہ جب فوج فتح حاصل کرتی ہے تو اس خوشی میں اچھلتی ہے کودتی ہے، ناچتی ہے، گاتی ہے، پیتی ہے پلاتی ہے اور خرمستیاں کرتی ہے لیکن حضور جب حجاز کا مرکزی شہر فتح کرتے ہیں تو آپ کو یہ حکم نہیں ملتا کہ شہر میں چراغاں کیا جائے، کوئی جلوس نکالا جائے یا جلسے اور مظاہرے کیے جائیں۔ حکم ہوتا ہے تو یہ کہ:۔

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۝﴾ (۳/۱۱۰) (اب اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کیجئے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیجئے بیشک وہ معاف کرنے والا ہے۔)

مسلمانوں نے آپ ﷺ کو فتح مکہ کے دن اس حال میں دیکھا کہ آپ کا سر مبارک پالان پر جھکا ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے روئیں روئیں سے بے انتہا انکسار ظاہر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی پالان کے وسط کو چھو رہی تھی۔ آپ ﷺ کو اس فتح کی اہمیت کا احساس جس قدر زیادہ ہوتا اتنا ہی آپ ﷺ اپنی سواری پر خدا کے حضور جھکتے جاتے۔

(ابن ہشام ج ۴ ص ۴۸)

فتح کے بعد اس بنیادی فرق کی وجہ یہ ہے کہ کافر اور مادہ پرست فتح کو اپنے مادی وسائل کا نتیجہ سمجھتا ہے جبکہ مسلمان تمام مادی وسائل کو بروئے کار لانے کے باوجود بھی فتح کا اصل سبب اللہ کی مہربانی سمجھتا ہے۔ لہٰذا فتح کے بعد اسے شکر بھی اللہ تعالیٰ ہی کا کرنا چاہیے۔

(۲) اموال غنیمت پر حدود و قیود:

فوجیں بالعموم جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران بھی دشمن کی املاک سے فائدہ اٹھانا

اور ان کو غصب کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ پھر فتح کے بعد تو ایک بالا دست قوت کے لحاظ سے اس حق کا خوب استعمال کرتی ہیں۔ سالار لشکر کی طرف سے اس بات کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ مثلاً تین دن تک فوج کو اجازت دی جاتی ہے۔ کہ وہ دشمن کا جونسا اور جتنا مال سمیٹ سکتی ہے سمیٹ لے اور ایسی لوٹ مار کو اموال غنیمت کہا جاتا ہے۔ اسلام سے پیشتر عربوں کا محبوب پیشہ یہی لوٹ مار تھا۔ محنت کی کمائی سے وہ لوٹ مار سے حاصل شدہ دولت کو بہت عزیز سمجھتے تھے۔ عرب جیسے بے آب وگیاہ علاقے میں وسائل معاش بہت کم تھے۔ لہٰذا قبائل عرب ایک دوسرے کو ہی نہیں اکثر تجارتی قافلوں کو لوٹا کرتے تھے۔ لوٹے ہوئے مال کی محبت ان کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ چنانچہ اسلام لانے کے بعد بھی اموال غنیمت سے محبت مسلمانوں میں بسا اوقات غیر شعوری طور پر ابھر آتی تھی۔ اور حقیقت میں دیکھا جائے تو جنگ احد میں مسلمانوں کو ابتداءً جو شکست ہوئی۔ تو اس کا اصل سبب یہی اموالِ غنیمت سے محبت تھی۔ اسلام نے اموالِ غنیمت سے اس اندھی محبت کا علاج یوں کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر بتا دیا کہ:۔ جو شخص اموال غنیمت کے لیے لڑتا ہے۔ اس کا جہاد، جہاد نہیں اسے آخرت میں کوئی حصہ نہ ملے گا"۔

(نسائی کتاب الجهاد-باب من غزا يلتمس الاجر)

اسلام نے اموال غنیمت کو کلیتاً حرام قرار نہیں دیا وجہ یہ تھی کہ فوج کو تنخواہیں دینے کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ البتہ اس پر اتنی پابندیاں اور حدود و قیود عائد کر دیں کہ اموال غنیمت کا وہ مفہوم ہی نہ رہ گیا۔ جو دورِ جاہلیت میں یا آج بھی بالعموم سمجھا جاتا ہے۔ ان حدود و قیود کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) اموال غنیمت اور لوٹ کا فرق:

اموال غنیمت صرف وہ مال سمجھا جائے گا۔ جو کوئی فوجی دستہ مرکز کی طرف سے لڑنے کی اجازت اور لڑنے کے بعد حاصل کرے گا۔ اگر کوئی فوجی دستہ مرکز کی اجازت کے بغیر کسی کافروں کے دستہ سے لڑ کر فتح یاب ہو کر مال حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ مالِ غنیمت نہیں بلکہ غصب ہوگا۔ اسی طرح اگر مرکز کی طرف سے اجازت تھی لیکن لڑنے سے پہلے دشمن کے اموال کو لوٹ لیا گیا تو ایسا لوٹا ہوا مال بھی غنیمت کی تعریف سے نکل جائے گا۔

سریہ نخلہ ۲ھ میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ جو مالِ غنیمت لائے۔ اس پر آپ ﷺ

نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ کیونکہ یہ جھڑپ آپ ﷺ کی اجازت بغیر ہوئی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ چند آدمی تجارت کا مال لیے شام سے واپس آ رہے تھے۔ اس دستہ نے ان پر حملہ کر دیا۔ دشمن کا ایک آدمی مر گیا اور دو گرفتار ہوئے اور مال بھی ہاتھ آیا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے واپس مدینہ آ کر واقعہ بیان کیا اور مال غنیمت بھی پیش کیا۔ آپ ﷺ سخت برہم ہوئے اور فرمایا:۔

((صَنَعْتُمْ مَالَمْ تُؤْمَرُوْا بِهٖ وَقَاتَلْتُمْ فِی الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَلَمْ تُؤْمَرُوْا بِقِتَالٍ۔)) (تم نے وہ کام کیا جس کا تمہیں حکم نہیں دیا گیا اور ماہ حرام میں تم لڑے اس میں لڑنے کا حکم نہ تھا۔)

(طبری ج اغزوات بدر کے تحت)

قریش نے اس لڑائی کو خوب اُچھالا کہ محمد ﷺ اور اس کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے حرمت کے مہینے کو حلال کر دیا۔ جس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے دیا:۔

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ ...... اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾ (۲:۲۱۷)

(رحمۃ اللعالمین جلد ۲ ص ۱۸۷)

وحی الٰہی کی رُو سے معاملہ میں کچھ نرمی پیدا ہوئی۔ تو آپ ﷺ نے مال غنیمت قبول کر لیا۔ قیدیوں کو چھوڑ دیا اور مقتولین کا خون بہا ادا کر دیا۔

دورانِ جنگ اگر رسد میں کمی واقع ہو جائے تو عموماً افواج کو یہ حق دیا جاتا ہے۔ کہ وہ ادھر اُدھر سے لوٹ مار کر کے خوراک کا سامان حاصل کر لیں۔ اور اس میں کچھ قباحت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ آپ ﷺ نے ایسی حاصل کردہ خوراک کو بھی لوٹ مار اور حرام قرار دیا۔ ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم ایک دفعہ سفر پر گئے۔ خوراک کی سخت قلت تھی۔ اتفاق سے بکریوں کا ایک ریوڑ نظر آیا تو سب اس پر ٹوٹ پڑے اور بکریاں لُوٹ لیں۔ آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو دیکھا کہ ہنڈیوں میں گوشت پک رہا ہے۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں کمان تھی۔ آپ ﷺ نے اس سے ہنڈیاں اُلٹ دیں۔ پھر فرمایا۔ "ایسی لوٹ مار کا گوشت مردار کے برابر ہے۔"

(ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب فی النھی فی النُّھبی اذا کان فی الطعام قلّۃ)

(۲) اموال غنیمت سے کچھ چھپا لینا بدترین خیانت ہے:

انفرادی طور پر لوٹا ہوا مال سارے کا سارا امیر کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یا مقررہ

سٹور میں جمع کرایا جائے گا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں:۔

﴿كَانَ عَلَى ثِقْلِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وَسَلَّمَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ كِرْكِرَةُ فَمَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ فِي النَّارِ فَذَهَبُوْا يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ فَوَجَدُوْا عَبَاءَةً قَدْ غَلَّهَا-﴾

(بخاری۔ کتاب الجهاد- باب القليل من الغلول)

(آنحضرت ﷺ کے زمانہ پر ایک آدمی متعین تھا۔ جس کا نام کرکرہ تھا (وہ حبشی تھا اور تہامہ کے حاکم نے آپ ﷺ کو بطور تحفہ بھیجا تھا) وہ مرگیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ دوزخ میں ہے۔ لوگوں نے اس کو جا کر دیکھا (اس کے مال اسباب کی تلاشی لی) تو لوٹ کے مال کی ایک کملی اس میں پائی جو اس نے چرائی تھی۔)

اس طرح کا ایک دوسرا واقعہ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ:۔

((ثم انصرفنا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰه عليه وسلم مَعَهُ عَبْدٌ يُقَالُ لَهُ مِدْعَمٌ اَهْدَاهُ لَهُ اَحد بَنِي الضباب فَبَيْنما هُوَ يَحُطُّ رَحْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْجَاءَهُ سَهْمٌ عَائِرٌ حَتّٰى اَصَابَ ذٰلِكَ الْعَبْدَ- فَقَالَ النَّاسُ هَنِيْئًا لَهُ الشَّهَادَةُ- فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلٰى وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِيْ اَصَابَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ الْمَغَانِمِ- لَمْ تُصِبْهَا الْمَقَاسِمُ تَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نَارًا- فَجَاءَ رَجُلٌ حِيْنَ سَمِعَ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِرَاكٍ اَوْشِرَاكَيْنِ فَقَالَ! هٰذَا شَيْءٌ كُنْتُ اَصَبْتُهُ - فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(پھر ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ (خیبر) واپس لوٹے اور وادی القریٰ میں آئے۔ آپ کے ساتھ ایک غلام تھا جسے مدعم کہتے تھے۔ یہ غلام آپ ﷺ کو ضباب کے ایک شخص نے بطور تحفہ بھیجا تھا یہ غلام آپ ﷺ کا کجاوہ اتار رہا تھا اتنے میں ایک ناگہانی تیر اس کو آلگا۔ جس سے وہ مرگیا۔ لوگ کہنے لگے اس کو مبارک ہو شہید ا ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نہیں نہیں۔ اس نے ایک چادر جو خیبر کے دن تقسیم سے پہلے چرائی تھی وہ آگ ہو کر اس کو جلا رہی ہے۔ یہ سن کر ایک شخص آپؐ کے پاس جوتی کا ایک تسمہ یا دو تسمے لے کر آیا۔ اور کہنے لگا میں نے یہ لوٹ کے مال سے لیے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا (اگر تو داخل نہ کرتا) تو یہ ایک تسمہ یا دو تسمے آگ بن جاتے' قیامت میں تجھ کو

شِرَاکٌ اَوْ شِرَاکَیْنِ مِنْ نَارٍ-)) جلاتے-)

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

((سَمِعْتُ اَبِیْ یُحَدِّثُ عَنْ عُمر بن الخطاب عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "قَالَ اِذَا وَجَدْتُّمُ الرَّجُلَ قَدْ غَلَّ فَاحْرِقُوْا مَتَاعَهٗ وَاضْرِبُوْهُ-))

(میں نے اپنے باپ (عبداللہ بن عمر) سے وہ عمر بن الخطاب سے وہ حضور ﷺ اکرم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔"جب تم کسی کو دیکھو کہ اس نے مال غنیمت سے کچھ چھپا لیا ہے۔ اس کا سامان جلا دو اور اسے بدنی سزا دو۔)

(ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی عقوبة الغال)

بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسے "چور کے لیے موقع کے لحاظ سے تین سزائیں بھی تجویز کی گئیں۔(۱) اس کے سامان کو جلا دیا جائے۔(۲) مال غنیمت سے اس کا حصہ نہ نکالا جائے۔(۳) اسے بدنی سزا بھی دی جائے۔

اور سمرہ بن جندب..... کہتے ہیں کہ:-

((کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: "مَنْ کَتَمَ غَالًّا فَاِنَّهٗ مِثْلُهٗ"-)) (ابوداؤد۔ حوالہ ایضاً)

(رسول اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے۔"جس کسی نے کسی چور کی چوری چھپائی۔ تو وہ پردہ ڈالنے والا بھی اسی چور ہی کی مانند ہے۔")

البتہ ایسی اشیاء جو خوراک سے تعلق رکھتی ہوں اور جلد خراب ہو جانے والی ہوں ان کے استعمال کی اجازت ہے۔ یہی ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:-

((کُنَّا نُصِیْبُ فِیْ مَغَازِیْنَا الْعَسَلَ وَالْعِنَبَ فَنَاکُلُهٗ وَلَا نَرْفَعُهٗ-))

(ہم لڑائیوں میں شہد اور انگور پاتے تو اس کو اسی وقت کھا لیتے اور تقسیم کے لیے اٹھا نہ رکھتے۔)

(بخاری کتاب الجهاد- باب ما یصیب من الطعام من ارض الحرب)

(۳) سلب:

یعنی مقتول کے بدن پر جو سامان ہو (کپڑے، ہتھیار وغیرہ) وہ مال غنیمت میں شامل نہیں ہوگا نہ اس سے خمس نکالا جائے گا بلکہ وہ قاتل کو ملے گا۔

امام بخاری نے کتاب الجهاد میں اس عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

(۴) خمس:

جمع شدہ مال میں سے پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کرنے کے بعد باقی مال تقسیم ہوگا۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔﴾ (۸/۴۰)

(اور جان رکھو جو چیز تمہیں غنیمت میں ملے تو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔)

(۵) اموال فئے:

ایسا مال جو بغیر لڑائی کے مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے وہ مال غنیمت نہیں بلکہ مال فئے ہے اور یہ سارے کا سارا بیت المال کی ملکیت ہوگا۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔﴾ (۵۹/۷)

(جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے بغیر لڑائی کے دلوا دیا ہے۔ وہ اللہ کے پیغمبر کے (پیغمبر کے) قرابتداروں کے اور یتیموں کے اور حاجت مندوں کے اور مسافروں کے لیے ہے۔)

اب ان شرائط کے تحت جو مال اکٹھا ہوتا ہے۔ وہ حلال اور طیب ہے۔ اسی کی تقسیم ہوگی۔ یہ اموال بھی سپہ سالار کی ذاتی جاگیر نہیں ہوتی۔ وہ اس میں سے صرف حصہ رسدی ہی لے سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کسی اعرابی نے بر سر عام یہی اعتراض کیا تھا کہ اموال غنیمت سے جو کپڑا حصہ رسدی ملا ہے۔ اس سے قمیص تو بن نہیں سکتی تھی۔ آپ .... کی کیسے بن گئی؟ مگر آپ نے قطعاً بُرا نہ منایا بلکہ معقول جواب سے اس کی تسلی کر دی۔

ہاں امیر لشکر کو یہ اختیار ضرور ہے کہ وہ تالیف قلوب کے لیے کچھ لشکریوں کو حصہ زیادہ دیدے۔ (بخاری۔ کتاب الجهاد۔ باب امن الدليل على ان الخمس لنوائب المسلمين)

ان چند در چند قیود کے بعد بھی مال غنیمت کے حصول کے جذبہ کی حوصلہ شکنی ہی کی گئی ہے۔ جنگ احد اور حنین میں شکست کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی حصول غنیمت کا طمع

تھا۔ جسے قرآن کریم نے "تبتغون عرض الدنیا" کے ناپسندیدہ الفاظ سے بیان فرمایا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مال غنیمت کے لیے جہاد کیا اس کے لیے آخرت میں کوئی اجر نہیں۔ اور ایسے مجاہد جو مال غنیمت کی حرص کے بغیر جہاد کرتے ہیں۔ غازی ہو کر واپس ہوں اور اموال غنیمت سے حصہ پالیں ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو تہائی اجر انہوں نے وصول پالیا۔ اب صرف تیسرا حصہ اجر انہیں آخرت میں ملے گا اور جو مجاہد لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ اس کا مکمل اجر آخرت میں اُسے ملے گا۔ (نسائی۔ کتاب الجہاد۔ باب ثواب السریة التی تخفق)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شہید زندہ غازی سے، جس نے غنیمت سے حصہ پایا ہے، بہت زیادہ افضل ہے۔

دور حاضر اور اموال غنیمت:

رسول اللہ ﷺ کے دور میں باقاعدہ تنخواہ دار افواج نہیں تھیں۔ لہٰذا انہیں اپنے اخراجات اور سامانِ جنگ کی تیاری کے لیے اموالِ غنیمت سے حصہ مل جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فوج کا باقاعدہ محکمہ قائم ہو گیا۔ لشکریوں کو تنخواہیں ملنے لگیں تو اموال غنیمت بھی بیت المال کا حق قرار پایا۔ اور یہ دستور آج تک چلا آتا ہے۔ سب "اسلاب" بھی سٹور میں جمع ہیں اور حکومت اعلان کرتی ہے کہ مثلاً ہر فوجی ایک ایک کوٹ یا ایک ایک گھڑی اپنے پاس رکھنے کا حق دار ہے۔ باقی اسباب جمع ہو گا۔ بہر حال ایسے ذیلی قوانین حسب موقع و محل بنائے جاسکتے ہیں۔

عصمت کی پاسبانی:

فاتح قوم کا یہ بھی حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ مفتوح قوم کی عورتوں کی بے دریغ عصمت دری کریں اور اس میں اپنی برتری محسوس کرتی ہیں اسلام کی نظر میں یہ جتنا بڑا جرم عام حالات میں ہے اتنا ہی میدانِ جنگ میں اور فتح کے بعد بھی ہے۔

فوجیوں کو بسا اوقات بہت مدت گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ جن سے ان کی جنسی بھوک تیز ہو جاتی ہے۔ تو فتح کے بعد وہ اس سلسلے میں ایسی وحشت و بربریت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا علاج یہ سوچا تھا کہ ہر فوجی کو زیادہ سے زیادہ ۴ ماہ بعد چھٹی ضرور دی جائے۔ تاکہ فوج میں فحاشی کا رجحان نہ پھیل سکے۔

۴ ماہ کی مدت انسانی نفسیات کا جائزہ لے کر مقرر کی گئی تھی بلکہ سالار کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ فوج کے اخلاق اور کردار کا پورا پورا خیال رکھے۔ جو فوجی مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتا تو اُسے سخت سزائیں دی جاتیں۔ فوجیوں کے اندر مکارم اخلاق پیدا کرنے میں ایک تو حُرمت شراب نے بڑی مدد کی دوسرے اس بات سے بھی بڑی مدد ملی کہ جب کوئی سپاہی اپنے خاندان سے دور مقام پر متعین ہوتا تو وہاں چار مہینے رہنے کے بعد گھر جانے کے لیے رخصت دی جاتی تھی۔

علاوہ ازیں مجاہدین کے لیے یہ حکم تھا کہ جو شادی شدہ ہوں وہ روانہ ہونے سے قبل اپنی بیوی سے صحبت کر کے جائیں۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((غزا نبی من الأنبیاء فقال لقومہ لا یُتبِعُنِیُ رجل مَلَکَ بِضع امراۃ وھو یرید ان یبنی بھا ولم یبن بھا)) (بخاری۔ کتاب النکاح۔باب من احب البناء قبل الغزو)

(کسی پیغمبر نے جہاد کیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا۔ میرے ساتھ کوئی ایسا شخص (جہاد کے لیے نہ جائے جس نے کسی عورت سے عقد کیا ہو) اور ابھی اس سے صحبت نہ کی ہو۔)

جنسی اشتہاء اور فحاشی، بے راہ روی کا دوسرا حل جو شریعت نے تجویز فرمایا ہے۔ وہ روزہ ہے۔ روزہ جنسی رجحانات کو بہت حد تک کم کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص نوجوان ہو اور نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ روزے رکھے۔ روزہ اس کی شہوت کو توڑ دے گا۔ (بخاری۔ کتاب الصوم۔باب الصوم لمن خاف علی نفسہ العزوبۃ)

لونڈیوں کا مسئلہ:

ہم آگے چل کر وضاحت سے بتلائیں گے۔ کہ اسلام نے فتح کے بعد لونڈی غلام بنانے کے طریق کو مستحسن نہیں سمجھا۔ تاہم بعض صورتوں میں اس کا جواز موجود ہے۔ جیسا کہ غزوہ بنوقریظہ میں ہوا۔ تو جس طرح اموالِ غنیمت پر اسلام نے حدود وقیود عائد کی ہیں۔ اس طرح لونڈیوں پر بھی عائد کی ہیں مثلاً:۔

(۱) لونڈی کا اطلاق صرف اس وقت ہوگا۔ جبکہ وہ امیر کی وساطت سے تقسیم ہو کر کسی مجاہد کے قبضہ میں آجائے۔ اس کے علاوہ جو صورت بھی ہوگی زنا شمار ہوگی۔ لہٰذا جنگ کے

دوران یا فتح کے بعد دشمن کی عورتوں کی عصمت دری کرنا خالص زنا میں شمار ہوگا۔

(۲) امیر کے ذریعہ تقسیم میں کسی عورت کا کسی مجاہد کے حصہ میں آجانا ہی نکاح کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ منکوحہ تھی تو اس کا سابقہ نکاح از خود ٹوٹ جاتا ہے۔

(۳) عام حالات میں ایک ماہ کے بعد اور اگر حاملہ ہے تو وضع حمل کے بعد اس سے صحبت روا ہے۔ (نووی میں شرح مسلم۔ باب جواز وطی المسبیة بعد الاستبراء) پھر اس کے ساتھ ہی وہ پابندیاں بھی عائد ہو جاتی ہیں جو اسلام نے اس سلسلہ میں عائد کی ہیں۔ مثلاً بہتر سلوک۔ حسنِ معاشرت اور ان کی آزادی کے حقوق وغیرہ۔

(۴)۔ تقسیم میں آنے کے بعد بھی بہتر صورت یہ ہے کہ لونڈی کو آزاد کر کے اس سے باقاعدہ نکاح کر لیا جائے۔ جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ حضرت صفیہ رضی اللہ عنھا (بنت حیی بن اخطب) کو آزاد کر کے اپنے نکاح میں لائے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں لونڈی غلام بنانے کی اجازت کی حوصلہ شکنی کر کے اسے تقریباً ختم ہی کر دیا۔ آج کل لونڈی غلام بنانے کا دستور ختم ہو چکا ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے اور اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ لیکن یہ اچھی بات اس صورت میں سمجھی جا سکتی ہے جب کہ فحاشی کا پورا سدباب بھی کیا جا سکے۔ اور اگر فحاشی اور عصمت دری کے تمام دروازے کھلے رہیں۔ تو اس سے لونڈی بنانے کی اجازت ہزار درجہ بہتر ہے۔ بشرطیکہ تمتع کے بعد کی تمام تر پابندیاں گوارہ کی جائیں۔

(۶) فاتحین کا جوش انتقام

فاتح افواج فتح کی خوشیاں منانے، لوٹ مار اور عصمت دری پر بس نہیں کرتیں بلکہ وہ اپنے حریف کو ہر ممکن طرح سے رسوا کرنے اور اس کے علاقہ میں دہشت کے لیے کئی قسم کی ناجائز حرکات بھی کرتی ہیں۔ بموجب قول باری تعالیٰ:۔

﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ (۳۴/۲۷)

(بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں اور اسی طرح یہ بھی کریں گے۔)

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ فاتح افواج اس جوش انتقام میں کیا کچھ کرتی ہیں اور اسلام نے اس سلسلہ میں کیا احکام دیئے ہیں:۔

(ا) دشمن کی لاشوں کی بے حرمتی:

دورِ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ دشمن کی لاشوں کو اپنی سواریوں کے پاؤں تلے روندتے ان کا مثلہ کرتے یعنی ناک، کان وغیرہ کاٹ دیتے۔ یوں بھی انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی تو ان کے کٹے ہوئے اعضاء کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے۔ لاشوں کا کلیجہ نکال کر دانتوں میں چباتے، اس کی کھوپڑی میں شراب پیتے تھے۔ اسلام نے ایسی تمام اخلاق سوز حرکات سے منع فرمادیا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:۔

((كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحُثُّنَا عَلَى الصَّدَقَةِ وَيَنْهَانَا عَنِ الْمُثْلَةِ)) (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب فی النھی عن المثلۃ)

(حضور اکرم ﷺ ہمیں صدقہ کی ترغیب دیتے اور مثلہ سے روکا کرتے تھے۔)

سہیل بن عمرو خطیب قریش کے لقب سے مشہور تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش مکہ کی طرف سے یہی نمائندہ بن کر آیا تھا۔ یہ نہایت فصیح اللسان تھا اور اکثر اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ جنگ بدر میں گرفتار ہو کر آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھ کر فرمایا۔ ''یا رسول اللہ ﷺ اس کے نچلے دو دانت اکھڑوا دیجئے تا کہ آئندہ اسلام کے خلاف تقریریں نہ کر سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اگر میں اس کے عضو بگاڑوں (مثلہ کروں) تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میرے عضو بگاڑ دے گا۔ (طبری ج ا غزوہ بدر)

آپ ﷺ نے جس طرح انسانی جان کو محترم قرار دیا۔ اسی طرح انسانی لاش کو بھی محترم قرار دیا۔ جنگ بدر میں مشرکین کی لاشیں کھلے میدان میں پڑی تھیں۔ گرمی کا موسم تھا۔ ان لاشوں سے بد بو پھیل رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے اکثر پر مٹی ڈلوادی۔ باقی لاشوں کو بدر کے ایک کنویں میں پھینک دیا گیا۔

جنگ خندق میں ''اتحادی'' خندق کی وجہ سے مسلمانوں پر حملہ کرنے میں بے بس ہو گئے تھے ایک دن چار شہسواروں نے گھوڑوں کو پیچھے سے دوڑا کر جست لگائی تو وہ ایک کم چوڑائی

والی جگہ سے خندق پار کر گئے۔ ان میں ایک شہسوار عمرو بن عبد ود نے مقابلہ کے لیے للکارا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا کام تمام کر دیا۔ باقی تین مقابلہ سے پیچھے ہٹ گئے۔ ان پیچھے ہٹنے والوں میں ایک نوفل تھا جو خندق میں گر پڑا۔ مسلمانوں نے نیزوں پر دھر لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دیا۔ قریش مکہ نے نوفل کی لاش حاصل کرنے کے لیے دس ہزار درہم کی پیشکش کی۔ کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہیں مسلمان بھی شاید اس کی لاش سے وہی سلوک کریں گے۔ جو عام دستور ہے۔ ان کی اس پیشکش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا۔ لاش دے دو۔ قیمت کی ضرورت نہیں ہم لاشوں کی قیمت نہیں لیا کرتے۔

(۲) قتل عام:

اسلام اپنے حریف کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک مقاتل یعنی وہ لوگ جو لڑنے کے لیے میدان جنگ میں پہنچ گئے ہوں دوسرے وہ جسے شہری آبادی کہا جاتا ہے یا جو جنگ میں عملاً حصہ نہیں لیتے۔ اسلام صرف پہلی قسم کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور وہ بھی جنگ کے دوران فتح کے بعد نہیں۔ پھر میدان جنگ میں پہنچنے والوں میں بھی اگر عورتیں اور بچے یا بوڑھے کھوسٹ ہوں تو ان کا قتل بھی درست نہیں سمجھتا۔ تو جنگ کے بعد شہریوں کا قتل عام کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

جنگ سے اسلام کا مقصد فتنہ وفساد کو ختم کرنا ہے۔ جب فتح حاصل ہو گئی تو یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اب فتح کے بعد قتلِ عام از سر نو فتنہ وفساد بپا کرنے کے زمرہ میں آتا ہے۔ اسلام اسے بھلا کیونکر برداشت کر سکتا ہے؟

(۳) نذر آتش:

اسی طرح فاتح قوم اپنے ''خطرناک دشمنوں'' کو خواہ وہ قیدی ہوں یا شہری زندہ جلا دیتی ہیں اور کبھی مفتوحہ شہر ہی کو جلا دینے کا حکم دے دیتی ہیں آپ .... نے اس سے منع فرما دیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

((بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْثٍ وَقَالَ لَنَا اِنْ لَقِيْتُمْ فُلَانًا

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک فوج میں بھیجا اور قریش کے دو آدمیوں کا نام لے کر

وَفُلَانًا لِرَجُلَيْنِ مِنْ قُرَيْشٍ سَمَّاهُمَا فَحَرِّقُوهُمَا بِالنَّارِ "قَالَ ثُمَّ اَتَيْنَا نُوَدِّعُهُ حِيْنَ اَرَدْنَا الْخُرُوجَ : فَقَالَ : اِنِّي كُنْتُ اَمَرْتُكُمْ اِنْ تُحَرِّقُوا فُلَانًا وَفُلَانًا بِالنَّارِ وَاِنَّ النَّارَ لَا يُعَذِّبُ بِهَا اِلَّا اللّٰهُ فَاِنْ اَخَذْتُمُوهُمَا فَاقْتُلُوهُمَا۔)) (بخاری کتاب الجہاد باب لا یعذب بالنار الا رب النار)

فرمایا اگر ان کو پاؤ تو انہیں جلا دینا"۔ پھر ہم آپ ﷺ سے رخصت ہونے کو آئے جب نکلنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا۔"میں نے پہلے تم کو یہ حکم دیا تھا کہ دو شخصوں کو آگ میں جلا دینا۔ لیکن آگ اللہ ہی کا عذاب ہے۔ آگ میں جلانا اسی کو سزاوار ہے۔ اگر تم ان کو پکڑ لو تو انہیں قتل کر دینا۔)

(۴) عبادت گاہوں کی بربادی:

فاتح افواج عموماً حریف کے معبدوں سے گھوڑوں کے اصطبل یا اسٹور کا کام لیتی ہیں۔ اسلام میں ایسی باتوں کی قطعاً اجازت نہیں وہ دوسری اقوام کے عبادت خانوں کی حفاظت کی خود ذمہ داری لیتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ کو رخصت کرتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ دشمن کے معبدوں کا احترام بحال رکھا جائے۔

(موطا۔ کتاب الجہاد۔ باب النهی عن قتل النساء والولدان فی الغزوِ)

مندرجہ بالا تمام منتقمانہ کاروائیوں سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (۸/۵ مذکورہ بالا قوانین میں مستثنیات کے لیے دیکھیے باب ۵ زیر عنوان جنگی ضروریات)

(تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو۔ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔ پرہیزگاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔)

اسیران جنگ سے برتاؤ

اسیران جنگ سے سلوک کے متعلق مندرجہ ذیل صورتیں ممکن ہیں۔

(۱) اسیر بنانے سے پہلے ہی آزاد کر دیا جائے۔

(۲) بلا معاوضہ از راہ احسان چھوڑ دیا جائے۔

(۳) معاوضہ (فدیہ) لے کر چھوڑ دیا جائے۔

(۴) جنگی قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کر لیا جائے۔

(۵) غلام بنا لیا جائے۔

(۶) تہ تیغ کر دیا جائے۔

اسیرانِ جنگ سے متعلق قرآن کریم نے ایک عام اصول بیان فرمادیا:۔

﴿فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾ (۴:۴۷) (پھر ان قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دو۔ یا فدیہ لے کر۔)

اب ہم دیکھیں گے کہ دور نبوی میں کل کتنے اسیر ہوئے اور ان سے کیا سلوک ہوتا رہا۔

(۱) اسیر بنانے سے پہلے آزاد کر دینا:

یہ صورت صرف فتح مکہ کے بعد اختیار کی گئی۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں سے عفو و درگزر سے کام لیا اور فرمایا:۔

((اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) (جاؤ تم سب آزاد ہو۔)

اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ ہزار ہا کی تعداد میں تھے جو باوجود قدرت کے غلام بنائے نہیں گئے۔ ان میں سے کچھ تو مسلمان ہو گئے۔ اور کچھ غیر مسلم ہی رہے۔

(۲) از راہ احسان چھوڑ دیا جائے:

اس صورت کے مندرجہ ذیل غزوات و سرایا کے قیدی آزاد کیے گئے:۔

(۱)	سریہ نخلہ رجب ۲ھ	۲ قیدی
(۲)	غزوہ بنو مصطلق شعبان ۵ھ	۱۹ قیدی[1]

---

[1] شبلی نعمانی سیرۃ النبی ج ا ص ۴۲۳ پر اسیروں کی تعداد تقریباً چھ سو بتلائی ہے۔ اور ساتھ ہی ص ۴۲۷ پر یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ یہ سب چھوڑ دیئے گئے تھے۔

(۳) سریہ جموم ربیع الاخر ۶ھ ۱۰ قیدی

(۴) سریہ عیص صفر ۷ھ ۹ قیدی

حضرت ابوجندل ﷺ اور عتبہ بن اسید ﷺ (ابوبصیر) کے جتھے نے تجارتی قافلہ پر حملہ کر کے قیدی بنائے اور غنیمت حاصل کی۔ پھر حکم نبوی کے مطابق سب کچھ واپس کر دیا۔

(۵) سریہ حسمی جمادی الآخر ۷ھ ۱۰۰ قیدی

(۶) غزوہ حنین شوال ۸ھ ۶۰۰۰ قیدی

آزاد کر دینے کے علاوہ قیدیوں کو کپڑے بھی عطا فرمائے۔

(۷) سریہ عُیینہ محرم ۹ ۶۳ قیدی۔قبیلہ بنوتمیم نے بغاوت کی تھی

(۸) سریہ بنوطے ۹ھ دختر حاتم مسماۃ سنانہ اور اس کی پوری قوم

آپ نے دختر حاتم کو باکرام رخصت فرمایا اور اس کی وجہ سے ساری قوم کو چھوڑ دیا۔

کل تعداد ۶۲۰۲ کم از کم

(۳) فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے:

جنگ بدر ۲ھ کے قیدیوں کا فدیہ لیا گیا۔ اس کے بعد فدیہ کی بھی صورت پیش نہیں آئی۔ عموماً ازراہ احسان ہی چھوڑ دیا جاتا رہا۔ فدیہ لے کر چھوڑنے کی داستان بھی عجیب ہے جو آپ ﷺ کی شان رحیمی اور عفوودرگزر کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ کسی قیدی نے کہا۔ میرے پاس فدیہ دینے کو کوئی چیز نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا۔ ''پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟'' قیدی نے اثبات میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دو۔ یہی تمھارا فدیہ ہے۔ کسی نے کہا میں خود مکہ جا کر فدیہ بھیج سکتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اس پر بھی اعتبار کر کے اسے چھوڑ دیا۔ کسی نے کہا۔ میرے پاس تو نہ کوئی رقم ہے اور نہ میں پڑھنا لکھنا جانتا ہوں اور غریب آدمی ہوں۔ آپ ﷺ نے اس سے دوبارہ جنگ میں حصہ نہ لینے کے وعدہ پر چھوڑ دیا اور اس کے وعدہ پر اعتبار کر لیا۔

آپ ﷺ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ابوالعاص سے ہوا تھا جو اس جنگ میں گرفتار ہوا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اس کے فدیہ میں اپنے گلے کا وہ ہار بھیجا جو اس کی والدہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اسے دیا تھا۔ ہار کو دیکھ کر آپ ﷺ کو اپنی غمگسار، اطاعت گزار اور باوفا بیوی کی یاد تازہ ہوگئی۔ آنسو ڈبڈبا آئے۔ ایسے شدید جذبات کی رو میں بھی آپ ﷺ نے یہ نہیں کیا۔ کہ اپنے اختیار سے کام لیکر ابوالعاص کو ویسے ہی چھوڑ دیا جائے اور ہار

اپنی بیٹی کو واپس کر دیا جائے۔ بلکہ یہ معاملہ صحابہ ؓ کے سامنے پیش کیا اور درخواست کی کہ اگر کہو تو حضرت خدیجہ کی یہ نشانی زینب ؓ کو واپس کر دی جائے۔ صحابہ ؓ نے رضامندی کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے ہار واپس کر دیا اور ابوالعاص کو بھی رہا کر دیا۔

یہ تھے فدیہ کی رقم کی وصولی کے وہ مختلف طریقے جو جنگی قیدیوں کی رہائی کے سلسلہ میں بروئے کار لائے گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ فدیہ لینا ہی نہ چاہتے تھے۔ ان قیدیوں کے بارے میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے مشورہ لیا تھا۔ حضرت عمر ؓ اور ان کے ہم نواؤں کی رائے یہ تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ حضرت ابوبکر ؓ اور ان کے ہم نواؤں کی رائے یہ تھی کہ ان قیدیوں سے فدیہ لیا جائے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر ؓ کی رائے کو اس لیے پسند فرمایا کہ آپ ﷺ بھی طبیعت کے نرم تھے۔

(۴) تبادلہ:

دورِ نبوی ﷺ میں جنگی قیدیوں کے تبادلے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی بھی جنگ میں مسلمان قیدی نہیں بنائے گئے۔ جبکہ کفار کو ہر بار شکست ہوتی رہی۔ اور قیدی بھی ہاتھ آتے رہے۔

معرکہ کارزار کے علاوہ دوسری مہموں یعنی گشتی اور تبلیغی دستوں کی شکل میں بعض مسلمان کافروں کی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے شہید ہوئے۔ اور قید بھی پھر کچھ مسلمان محض اسلام لانے کی وجہ سے قریش مکہ کی قید میں تھے۔ ایسے مسلمان قیدیوں کو چھڑانا اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے اور ایسے قیدیوں کے تبادلے کا بھی دورِ نبوی ﷺ سے ثبوت مل جاتا ہے۔ مسلم، ابو داؤد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک دفعہ مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کیا۔ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے گرفتار شدہ لڑکی اہل مکہ کو دے کر ان سے دو مسلمان رہا کرائے۔ (الجہاد فی الاسلام ص ۲۵۳)

(۵) قیدی کو غلام بنانا یا تہ تیغ کرنا:

غزوہ بنو قریظہ ذی الحجہ ۵ ھ پورے عہد نبوی ﷺ میں یہ ایک ہی موقع ہے جبکہ اسیران جنگ کو غلام بنایا گیا ہے یا تہ تیغ کیا گیا۔ ان کے ۴۰۰ لڑائی کے قابل آدمیوں کو مارا گیا اور ۲۰۰ بچوں ، بوڑھوں، عورتوں، معذوروں کو غلام بنایا گیا۔

دراصل ان کو یہ سزا اسیران جنگ ہونے کی حیثیت سے نہیں ملی تھی۔ بلکہ یہ یہود کی مسلسل عہد شکنیوں، غداریوں اور سازشوں [1] کی سزا تھی۔

(۲) یہود نے فیصلہ کے لیے قبیلہ اوس (جو یہود کے حلیف تھے) کے سردار سعد بن معاذ کو بطور ثالث منتخب کیا تھا جو حضور ﷺ نے تسلیم کرلیا۔ بنو قریظہ کے متعلق انہوں نے فیصلہ یہ دیا تھا کہ:۔

(۱) جو لوگ لڑنے کے قابل ہیں قتل کیے جائیں۔

(۲) عورتیں، بچے اور معذور قیدی بنالیے جائیں۔

(۳) مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے۔

چنانچہ فریقین نے یہ ثالثی فیصلہ تسلیم کرلیا۔ پھر یہ فیصلہ چونکہ توریت کی شریعت کے عین مطابق تھا لہذا یہود نے اسے بخوشی منظور کرلیا۔ یہ ہے اس گھناؤنے الزام کی حقیقت کہ اسلام میں اسیرانِ جنگ کو لونڈی غلام بنالیا جاتا ہے۔ دور نبوی ﷺ کے کل اسیران جنگ کی تعداد ۶۸۷۲ ہے۔ جن میں سے ۷۰ فدیہ لے کر چھوڑے گئے۔ ۶۲۰۲ صرف از راہ احسان چھوڑ ہی نہیں دیئے گئے بلکہ ان پر مزید احسان بھی کیے گئے۔ ۳۰۰ اسیرانِ جنگ (یہودیوں) کو لونڈی غلام اور ۴۰۰ کو تہ تیغ کیا گیا۔ یہ فیصلہ انہی کے پسندیدہ ثالث کا فیصلہ تھا اور یہ ان کی مسلسل عہد شکنیوں اور سازشوں کی سزا انہیں قدرت کی طرف سے ملی تھی۔

غلامی کا مسئلہ:

اسیران جنگ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو اقتضائے زمانہ سے متعلق ہے۔ دور نبویؐ میں جیل خانے موجود نہیں تھے۔ ان کی حفاظت کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ان کی رہائش، خوراک، نگہداشت اور حراست کی ذمہ داری حکومت کے بجائے عام مسلمان پر ہو۔ تاآنکہ ان کو آزاد نہ کردیا جائے۔ اس عبوری دور میں قیدیوں سے سلوک سے متعلق احکام یہ ہیں۔

---

[1] بنو قریظہ کے متعلق الزامات یہ تھے۔

(۱) تجدید معاہدہ کے باوجود انہوں نے عہد شکنی کی۔ اور مسلمانوں کے خلاف اتحادیوں سے مل گئے جس سے اندرونی خطرہ لاحق ہوگیا۔

(۲) انہوں نے عورتوں اور بچوں کے قلعہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔

(۳) جنگ کے بعد حی بن اخطب کو ساتھ ملا کر مدینہ میں مزید اشتعال کی وجہ پیدا کی اور معاہدہ شکنی پر افسوس کی بجائے مقابلہ کی ٹھانی۔

(۱) آقا اور غلام کی خوراک، لباس اور رہائش میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے۔ بدر کے قیدیوں میں ایک ابوعزیز تھے جو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے وہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک انصاری نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا۔ یہ لوگ مجھے تو کھانا دیتے اور خود کھجوریں کھا کر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیتا مگر وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور روٹی مجھے واپس کر دیتے (ابن ہشام بحوالہ سیرۃ النبی ج ا ص ۳۳۶) اور یہ تو واضح ہے کہ ابوعزیز فدیہ کے بعد چھوڑ دیئے گئے تھے۔

(۲) غلام کی جان، مال اور آبرو قانون کی نظروں میں آقا کے برابر ہے۔ غلام کی جان، مال اور آبرو کی قیمت ایک آزاد مسلمان کے برابر قرار دی گئی۔ اور دور فاروقی میں ایک ذمی کے قتل کا مسلمان قاتل سے قصاص لیا گیا۔

پھر اگر کوئی غلام مستقل طور پر کسی کی ملکیت میں ہو تو مندرجہ بالا حقوق کے علاوہ درج ذیل حقوق بھی اسے حاصل ہوتے ہیں:۔

(۳) غلام کی ذہنی آزادی کا احترام کیا جائے گا اگر وہ جوہر قابل ہے تو اس کی کما حقہ تربیت کی جائے۔

(۴) غلام کو شادی کرنے اور اپنی انفرادی معاشرتی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوگا۔

(۵) غلام کو اپنی آزادی خریدنے کا حق حاصل ہے۔ جسے شرعی زبان میں مکاتبت کہتے ہیں۔ اب ہم اس ضمن میں چند احادیث پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:۔

((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ لَطَمَ مَمْلُوْكًا اَوْ ضَرَبَهٗ كَفَّارَتُهٗ اَنْ يُّعْتِقَهٗ۔)) (مسلم۔باب صحبة المماليك)

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ "جس کسی نے اپنے غلام کو طمانچہ لگایا یا اسے مارا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کو آزاد کر دے۔")

اور اس کو آزاد کرنے میں ثواب کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ کفارہ ہے۔ (حوالہ ایضاً)

(۲) اس حدیث کی تشریح میں امام نووی (شارح مسلم) لکھتے ہیں۔ سبحان اللہ لونڈی غلام رکھنا ان لوگوں کا حق تھا جو اولاد کی طرح ان کی تعلیم اور تربیت کرتے تھے۔ جو آپ

کھاتے تھے وہی ان کو کھلاتے تھے اور جو آپ پہنتے تھے وہی ان کو پہناتے تھے۔ طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لیتے تھے کبھی مارتے پیٹتے نہ تھے۔ اگر ان کا کوئی بچہ اس غلام کو مارتا تو اسے وہی سزا دیتے جو سلوک اس نے غلام سے کیا۔ (حوالہ ایضاً)

(۳) ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا پیچھے سے ایک آواز آئی۔ ''ابومسعود رضی اللہ عنہ! جان لے جتنی تو اس غلام پر قدرت رکھتا ہے اللہ تجھ سے زیادہ تجھ پر قدرت رکھتا ہے۔'' میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ میں نے کہا۔ ''یارسول اللہ ﷺ! یہ غلام اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزاد ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اگر تو ایسا نہ کرتا تو جہنم کی آگ تجھے جلا دیتی''۔ (حوالہ ایضاً)

(۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اگر کسی کا غلام کسی کے لیے کھانا تیار کرے اور اس طرح آگ اور دھوئیں کی گرمی اور تکلیف برداشت کرے تو مالک کو چاہیے کہ کھانا کھاتے وقت اسے ساتھ بٹھائے۔ اور اگر کھانا کم ہو تو لقمہ دو لقمہ اس کے لیے چھوڑ دے۔ (مسلم، باب ایضاً)

(۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک ایسے غلام کے لیے جو اللہ کی بھی اطاعت کرتا ہے اور اپنے مالک کی بھی...... دوہرا ثواب ہے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ابوہریرہ کی جان ہے۔ اگر جہاد اور حج اور ماں سے بہتر سلوک کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو میں خواہش کرتا کہ میں غلام ہو کر مروں۔ (مسلم حوالہ ایضاً)

(۶) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''جو شخص کسی مسلمان کو آزاد کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو غلام کے عضو کے بدلے دوزخ سے آزاد کر دے گا۔ (بخاری۔ کتاب العتق باب فی العتق و فضله)

(۷) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دو آدمیوں کا غلام ہو۔ پھر ایک مالک اپنا حصہ آزاد کر دے تو یہ مالک اگر مالدار ہو تو دوسرے کے حصے کی بھی قیمت ادا کر دے تاکہ غلام آزاد ہو جائے۔ (بخاری۔ کتاب العتق۔ باب اذا اعتق عبداً بین اثنین

(۸) جس شخص کے پاس لونڈی ہو، وہ اس کی اچھی طرح پرورش کرے۔ پھر آزاد کر کے اس سے صحبت کرے تو اس کا دوہرا ثواب ہے۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

(۹) کوئی شخص اپنے غلام سے یوں نہ کہے کہ اپنے رب کو کھانا کھلایا پانی پلا بلکہ یوں کہے کہ اپنے سردار کو یا اپنے آقا (سیدی ومولائی) کو پلاؤ۔ اور کوئی آقا میرا غلام (عبدی) یا میری لونڈی (اَمَتِی) بھی نہ کہے بلکہ یوں کہے میرا آدمی یا لڑکا یا خدمت گار۔ (فتای و فتاتی و غلامی) (بخاری حوالہ ایضاً)

اور غلام کو مکاتبت (بالاقساط اپنی آزادی کی قیمت ادا کر دینے کی تحریر) کا حق تو قرآن سے ثابت ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىْٓ اٰتَاكُمْ۔﴾ (۳۳/۲۴)

(لونڈی غلاموں میں جو مکاتب بننا چاہیں۔ ان سے مکاتبت کرلو اگر تم ان میں بھلائی (اس کی اہلیت) دیکھو۔ پھر اس مال سے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔ اس میں سے انہیں بھی دو۔)

گویا صرف مکاتبت کا حق ہی نہیں ان کی مالی امداد کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔

اس دور میں دنیا بھر میں غلامی کا دور دورہ تھا اور غلام معاشرہ کا ایک اہم جزو مقصود ہوتا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے تو اسیرانِ جنگ کے متعلق یہ فیصلہ کر کے کہ ''انہیں احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے''۔ غلامی کی اصل بنیاد پر کاری ضرب لگائی۔ غلاموں سے بہتر سلوک اور اونچ نیچ کا امتیاز ختم کر کے انہیں مساوی مقام پر لا کھڑا کیا۔ ''غلام کو آزاد کرنا'' بہترین نیکی قرار دیا اور زکوٰۃ میں سے ایک حصہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے مختص کیا۔ کئی گناہوں کا کفارہ ''غلام کو آزاد کرنا'' قرار دیا۔ ان سب عوامل کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلامی کی یہ رسم بتدریج ختم ہوتی گئی۔

اسلامی فتوحات کے لحاظ سے دورِ نبوی ﷺ کے بعد دورِ فاروقی کا نمبر ہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر نے یہ علاقہ فتح کر لیا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر بہت سے لوگوں کو لونڈی اور غلام بنا لیا اور وہ فروخت ہو کر عرب میں پھیل گئے۔ یہ سلسلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اسلامی روح کے منافی معلوم ہوا تو انہوں نے سرکاری سطح پر اس کے خلاف اقدامات کیے اور بڑی کاوش سے ہر جگہ سے ان کو واپس لے کر مصر بھیج دیا اور لکھ بھیجا کہ ان کو اختیار ہے خواہ اسلام لائیں یا اپنے مذہب پر رہیں۔ چنانچہ ان میں سے قصبہ بلہیب کے رہنے

والے اپنی خواہش سے مسلمان ہو گئے۔ (الفاروق ۱۰۳)

تاہم اس بات سے انکار ناممکن ہے کہ اسلام میں اسیران جنگ کو غلام بنانا گناہ یا حرام ہے۔ بعض دفعہ ایسے حالات پیش بھی آ سکتے ہیں جیسا کہ غزوہ بنونضیر کے موقع پر ہوا۔ اور اس اجازت کا ثبوت پر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے ملتا ہے۔

﴿يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾ (۸:۷۶) (اور یہ لوگ باوجودیکہ ان کو خود طعام کی خواہش ہے۔ مسکین کو یتیم کو اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔)

لیکن غلام کو اتنے حقوق عطا کر دیے گئے کہ نام کے علاوہ کچھ بھی فرق باقی نہ رہ گیا۔

غلاموں کا فقیہہ اور محدث ہونا تاریخ سے ثابت ہے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے متبنیٰ بنایا۔ اپنی پھوپھی زاد بہن سے نکاح کیا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ دونوں کو سپہ سالار لشکر بنایا۔ جن کے تحت بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم جہاد میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو جو حبشی غلام تھے سیدنا کہہ کر پکارتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے مولی سالمؓ کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ نامزد کر دیتا۔ حالانکہ وہ آزاد کردہ غلام تھے۔ اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا واضح ارشاد ہے:۔

((إِنْ أُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقُودُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا۔)) (مسلم۔ کتاب الامارۃ) (اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چلاتا ہے اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔)

چنانچہ تاریخ میں بے شمار ایسے مسلمان بادشاہ گزرے ہیں۔ جو غلام تھے۔ محمود غزنوی مشہور فاتح بھی آزاد کردہ غلام تھا۔ ہندوستان اور مصر میں غلاموں کے خاندان نے صدیوں تک حکومت کی۔ اب کونسا وہ اعزاز باقی رہ جاتا ہے۔ جو صرف آزاد کے ساتھ مخصوص ہو اور غلام اس سے بے بہرہ ہو۔

اسلام سے پہلے کے اسیر اور قتل صبر:

اسلام سے پہلے اسیران جنگ کے متعلق دو ہی متفقہ فیصلے تھے۔ ایک قتل، دوسرے دائمی

غلامی۔ تیسرا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ غلاموں کو معاشرہ میں پست ترین تصور کیا جاتا تھا۔ لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کیا جاتا کیونکہ وہ مردوں کی طرح محنت کر کے اپنے آقا کے حضور ﷺ آمدنی پیش نہ کر سکتی تھیں۔ بچے جو آمدنی پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتے انہیں چاند ماری کی مشقیں کر کے موت گھاٹ اتار دیا جاتا۔ پھر ان غلاموں کی باقاعدہ خرید و فروخت کی جاتی تھی۔

بعض قیدیوں کو درندوں کے آگے ڈال دیا جاتا۔ روم میں یہ دستور تھا کہ وہ لاتعداد قیدیوں کو سکھائے ہوئے درندوں کے سامنے چھوڑ دیتے اور ان کا مقابلہ دیکھتے۔ یہ ان کا مرغوب سامانِ تفریح تھا۔ کبھی ان قیدیوں کو کسی درخت وغیرہ سے باندھ کر ان پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی تا آنکہ وہ مر جاتا۔ اس طرح باندھ کر بے دست و پا کر نے کسی کو جان سے مار دینے کو عربی میں قتل صبر کہتے ہیں۔ اسلام نے اس وحشت و بربریت سے حکماً منع کر دیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ایک جنگ میں چند قیدیوں کو اس طرح قتل کرایا تھا پھر جب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سنا کہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور کہا اللہ تعالیٰ کی قسم میں مرغے کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں سمجھتا"۔ تو آپ نے کفارۂ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے۔ (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب قتل الاسیر بالنبل)

غلامی اور مستشرقین:

آج کی متمدن دنیا اسلام کو غلام بنانے کے جواز پر، بدنام کرتی ہے۔ حالانکہ ہم بتا چکے ہیں کہ عملاً اسلام نے غلامی کو ختم کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسیران جنگ کے لیے بھی یہ ریت ڈال دی۔ کہ انہیں آزاد کر دیا جایا کرے۔ بعد میں اگر ہمیں اس رسم غلامی کے آثار ملتے ہیں تو اس کا ذمہ وار اسلام نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جنہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کے تقدس کو پارہ پارہ کر کے اسے عام دنیوی جنگوں کی سطح پر لے آئے اور وہ سب کچھ کرنے لگے جو عام دنیا دار جرنیل اور بادشاہ اختیار کرتے ہیں۔

اسلام پر اعتراض یہ ہے کہ وہ اسیرانِ جنگ کو غلام بنانا جائز رکھتا ہے۔ اور اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو جنگ کے بغیر بھی لوگوں کو غلام بنانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اہل یورپ خصوصاً انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کی تمام دولت افریقہ سے لائے ہوئے

قیدیوں اور غلاموں پر موقوف رہی ہے۔ یورپین اپنے جہازوں سے اُتر کر افریقہ کے جنگلوں میں سیاہ انسانوں کا شکار کرتے اور قیدی بنا کر انہیں اپنے وطن لاتے اور ان کی خرید و فروخت کرتے رہے ہیں۔

مفتوح قوم سے سلوک:

اس سلسلہ میں ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ دور نبوی میں مشہور غزوات و سرایا ہوئے تو مفتوحین سے کیا سلوک روا رکھا گیا۔

(۱) جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خندق تینوں مدافعانہ جنگیں تھیں۔ فتح کے باوجود یہاں مفتوح اقوام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) سریہ موتہ مسلمان سفیر کے قتل کے قصاص کی بنیاد پر سرحد شام پر عیسائیوں سے لڑی گئی۔ اسلامی سرحدوں پر رومی فوجوں نے گڑبڑ پیدا کر دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ ان کی سرکوبی کو فوراً وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ دشمن منتشر ہو چکا ہے۔

(۳) فتح مکہ کے دوران مفتوح قوم کو جس فراخ دلی سے آزاد کیا گیا اور اس سے درگزر بھی کیا گیا۔ اس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔

(۴) غزوہ حنین میں چھ ہزار غلام ہاتھ لگے۔ ان سب کو از راہ احسان چھوڑ دیا گیا۔

یہود سے غزوات اور نتائج:

اب باقی صرف وہ غزوات رہ جاتے ہیں جو یہود سے تعلق رکھتے ہیں ان کا مختصر حال بھی ملاحظہ فرما لیجئے:۔

آپ کو یاد ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آتے ہی مدینہ اور مضافات مدینہ کے یہود کو جو تین قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ پر مشتمل تھے۔ میثاق مدینہ کی رو سے اپنا حلیف بنا لیا تھا۔ لیکن یہود ایک موقعہ شناس اور عہد شکن قوم ہے۔ جو سازشوں میں مصروف رہتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی بالادستی تو انہوں نے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن بنی اسرائیل سے نہ ہونے کی وجہ سے یہودی آنحضرت ﷺ سے کینہ رکھتے تھے۔ ان کی سود خوری اور سرمایہ پرستی کی عادت نے بھی انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام سے متنفر کر دیا تھا۔ انہوں نے

(۱) جنگ بدر کے بعد قریش سے خفیہ ساز باز شروع کر دی۔

(۲) مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے اوس و خزرج کی دیرینہ عداوتوں خصوصاً جنگ بُعاث کے تذکرے چھیڑ کر انہیں آپس میں لڑانے کی کوشش کی اور رسول اللہ ﷺ کی بروقت مدافعت سے یہ فتنہ فرد ہوا۔

غزوہ بنو قینقاع:

ان میں بنو قینقاع زرگر اور سود خور سب سے زیادہ مال دار اور اس طرح مغرور بھی تھے۔ جنگ بدر کے فوراً بعد کا واقعہ ہے کہ ایک انصار عورت دودھ بیچنے ان کے محلہ میں گئی۔ چند یہودیوں نے اس سے زیادتی کی اور اسے ننگا کر دیا۔ عورت چلائی تو ایک مسلمان نے ان شرارتیوں کے سرغنہ کو قتل کر دیا۔ یہودیوں نے مل کر اس مسلمان کو بھی قتل کیا اور بلوہ عام بھی کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے سمجھانے کوشش کی تو اُلٹا کہنے لگے۔ ''بدر میں تمہیں اس قوم سے پالا پڑا ہے جو جانتے ہی نہیں کہ جنگ کیا چیز ہے؟ ہم سے پالا پڑا تو سمجھ لگ جائے گی۔ اور ساتھ ہی معاہدے کا کاغذ بھی واپس کر دیا۔ یہ گویا ان کا جنگ کے لیے الٹی میٹم تھا۔

بالآخر حضور ﷺ نے جنگ کی تیاری کر لی۔ یہود قلعہ بند ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا جو پندرہ دن جاری رہا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے حضور ﷺ کے حکم پر رضا[1] دے دی۔ آپ ﷺ نے انہیں جلاوطنی کا حکم دیا۔ یہ سات سو اشخاص تھے جن میں ۳۰۰ زرہ پوش تھے۔ یہ لوگ شوال میں مدینہ سے نکل کر شام کے علاقہ میں جا بسے ملاحظہ فرمایئے کہ مفتوح قوم سے کیا سلوک کیا گیا۔

غزوہ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ:

سریہ بئر معونہ (صفر ۴ھ) ۶۹ عالمان دین قبائل رعل و ذکوان نے دھوکا سے شہید کر دیئے صرف ایک صحابی عمرو بن امیہ ؓ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے راستہ میں بنو عامر کے ۲ آدمی قتل کر دیئے۔ ان کا خونبہا ادا کرنا تھا۔ میثاق مدینہ کی رو سے آپ ﷺ یہود کے پاس گئے اور مصارف کے حصہ کا مطالبہ کیا۔ یہود نے سازش کی اور ایک آدمی عمرو بن جحاش کو

---

[1] عبداللہ بن ابی منافق یہود کا حلیف تھا۔ اسی نے حضور ﷺ سے سفارش کی کہ انہیں اور کوئی سزا نہ دی جائے صرف جلاوطن کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی بات کو قبول کر لیا۔

اس ارادہ سے مکان پر چڑھایا کہ اوپر سے پتھر پھینک کر آپ کو ہلاک کر دے آپ ﷺ کو بذریعہ وحی اس صورت حال کی اطلاع ہوگئی۔ آپ ﷺ فوراً ساتھیوں سمیت واپس مدینہ چلے آئے۔

یہود کو اپنی اس سازش کی ناکامی کا دکھ ہوا۔ اب انہوں نے بغاوت کی تیاری کر کے دوسری سازش یہ کی کہ حضور ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ ۳۰ آدمی ساتھ لے کر ہمارے پاس آئیں۔ اگر ہمارے علمائے یہود نے تصدیق کر دی تو ہم بھی اسلام لے آئیں گے۔ حضور ﷺ کو دال میں کالا معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے کہا۔

"جب تک ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں اعتبار نہیں کروں گا"۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

اب بگڑے ہوئے حالات سامنے تھے۔ آپ ﷺ نے پہلے بنو قریظہ سے تجدید معاہدہ کے لیے کہا وہ مان گئے۔ پھر بنو نضیر سے کہا لیکن وہ پھر بھی نہ مانے البتہ اپنا مطالبہ جاری رکھا اور وہی پیغام دوبارہ بھیج دیا۔ آپ ﷺ کو کسی کا اسلام لانا، بہت مرغوب تھا۔ آپ ﷺ تیار ہو بھی گئے۔ لیکن راستہ میں یقینی خبر مل گئی کہ یہود تلواریں سونت کر تیار بیٹھے ہیں لہذا آپ ﷺ واپس آگئے۔

انہی دنوں بنو نضیر اور عبداللہ بن ابی...... نے "اتحاد کر لیا" اور آپس میں ایک دوسرے کی امداد کے معاہدے طے پا گئے۔ لہذا اب جنگ ناگزیر ہوگئی۔

آپ ﷺ نے ربیع الاول ۴ھ میں بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا جو پندرہ دن تک جاری رہا۔ بالآخر بنو نضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ ہتھیاروں کے علاوہ جس قدر مال اسباب اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں، لے جائیں۔ حضور ﷺ نے یہ شرط مان لی۔ ان میں سے بڑے بڑے رؤساء نے تو خیبر کا رُخ کیا اور باقی شام کی طرف چلے گئے۔

بنو نضیر اتنے حریص واقع ہوئے تھے کہ اپنے مکانات اپنے ہاتھوں منہدم کر کے ان کے شہتیر اور کڑیاں تک اونٹوں پر لاد کر لے گئے اس غزوہ میں بھی فیصلہ بنو نضیر کی اپنی پیش کی ہوئی شرط کے مطابق ہوا۔ بتلایئے مفتوح قوم سے کیا ناروا سلوک ہوا؟

غزوہ بنو قریظہ:

اس غزوہ کا حال پہلے اسیرانِ جنگ سے سلوک کے تحت مفصل لکھا جا چکا ہے۔ اس

غزوہ میں بھی فیصلہ ان کے اپنے پسندیدہ ثالث نے کیا تھا۔ جس کی بنا پر یہ لوگ قتل ہوئے اور اسیر بنائے گئے۔

غزوۂ خیبر:

خیبر یہود کی قوت کا مرکز بن چکا تھا حیی بن اخطب کا قتل اور بنو نضیر کی جلاوطنی کا صدمہ ان کو کسی صورت نہ بھولتا تھا۔ انہوں نے قبیلہ غطفان سے گٹھ جوڑ کیا قبائل عرب کو ساتھ ملایا۔ جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور بھاری جمعیت اکٹھی کر لی۔

حضور ﷺ ۱۴۰۰ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خیبر کو نکلے۔ یہود قلعہ بند ہو گئے۔ ان کا مضبوط ترین قلعہ قموص سر ہونے میں نہ آتا تھا۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں سر ہوا۔ یہود کا بہادر سردار مرحب بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بعد میں باقی قلعے بھی سر ہوئے۔ اور اس طرح بیس دن کے محاصرہ کے بعد خیبر مکمل طور پر فتح ہوا۔

اس معرکہ میں یہود کے ۹۳ آدمی کام آئے جنگ کے بعد کوئی اسیر قتل نہیں کیا گیا۔

یہود کو کامل امن دیا جا چکا تھا اور ہر قسم کی مراعات سے نوازا گیا لیکن یہود پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ فتح کے بعد حضور چند یوم یہاں ٹھہرے۔ اس دوران سلام بن مشکم کی بیوی زینب نے آپ ﷺ کی دعوت کی۔ اس نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے ایک لقمہ کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ ﷺ کے ساتھیوں میں بشیر بن براء زیادہ کھا چکے تھے جو تین دن بعد شہید ہو گئے۔

آپ ﷺ نے زینب سے صورت حال پوچھی تو اس نے اقبال جرم کر لیا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ایک گہری سازش تھی جس میں سارے یہود شریک تھے۔ آپ ﷺ نے یہود سے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے "اس لیے کہ اگر پیغمبر ہیں تو آپ ﷺ پر زہر اثر نہیں کرے گا اور اگر نہیں تو ہم آپ ﷺ سے نجات پا جائیں گے۔ آپ ﷺ چاہتے تو اس سازش میں شریک تمام یہود کو قصاص کی بنا پر قتل کر سکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے پھر بھی درگزر سے کام لیا۔ البتہ بشیر بن براء کے قصاص میں زینب کو قتل کر دیا گیا۔ جو یہ زہر آلود گوشت کھانے سے وفات پا گئے تھے۔

خیبر کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی ان سے معاہدہ یہ ہوا تھا۔ کہ وہ یہاں سے نکل جائیں۔ ان کے جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن بعد میں انہوں نے پھر

درخواست کردی۔ کہ انہیں اپنی زمینوں پر قابض رہنے دیا جائے جلاوطن نہ کیا جائے۔ اور پیداوار کا نصف بٹائی کے طور پر ادا کر دیا کریں گے۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ درخواست بھی مان لی۔

تو یہ تھا حضور اکرم ﷺ کا اس مفتوح قوم سے سلوک جو ہر وقت سازشوں میں مصروف رہی۔ کئی بار آپ ﷺ کی جان لینے کے منصوبے بنائے۔ اور ہر بار عہد شکنی کرتی رہی۔

پھر مسلمانوں کے انصاف کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو حصہ پیداوار وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ پیداوار کے دو حصے کرتے پھر انہیں اختیار دیتے کہ جو چاہے لے لو۔ یہود ان کی رواداری اور انصاف سے متاثر ہو کر کہتے کہ زمین آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہے۔

تو یہ تھا اسلام کا مفتوح اقوام سے سلوک۔ اور جو سلوک عصر حاضر کی مہذب اقوام اپنے مفتوحین سے کرتی ہیں اس کا حال اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۹) قوانین صلح

صلح کی کئی صورتیں ہیں مثلاً:۔

پہلی صورت:

معرکہ کارزار گرم ہونے سے پیشتر اگر حریف شرط نمبر ۲ یعنی جزیہ کی ادائیگی کی شرط قبول کر لیتا ہے تو ایسی معاہد قوم سے صرف جزیہ ہی لیا جائے گا۔ اس طرح اگر کوئی فریق مخالف معرکہ کارزار گرم ہونے سے پہلے یہ شرط مان لیتا ہے تو اس سے بھی اس شرط پر معاہدہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ نجران کے عیسائیوں سے ہوا۔ جس کا متن یہ ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم. من جانب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنام ابوحارث بشمول نجران کے دیگر پادری راہب اور کاہن:۔

(۱) سب اپنی اپنی جائداد کے خود مالک ہیں۔

(۲) ان کے گرجے۔ عبادت خانے اور خانقاہوں کی حفاظت رسول اللہ کے ذمے ہے۔

(۳) ان کے پادری اور راہبوں کو ان کے طریق عبادت اور کاہنوں کو ان کے کام سے نہ ہٹایا جائے گا اور نہ ہی ان کے حقوق میں مداخلت کی جائے گی ان امور پر ایفائے عہد کی ذمہ داری بھی اللہ اور رسول پر ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیے ہوئے

معاہدے کی خود بھی پابندی کریں۔ اور ہماری خیر طلبی پر قائم رہیں۔ تب انہیں مزید کسی قسم کی زیرباری سے دوچار نہ کیا جائے گا اور نہ ہی ان پر کسی قسم کا ظلم روا رکھا جائے گا۔

(اساس طبقات ابن سعد ج ۲۔ وفود اهل اليمن)

دوسری صورت:

معرکہ کارزار گرم ہونے کے بعد جب دشمن کو اپنی شکست نظر آنے لگے۔ اور وہ خود صلح کی پیشکش کرے۔ اس صورت میں شرائط فریقین کی باہمی رضامندی سے طے ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بیشتر غزوات یہود میں ہوا۔ اور بالعموم انہی کی پیش کردہ شرائط تسلیم کی جاتی رہیں۔

تیسری صورت:

بزور شمشیر فتح ہو جانے کے بعد مفتوح قوم سے معاہدہ۔ اس صورت میں فاتح قوم کے اختیارات بڑھ جاتے ہیں۔ مفتوح قوم کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ پر پورا تصرف ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو اس ملک کو اپنی تحویل میں لے لے۔ جس طرح آج کل کی حکومتیں بندر بانٹ کرتی ہیں اور چاہے تو زمین سابقہ مالکان کے پاس رہنے دے اور ان سے بٹائی کا حصہ مقررہ شرح سے لگان (خراج) وصول کرے اور زمین سابقہ مالکان کے پاس رہے۔ اور چاہے۔ تو اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہو جائے جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا تھا۔

یہ زمینوں کا معاملہ تھا۔ کئی سرایا میں اموالِ غنیمت بھی حضور ﷺ نے واپس کر دیے تھے اور اسیرانِ جنگ سے آپ ﷺ کی فیاضی کا حال پہلے مفصل طور پر لکھا جا چکا ہے۔

جزیہ اور خراج:

عرب کی ہمسایہ اور متمدن حکومت ایران میں دو قسم کے ٹیکسوں کا رواج تھا۔ ایک زمین کا لگان جو صرف زمینداروں سے لیا جاتا تھا۔ اور اسے یہ لوگ خراگ کہتے ہیں۔ خراج کا لفظ اسی سے معرب ہے۔ دوسرا ٹیکس جو عام لوگوں سے دفاعی ضروریات کے پیش نظر لیا جاتا تھا۔ جسے یہ لوگ گزیت کہتے تھے۔ جزیہ اسی لفظ سے معرب ہے۔

مسلمانوں نے جب یہ علاقے فتح کیے۔ تو انہوں نے مفتوح قوم پر کوئی نیا بار نہیں ڈالا۔ بلکہ وہی دونوں قسم کے ٹیکس ہی مفتوح قوم پر عائد کیے گئے جو شاہ ایران اپنی رعایا سے وصول

کرتا تھا۔ بلکہ جنگ کے موقع پر جزیہ کے علاوہ ٹیکس بھی ان سے وصول کیے جاتے تھے۔

جزیہ کے عوض اسلامی حکومت تمام دفاعی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتی ہے۔ چونکہ یہ ٹیکس دفاع سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا غیر مقاتل افراد یعنی بچے بوڑھے، عورتیں معذور، صوفی اور گوشہ نشین قسم کے حضرات اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ایسی زبردست اقوام جو جزیہ ادا کر کے دفاعی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتی ہیں۔ اہل ذمہ کہلاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل ذمہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

زمین کا لگان مسلمانوں سے بھی وصول کیا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو لگان مسلمانوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ اس کا نام عشر ہے۔ جو زکوٰۃ کی ایک مد ہے اور جو لگان مفتوح اقوام سے وصول کیا جاتا ہے اس کا نام خراج ہے۔ گویا اسلام مفتوح اقوام پر کسی قسم کا ناجائز اقتصادی بوجھ ڈالنے کا روادار نہیں۔

زکوٰۃ اور خراج کا فرق:

تاہم جزیہ اور خراج اور زکوٰۃ میں چند بنیادی فرق بھی ہیں مثلاً:۔

(۱) زکوٰۃ کی شرح جو رسول اللہ ﷺ نے مقرر کی وہ شریعت کا حصہ ہے۔ اس شرح میں رد و بدل ممکن نہیں۔ جبکہ جزیہ اور خراج کی شرح مقرر کرنے کا اختیار ہر امام وقت کو ہوتا ہے۔ اور اسے یہ اختیار بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک ہی وقت میں کسی مخصوص علاقہ میں یہ شرح زیادہ رکھے اور دوسرے میں کم۔ سفیان بن عیینہ عبداللہ بن نجیح سے روایت کرتے ہیں۔

((قلت لمجاهد ماشان اهل الشام عليهم اربعة دنانير واهل اليمن عليهم دينار قال جعل ذلك من قبل اليسار))

(میں نے مجاہد سے پوچھا شام کے کافروں سے تو (سال میں) چار دینار لیے ہیں۔ اور یمن کے کافروں سے صرف ایک لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا اس لیے کہ شام کے کافر زیادہ مالدار ہیں۔)

(بخاری۔ کتاب الجهاد۔ باب الجزية الموادعة)

جزیہ کی شرط کی مختلف شکلیں:

ایران اور مصر کی متمدن حکومتیں عوام سے گزیت یا جزیہ قسم کا ٹیکس بھی لے لیتی تھیں اور

پھر ان سے طوعاً یا کرہاً فوجی خدمات بھی لیا کرتی تھیں۔ اسلام میں جزیہ چونکہ دفاعی اخراجات کے عوض لیا جاتا ہے لہٰذا اگر کوئی قوم یا ملک اپنی فوجی خدمات پیش کردے تو وہ جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی جزیہ ادا کرے تو اس سے فوجی خدمت نہیں لی جاسکتی۔ اور اگر مسلمان انہیں تحفظ مہیا نہ کرسکیں تو انہیں جزیہ واپس کرنا ہوگا۔ تفصیل کے لیے ذیل کے واقعات ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) جنگ اصفہان میں (۲۱ھ) اسلامی لشکر کے سالار عبداللہ بن عبداللہ تھے اور ایرانیوں کی طرف سے قاذوستان سالارِ لشکر تھا۔ قاذوستان نے عبداللہ کو دعوتِ مبارزت دی۔ پہلے خود تلوار کا وار کیا۔ عبداللہ نے اس پامردی سے اس کے وار کا دفاع کیا کہ بے اختیار قاذوستان کے منہ سے آفریں نکل گئی اور کہا میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ بلکہ شہر اس شرط پر حوالہ کرتا ہوں کہ باشندوں میں سے جو چاہے جزیہ دے کر شہر میں رہے اور جو چاہے نکل جائے۔ عبداللہ نے یہ شرط منظور کرلی اور صلح نامہ لکھ دیا۔ (الفاروق ص ۲۳۹)

(۲) طبرستان کے ضلعی شہر جرجان کے رئیس مرزبان نے مسلمانوں کے سالار سوید سے صلح کرلی اور معاہدہ میں بتصریح لکھ دیا کہ "مسلمان جرجان اور دہستان وغیرہ کے امن کے ذمہ دار ہیں۔ اور ملک والوں میں جو لوگ بیرونی حملوں کے روکنے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے وہ جزیہ سے بری ہیں۔

(۳) جرجان کی خبر سن کر طبرستان کے رئیس نے بھی جو شہسوار کہلاتا تھا۔ اس شرط پر صلح کرلی کہ پانچ لاکھ درہم سالانہ دیا کرے گا اور مسلمانوں کو ان پر یا ان کو مسلمانوں پر کچھ حق نہ ہوگا۔ (ایضاً ص ۲۴۳) گویا اس صلح نامہ سے زیردستی کا مسئلہ بھی ختم ہوگیا۔

(۴) آذربائی جان کی فتح کے بعد باب متصل کا رئیس شہر براز خود مسلمانوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں تمہارا مطیع ہوں لیکن میری درخواست ہے کہ مجھ سے جزیہ نہ لیا جائے بلکہ جب ضرورت پیش آئے تو فوجی امداد لی جائے۔

چونکہ جزیہ درحقیقت صرف محافظت کا معاوضہ ہے۔ اس لیے شرط منظور کرلی گئی۔

(ایضاً ص ۲۴۳)

(۵) عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جب فسطاط فتح کیا تو مقوقس والئ مصر نے جزیہ کی بجائے یہ شرط منظور کی کہ فوج اسلام جدھر رُخ کرے گی سفر کی خدمت (یعنی راستہ صاف کرنا، سڑک بنانا، پل باندھنا وغیرہ) ۔مصری انجام دیں گے۔ چنانچہ عمرو بن عاص جب رومیوں کے مقابلے کے لیے اسکندریہ کی طرف بڑھے تو خود مصری منزل بہ منزل پل باندھتے، سڑک بناتے اور بازار لگاتے گئے۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کے سلوک نے تمام ملک کو گرویدہ کرلیا تھا اس لیے قبطی خود بڑی خوشی سے ان خدمتوں کو سرانجام دیتے تھے۔ (الفاروق ص ۳۹۴)

(۶) شام کی فتوحات کے سلسلہ میں جنگی مقاصد کے پیش نظر اسلامی سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو حمص سے واپس جانا پڑا تو آپ رضی اللہ عنہ نے ذمیوں کو بلا کر کہا۔ ''ہمیں تم سے جو تعلق تھا وہ اب بھی ہے۔ لیکن اب چونکہ تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں لہٰذا تمہارا جزیہ تمہیں واپس کیا جاتا ہے''۔ چنانچہ کئی لاکھ کی وصول شدہ رقم واپس کردی گئی۔ عیسائیوں کو اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے تورات کی قسم کھا کر کہا۔ کہ جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کرسکتا یہ کہہ کر شہر پناہ کے دروازے بند کرلیے اور ہر جگہ چوکی کا پہرہ بٹھا دیا۔
(الفاروق ص ۱۹۱)

ان واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے۔ کہ جزیہ کی وصولی سے مقصود مفتوح قوم کو ذلیل کرنا ہرگز مقصود نہ تھا (جیسا کہ اہل مغرب نے تاثر دیا ہے) بلکہ اس کی حیثیت محض دفاعی ٹیکس کی تھی۔ اور وہ بھی اس پر جو اسے بخوشی قبول کرے۔

جزیہ اور خراج کی شرح اور وصولی میں نرمی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دو باتوں کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔

(۱) جزیہ یا خراج کی شرح ایسی ہو کہ وہ آسانی سے ادا کرسکیں۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی مفتوحہ زمینوں پر خراج کی تعیین کے لیے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ جیسے اکابرین صحابہ رضی اللہ عنہم کو مقرر کیا۔ جو اس فن میں کافی ماہر تھے۔ جب

ان بزرگوں نے یہ حساب پیش کیا تو آپ نے ان دونوں کو بلا کر کہا کہ تم نے تشخیص میں سختی تو نہیں کی؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ نہیں بلکہ اسی قدر اور گنجائش ہے"۔ (کتاب الخراج ص ۲۱)

(۲) اس پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ احتیاط تھی کہ ہر سال جب عراق کا خراج آتا تو دس ثقہ اور معتمد اشخاص کوفہ سے اور اتنے ہی بصرہ سے طلب کیے جاتے۔ حضرت عمرؓ ان کو چار دفعہ شرعی قسم دلاتے کہ یہ مالگزاری کسی ذمی یا مسلمان پر ظلم کر کے تو نہیں لی گئی ہے"۔ (الفاروق ۳۱۶) جنگ کے بعد تاوان جنگ کا مسئلہ بھی قدیم سے چلا آتا ہے۔ پچھلی چند صدیوں میں تاوانِ جنگ کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی غلامی پر بھی مفتوح اقوام کو مجبور کیا جاتا رہا۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے سیاسی غلامی کو متروک قرار دے کر اس کے بدلے مہذب اقوام نے اقتصادی غلامی کے بندھن مضبوط تر کر دیئے ہیں۔ اسلام نے جزیہ کی ادائیگی کے بعد نہ تاوانِ جنگ عائد کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور نہ کسی طرح کی اقتصادی غلامی کی۔

مسلمان اور شکست؟

مسلمان اگر فی الواقع مسلمان ہے۔ تو وہ شکست سے نا آشنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ (اگر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب ہو گے۔) (۱۳۹/۳)

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا:۔

﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (اور جو کوئی اللہ کے راستہ میں لڑائی کرے۔ پھر خواہ مارا جائے یا غالب آجائے تو ہم اس کو بہت بڑا اجر دیں گے۔) (۷۴/۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو صورتوں کے علاوہ مسلمان کے لیے تیسری کوئی صورت نہیں۔ راہ فرار اختیار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اور شکست اس کے تصور میں ہے ہی نہیں لیکن

مسلمان اس وقتی شکست کو بھی برداشت نہیں کرتا تا آنکہ فتح نہ پالے۔

مسلمانوں کی طرف سے صلح:

میدانِ جنگ میں مسلمان کو کسی وقت بھی بزدلی کا مظاہرہ نہ کرنا چاہیے۔ اور نہ حوصلہ ہارنا چاہیے۔ وہ یہ بھی نہیں کرسکتا۔ کہ اپنے یا فوج میں کمزوری محسوس کرنے لگے تو دشمن کو صلح کی پیشکش کردے۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ (۳۵/۴۷)

(بزدلی نہ دکھاؤ اور صلح کے لیے نہ پکارنے لگ جاؤ تم ہی غالب رہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے۔ وہ ہرگز تمہارے اعمال کو کم (رائیگاں) نہ کرے گا۔)

گویا مسلمان کو یہ حکم ہے کہ وہ آخر دم تک لڑائی جاری رکھے، نہ فرار کی بات سوچے اور نہ دشمن سے صلح کی۔ یا فتح حاصل کرے یا خود ختم ہو جائے بقول شاعر۔

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تخت جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کا

غیر مسلم کی اطاعت:

آج کے ماہرین حرب لڑائی کا ایک اہم اصول "تا دم آخر" بھی بیان کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آخری سپاہی کو آخری گولی تک لڑنا چاہیے۔ غالباً یہ اصول آیاتِ بالا سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام کسی صورت غیر مسلم حکومت کی اطاعت کی اجازت نہیں دیتا ارشاد باری ہے:۔

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ (۵۲/۲۵)

(کافروں کی اطاعت مت کرو اور پوری قوت کے ساتھ ان سے جہاد کرو۔)

دورِ نبوی ﷺ میں دو موقعوں پر شکست کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ گو بعد میں فتح ہوگئی۔ تاہم ان مواقع پر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ جنگ احد میں شکست کے اسباب قرآن کریم نے یہ بیان کیے ہیں:۔

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ (اور اللہ تعالیٰ نے تو اپنا (فتح کا) وعدہ پورا

بِاِذْنِہٖ حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَصَیْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا اَرٰکُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْکُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ ثُمَّ صَرَفَکُمْ عَنْھُمْ لِیَبْتَلِیَکُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْکُمْ وَاللّٰہُ ذُوْفَضْلٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۱۵۲/۳)

کر دیا۔ جب تم کافروں کو اس کے حکم سے بے دریغ قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے اللہ تعالیٰ نے تم کو دکھا دیا۔ پھر تم نے ہمت ہار دی اور کام میں تنازعہ پیدا کیا اور اس کی نافرمانی کی۔ بعض تو تم میں سے دنیا کے خواستگار تھے اور بعض آخرت کے طالب۔ اس وقت تم کو ان (کے مقابلے) سے پھیر (کر بھگا) دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔)

اس آیت میں فتح ہونے کے بعد مسلمانوں کی شکست کے تین اسباب بیان کیے گئے ہیں:۔

(۱) انہوں نے اطاعت امیر سے سرتابی کی۔ رسول اکرم کی بھی اور عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی بھی۔

(۲) حکم مل جانے کے بعد اجتہاد شروع کر دیا۔ پھر آپس میں جھگڑا کیا۔ اس طرح اصل مقصد کے حصول میں کمزوری پیدا ہو گئی۔

(۳) بعض لوگوں کو مال غنیمت کے حصول کی کوشش نے اصل مقصد سے غافل کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے کے بعد انہیں معاف بھی فرما دیا تاکہ شکستہ دل نہ ہوں اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر لیں۔

اور جنگ حنین میں قرآن کریم کے الفاظ کے مطابق شکست کا سبب درج ذیل تھا۔

﴿وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْکُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾ (۲۵/۹)

(اور حنین کے دن (بھی اللہ نے تمہاری مدد کی) جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا۔ اور وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی۔)

گویا اس جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا اصل سبب مادی وسائل پر تکیہ کر لینا تھا۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی اکثریت کو شکست بھی ہو سکتی

ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے توکل کے خلاف تھی۔ اسلامی نظریہ کے مطابق گو مادی وسائل سے بھرپور استفادہ بھی بہت ضروری ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر توکل اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جس کے سامنے بعض دفعہ مادی وسائل ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۲۴۹/۲) (اور کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آ گئی۔)

ان تصریحات سے بتانا یہ مقصود ہے کہ مسلمان کو شکست صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب وہ اصول وقوانین جنگ یا اخلاقی اقدار میں سے کسی قدر سے غافل ہو جاتا ہے پھر جب مسلمانوں میں اخلاقی اور عملی طور پر انحطاط واقع ہو گیا۔ تو ان کو بھی ایسے ہی شکستوں سے دوچار ہونا پڑا جیسے دوسری اقوام کو ہوتا ہے۔ علماء وفقہاء اسلام اس بات پر متفق ہیں۔ کہ اگر مسلمان اپنے سے دوگنا جماعت کے مقابلہ سے جی چرائیں یا ان کے آگے ہتھیار ڈال دیں تو انہیں اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیے۔ اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:۔

﴿اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾ (۶۶/۸)

(اب اللہ تعالیٰ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا۔ اور معلوم کر لیا کہ تم میں کسی قدر کمزوری ہے۔ پس اگر ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے، اور اگر ایک ہزار ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کا مددگار ہے۔)

شکست مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت بھی ہے اور چیلنج بھی۔ انہیں اپنے اسلام کی فکر کرنا چاہیے۔ شکست کے بڑے اسباب قومی یکجہتی کا فقدان، جہاد سے غفلت یا نفرت اور مال ودولت سے محبت ہیں جن کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے اور یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اگر تم ان باتوں میں مبتلا ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے مسلمان کہلانے کی بنا پر کوئی لحاظ نہیں کرے گا بلکہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا جو مندرجہ بالا اوصاف میں تم سے بہتر ہو گی۔

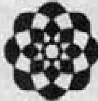
شکست کے بعد مسلمان کا کافروں کی قید میں چلا جانا ذلت پر مزید ذلت ہے اور اسلام

کی رسوائی کا سبب۔ جونسا بھی طریق اختیار کرنا پڑے قیدیوں کو جلد از جلد چھڑانا چاہیے۔ حضور اکرمؐ نے اس کے لیے بہت تاکید فرمائی ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نظریہ جنگ کے مطابق شکست ایک غیر مترقبہ حالت ہے جسے غیر معمولی مجبوری کی حالت میں ہی برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا سپہ سالار کے لیے یہی مناسب ہے کہ اگر اس کی افواج حصول فتح کے لیے ناکافی ہوں تو اسے جنگ سے احتراز کرنا چاہیے۔ اگر اسے شکست نظر آ رہی ہو تو پیچھے ہٹ جائے اور باقی ماندہ مسلمانوں کی جانیں بچائے۔ شکست خوردہ مسلمان برابر ارادہ رکھتے تھے۔ کہ جنگ پھر کریں گے خواہ اس کے لیے کتنی ہی مدت انتظار کرنا پڑے پھر اسلام میں دنیوی جنگیں شروع ہو گئیں تو فتح و شکست کا فیصلہ جہاد کی طرح مقاصد کی حقانیت پر نہیں بلکہ فوجوں کی ہمت استقامت اور سپہ سالاروں کی تدبیروں پر ہونے لگا۔ ایسی جنگوں میں شکست بھی گناہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ خواہ مقابل حکمران مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں پر خدانخواستہ کوئی افتاد آ پڑے اور امیر کو بحالت مجبوری دشمن سے صلح کرنا پڑے تو اس صلح کی مدت صلح حدیبیہ سے کم ہونی چاہیے۔ اور ساتھ ہی جہاد کی تیاری شروع رکھنا چاہیے۔ تاکہ مدت پوری ہونے پر جہاد شروع کیا جا سکے۔ اگر پھر بھی امیر کو یہ محسوس ہو کہ لڑنے کی قوت پیدا نہیں ہوئی، تو اتنی ہی مدت کے لیے معاہدہ کی تجدید ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ مدت کے لیے صلح کی تو کالعدم سمجھی جائے گی۔

(کتاب الام لامام شافعی ج ۴ ص ۱۱۰ بحوالہ اسلام اور قانون جنگ و صلح ص ۱۳۹۔۱۴۰)



باب ہفتم

اسلامی اور بین الاقوامی قوانین جنگ کا تقابل

پچھلے باب میں ہم نے اسلامی قوانین صلح و جنگ مختصراً بیان کر دیئے ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ اسلامی قوانین، خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، ان کا ماخذ قرآن و سنت کے بعد صحابہ کا تعامل ہے۔

بین الاقوامی قانون کا آغاز:

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ صلح و جنگ سے متعلق بین الاقوامی یا بین الملی قانون INTER NATIONAL LAW کیا ہے۔ اور اس کے ماخذ کون کون سے ہیں؟

سترھویں صدی عیسوی سے قبل یورپ میں بین الاقوامی قوانین صلح و جنگ کا تصور تک موجود نہ تھا۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ۱۶۱۸ء میں جب یورپ میں جنگ سہ سالہ چھڑی۔ تو اس میں وحشت و بربریت کے وہی مظاہرے ہوئے جو دورِ جاہلیت میں رائج تھے اور ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت جنگ، جنگ میں بہیمانہ طور پر قتل و غارت اور لوٹ مار، قیدیوں کا قتل یا زندگی بھر کے لیے غلامی اور پھر ان سے انسانیت سوز سلوک یہی کچھ یورپ میں اس وقت تک رائج تھا۔ اس وحشت و بربریت نے کچھ درد مند لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا کہ اس وحشت و بربریت کو ختم کرنے کے لیے جنگ کے لیے کچھ اخلاقی ضوابط مقرر کیے جانے چاہئیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش ہالینڈ کے ایک درد مند گروتیوس GROTIUS نے کی۔ اس نے ۱۶۲۵ء میں ایک کتاب (DEJURE BALLIAC PACIS) شائع کی۔ جس میں جنگ کے اخلاقی ضوابط پیش کیے گئے تھے۔ جن کی حیثیت محض سفارشات کی تھی۔

اہل یورپ مذہب سے تو پہلے ہی بیزار تھے، مسیحیت میں انہیں مذہب کی طرف سے ایسے قوانین کی کچھ رہنمائی بھی نہیں مل سکتی تھی۔ لہٰذا گروتیوس کی اس کتاب کو قبول عام حاصل ہوا۔

اور یہ کتاب ہائیڈل برگ کی یونیورسٹی میں بطورِ نصاب شامل کر لی گئی۔

بعد ازاں دوسرے مصنفین اور سیاسی مدبّرین نے تصنیفات، رسائل اور مضامین کے ذریعہ گروٹیوس کے مشن کی آبیاری کی اور اسے مزید آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

بین الاقوامی قانون کے ماخذ:

آج کا بین الاقوامی قانون دو اقسام پر مشتمل ہے۔ پہلی قسم تحریری یا مدوّن (WRITTEN) ہے۔ جو مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہیں۔

(۱) اخلاقی گروہ یا سیاسی مُدبّرین کے افکار و تصانیف جن کا اوپر ذکر ہو چکا۔

(۲) مختلف اقوام کے آپس میں باہمی سمجھوتے اور تحریری معاہدات جن کی رُو سے جنگ کے لیے ضوابط طے کر لیے گئے ہیں۔

(۳) مختلف امن کانفرنسوں میں پیش یا پاس ہونے والی تجاویز، جو مختلف ادوار میں جنیوا' ہیگ اور دوسرے مقامات پر منعقد ہوتی رہیں۔

بین الاقوامی قانون کی دوسری قسم غیر مدوّن یا بے لکھی (UN WRITTEN) ہے۔ جو متحارب قوموں کے باہمی معاملات اور عملی سیاسیات سے عبارت ہے۔

ان دونوں مندرجہ اقسام میں سے کون سی قسم زیادہ معتبر یا مستند ہے اور اختلافات کی صورت میں حجت بننے کی صلاحیت کس میں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا آج تک کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قانونی گروہ یا قانون کے مدوّن کرنے والے ایک مہذب قاعدہ وضع کرتے ہیں تو فوجی گروہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور چونکہ عمل کی تمام قوتیں فوجی گروہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ اس لیے کتابوں میں لکھا ہوا قانون کتابوں میں دھرا رہتا ہے۔ اور اصلی قانونِ جنگ وہ ہوتا ہے۔ جس کو فوجیں خود اپنے عمل سے میدانِ جنگ میں وضع کرتی ہیں۔

فوجی گروہ یہ کہتا ہے۔ کہ جنگ کو کسی ضابطہ اور قانون کے تحت لانا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ جنگ اور قانون میں ایک فطری تناقض ہے۔ جنگ قانون کی طبیعت کے عین خلاف ہے اور جنگ کا اصلی قانون وہ نہیں جو ہیگ اور جنیوا میں مرتب کیا گیا ہے بلکہ وہ ہے جسے میدانِ جنگ میں توپیں اور سنگینیں مدوّن کرتی ہیں۔

اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون کا بنیادی فرق:

اب دیکھئے اصلیت کے اعتبار سے اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون میں مندرجہ ذیل بنیادی امور میں فرق پایا جاتا ہے:۔

(۱) اسلامی قانون ایک بالاتر ہستی کا عطا کردہ ہے۔ لہٰذا کم از کم مسلمانوں کے لیے حجت ہے لیکن مغربی قانون انسانوں کا اپنا بنایا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ نزاع کی صورت میں کسی بھی فریق کے لیے قابل حجت نہیں ہوتا۔

(۲) مسلمان اسلامی قانون کے تابع ہو کر چلتا ہے مسلمانوں کو اس میں حذف و ترمیم کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ لیکن بین الاقوامی قانون میں چونکہ ہر وقت ردّ و بدل ممکن ہے۔ لہٰذا یہ قانون خود اقوام کی مرضی کے تحت چلتا ہے۔ اور جس چیز کو کوئی ''بڑی طاقت'' پسند نہیں کرتی وہ قانون سے حذف کر دی جاتی ہے۔

(۳) بین الاقوامی قانون صرف ان حکومتوں کے لیے حجت بن سکتا ہے۔ جنہوں نے معاہدہ پر دستخط کر دیے ہوں۔ یا تجاویز سے متفق ہوں۔ ان میں سے اگر ایک فریق اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو دوسرے کے لیے خلاف ورزی از خود جائز ہو جاتی ہے۔ جبکہ مسلمان کو متحارب فریق کی قانون شکنی سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ وہ بہرحال اسلامی قانون کی پابندی کرنے پر مجبور ہے۔

تقابل:

اسلامی اور بین الاقوامی قوانین کا تقابل کرنے کے لیے ہم انہیں درج ذیل اقسام میں بھی تقسیم کرتے ہیں۔

(ا) وہ قوانین جو ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔

(ب) وہ قوانین جو نظری اعتبار سے تو آپس میں ملتے جلتے ہیں لیکن عملی اعتبار سے متصادم ہیں۔

(ج) ایسے قوانین جو دونوں میں ملتے جلتے اور موافقت رکھتے ہیں۔

اسی ترتیب سے ہم یہ تقابل ذرا تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔

(ا) متصادم قوانین

(۱) جنگ کے اغراض و مقاصد:

ہم بتا چکے ہیں کہ یورپ میں ضوابط جنگ کی تدوین کا آغاز گروٹیوس کی مشہور کتاب (DEJURE BALLIAC PACIS) کی تصنیف سے ہوا تھا۔ اس کتاب میں مصنف نے جنگ کے جائز و ناجائز مقاصد میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن عہد جدید کے بین الاقوامی قانون نے اس سوال کو قطعاً خارج از بحث قرار دیا ہے۔ موجودہ دور میں مندرجہ ذیل مقاصد کو عملاً جنگ کے آغاز کے لیے جائز مقاصد سمجھا جاتا ہے۔

(۱) اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے دنیا کی ثروت کا اجارہ حاصل کرنا۔

(۲) اگر کوئی حریف تجارت وصنعت کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہو تو اس کا سر کچل دینا۔

(۳) اپنے دور دراز کے مقبوضات کے راستہ میں جو ممالک واقع ہوں انہیں اپنے زیر اثر رکھنا۔

(۴) ملکوں اور سلطنتوں کے حصے بخرے کرنا اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنانا۔

(۵) اگر کسی قوم سے دشمنی ہو جائے، خواہ کسی وجہ سے ہو تو اسے مٹا دینا یا کم از کم اس کا زور توڑ دینا۔

اس کی مثال حالیہ عراق امریکہ جنگ ہے۔ اس جنگ کے بڑے مقاصد جو سامنے آئے ہیں اول تو امریکہ خلیج کی ریاستوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ تیل کے تمام کنوؤں پر قبضہ کر سکے اور عرب ممالک میں ہر طرح اپنی من مانی کر سکے۔ اور دوسرا مقصد اسرائیل کے ناپاک پودے کو تناور درخت بنانا ہے۔ یہودی قوم دولت مند ہونے کے باوجود افرادی قوت کی قلت کا شکار ہے۔ پہلے پہل برطانیہ کے تعاون سے یہ ریاست وجود میں آئی۔ پھر امریکہ اس کا دست بازو بن گیا اور آج یہ عراق امریکہ جنگ بھی اسرائیل کو وسیع تر بنانے کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ تیسرا اور سب سے بڑا مقصد مسلمانوں کے مقدس مقامات حرمین شریفین پر ناجائز قبضہ کرنا ہے۔ امریکہ خلیج کی ان پانچ ریاستوں عراق، کویت، یمن، قطر اور سعودی عرب کو گیارہ ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ بلکہ ان کے امریکہ نواز حکمرانوں کے نام بھی سوچ رکھے

ہیں۔اس طرح امریکہ مسلمانوں کو انفرادی اور ملکی سطح پر ہر دو پلیٹ فارموں پر کمزور سے کمزور تر کرنا چاہتا ہے۔وہ مسلمان جو کہ شہادت کی تمنا کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترتے ہیں اور یہی چیز یہود و نصاریٰ کی نیندیں حرام کرنے کو کافی ہے۔

عراق پر قبضہ کرنا امریکہ کی منزل نہیں بلکہ منزل کے حصول کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس جنگ میں امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ جس طرح عراق کے عوام پر میزائل اور دوسرے ایٹمی ہتھیارات سے گولہ باری کر رہا ہے یہ انسانیت کے منہ پر بدنما داغ ہے۔ان حملوں میں بچے' بوڑھے' عورتیں اور نہتے عوام غرض کسی کی تمیز نہیں کی گئی۔امریکہ جو کہ ایک مہذب قوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے تمام دعووں کا پول کھل گیا ہے۔اس جنگ کا دینی' دنیاوی اور اخلاقی غرض کسی طور پر بھی کوئی جواز نہیں۔

یہ ہیں وہ مقدس حقوق جن کی بنا پر جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور مغربی اقوام کا تعامل انہیں جائز قرار دیتا ہے۔

اب دیکھئے اسلامی قانون مندرجہ بالا مقاصد میں کسی ایک مقصد کو جائز قرار نہیں دیتا اور ان اغراض کے تحت کی جانے والی جنگ کو فساد فی الارض قرار دیتا ہے۔اور اسی فساد فی الارض یا ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت لڑی جانے والی جنگوں کے خاتمہ کے لیے جہاد کو فرض قرار دیتا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے۔کہ اغراض و مقاصد جنگ کے لحاظ سے اسلامی قانون اور مغربی قانون آپس میں متصادم ہیں۔

جزیہ اور خراج کے بجائے اقتصادی تباہی:

اسلام مفتوح قوم سے جزیہ وصول کر کے اس ملک کے دفاعی اخراجات کا خود ذمہ دار بنتا ہے۔اس حفاظت میں قاصر رہے تو رقم واپس کر دیتا ہے۔جزیہ کی شرح کی تعیین لوگوں کی مالی حالت دیکھ کر نرمی کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔وصولی میں جبر کا قائل نہیں اور مفتوح قوم کے معذور افراد سے جزیہ لینے کی بجائے بیت المال ان کے وظائف مقرر کرتا ہے۔

یہی صورت حال خراج کی ہے۔اس کی شرح کی تعیین زمین کی پیداوار کو ملحوظ رکھ کر نہایت واجبی شرح عائد کرتا ہے اور وصولی میں کسی طرح کے جبر کا روادار نہیں۔فصل کا نقصان ہونے کی صورت میں خراج لینے کی بجائے اس کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔

یہ دونوں ٹیکس ویسے ہیں جو ہر ملک میں رعایا سے وصول کیے جاتے ہیں۔ حکومت خواہ اپنی ہو یا غیر قوم کی، یہ ٹیکس ہر قوم اور ہر ملک میں رائج ہیں۔ اور حکومتوں کے اخراجات کا بیشتر حصہ انہی ٹیکسوں سے پورا کیا جاتا ہے۔

اسلام نہ تو مفتوح اقوام پر کوئی ناجائز ٹیکس عائد کرتا ہے۔ نہ ہی انہیں اقتصادی طور پر کمزور یا مفلوج کرنے کا خواہش مند ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے۔ کہ ان کا زیر اثر حلقہ پھلے پھولے۔

مغرب کی مہذب اقوام جزیہ اور خراج جیسے ٹیکس عائد نہیں کرتیں۔ اور انہوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے جزیہ اور خراج پر اعتراضات کی بوچھاڑ بھی کی ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ اس پہلو میں مفتوح اقوام کے ساتھ ان کا اپنا کردار کیسا ہے۔

جنگ عظیم اول میں 1917ء میں فرانس اور روس میں ایک خفیہ معاہدہ ہوا کہ دریائے رہائن کے مغربی جانب کا تمام علاقہ جرمنی سے چھین کر فرانس کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا۔ رہائن کا یہ علاقہ نہایت زرخیز تھا۔ لہٰذا فرانس نے اس خفیہ معاہدہ کو اپنے دوستوں یعنی برطانیہ اور امریکہ وغیرہ سے بھی صیغۂ راز میں رکھا۔ جب اختتام جنگ کے بعد صلح کانفرنس یا معاہدہ میں تقسیم غنائم کا مسئلہ پیش ہوا تو امریکہ اور انگلستان نے ڈٹ کر فرانس کے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ آخر فرانس کے وزیر اعظم موسیو کلیمنشو نے یہ تجویز پیش کی کہ جرمنی پر جو تاوان جنگ عائد کیا گیا ہے۔ اس کی ضمانت کے طور پر رہائن کا علاقہ ۱۵ سال کے لیے فرانسیسی قبضہ میں دے دیا جائے۔ اس چال کو فرانس کے سیاست دان بھی نہ سمجھ سکے اور انہوں نے وزیر اعظم کی مخالفت کی تو وزیر اعظم صاحب نے جواب دیا کہ:۔

''۱۵ سال کی تعین کا مقصد یہ ہے۔ کہ جرمنی کے ہاتھ سے اس کے بہترین علاقے چھین کر اس پر اتنا تاوان ڈال دیا جائے کہ وہ اس کو مدت معینہ کے اندر ادا کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اور ہم پندرہ سال گزرنے کے بعد علاقہ رہائن کو ہمیشہ کے لیے ملحق کر لیں''۔ چنانچہ وزیر اعظم کی اس تجویز پر اپنوں اور بے گانوں سب کا اتفاق ہو گیا۔

دوسرا کام فرانس نے یہ کیا کہ پولینڈ کی نئی ریاست کا نقشہ کچھ اس طرح مرتب کر لیا کہ اس سے مشرقی پروشیا کا تعلق دولت پروشیا کے باقی علاقوں سے بالکل منقطع ہو گیا۔ اور ایسی

صورت پیدا کردی۔ کہ اگر جرمنی کسی وقت بھی جنگ عظیم کے مصائب سے افاقہ پائے تو افاقہ پاتے ہی سب سے پہلے فرانس کے بجائے پولینڈ سے الجھ جائے اور یہ بات فی الواقع پوری ہو کر رہی۔1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز آخر کار پولینڈ ہی پر جرمن کے حملہ سے ہوا۔

پھر جب 1922ء میں فرانس کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ جرمنی ان تمام پابندیوں کے باوجود 15 سال کے اندر رہائن کو واگزار کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تو اس نے اپنے شکار پر ایک ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا اور وہ یہ کہ جرمنی کے ایک دوسرے زرخیز علاقہ روہر پر فوج کشی کر کے اس پر مستقل قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ 1933 کی ابتدا ہی میں فرانس نے فوجیں بھیج کر جرمنی کو اس علاقہ سے محروم کر دیا۔ جس پر اس کی صنعتی اور معاشی زندگی کا تمام تر انحصار تھا۔

ہم اس مختصر جائزہ میں زیادہ مثالیں پیش نہیں کر سکتے۔ ورنہ خفیہ معاہدات اور تقسیم غنائم کا جو باب بھی آپ کھولیں گے آپ کو یہی کچھ نظر آئے گا۔ کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہوتے ہیں اور کھانے کے اور۔ ان کی نظری سیاست جتنی دلفریب نظر آتی ہے۔ عملی سیاست اتنی گھناؤنی نظر آئے گی۔ اسلام ایسی منافقت، دو عملی اور ڈپلومیسی کو کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے:۔

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ۔﴾ (۶۱:۳) (اللہ تعالیٰ اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرتے نہیں۔)

مغربی اقوام کو جزیہ اور خراج پر تو یہ اعتراض ہے کہ ان کی وصولی سے مفتوح اقوام کو اقتصادی طور پر کمزور کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بجائے تاوان جنگ کی بھاری رقوم اور پھر اس بہانے مفتوح قوم کے زرخیز علاقوں پر جبراً قبضہ کر کے انہیں اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دینے میں انہیں کوئی خرابی نظر آتی۔

(ب) نظری اعتبار سے موافق قوانین

(ا) ایفائے عہد اور خفیہ معاہدات:

ایفائے عہد کو اسلامی نقطہ نگاہ سے ایمان کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اور ہم کسی دوسرے مقام پر ایسی کئی مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے بڑے

نازک اوقات میں اور اپنا نقصان اٹھا کر بھی عہد و معاہدہ کو حتی الامکان پورا کیا ہے۔ جہاں تک نظری حیثیت کا تعلق ہے مغربی قانون بھی وعدے کی پابندی پر زور دیتا ہے کیونکہ معاہدات کیے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ فریقین ایک طے شدہ امر کے مطابق مطمئن ہو کر اپنی پالیسی وضع کریں۔ لیکن عملی حیثیت سے ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کی مہذب دنیا نے موقع سے اُٹھانے کی خاطر ظاہری معاہدات کے زیر زمین خفیہ معاہدات کا ایک جال بچھا رکھا ہے۔ اور اس منافقت کا نام فن سیاست یا ڈپلومیسی DIPLOMACY رکھ لیا ہے۔ اس ڈپلومیسی اور خفیہ معاہدات کا منظر جو پہلی جنگ عظیم میں سامنے آیا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے:۔

یہ یاد رہے کہ ابتدا میں اس جنگ میں حصہ لینے والے صرف چھ سات ممالک تھے۔ ایک فریق جرمنی، آسٹریلیا اور ہنگری پر مشتمل تھا۔ دوسرے فریق میں برطانیہ، فرانس روس اور اٹلی شامل تھے۔ یہی دوسرا فریق اپنے آپ کو حق پرست ہونے کا دعویٰ لے کر اٹھا تھا اور اتحادی کہلاتا تھا۔

اتحادی اپنے مفادات کی خاطر ترکی حکومت کا زور ختم کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا عرب ممالک کو بغاوت پر اکسانے اور اپنے ساتھ ملانے کے لیے یہ چال چلی کہ بار بار عربوں کو یقین دلایا گیا کہ ''جنگ کے اختتام پر عربوں کی ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر دیں گے۔ اور انہیں بتایا کہ یہ جنگ محض عربوں کو ترکی کے پنجۂ ستم سے نجات دلانے کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ چنانچہ جب ۱۱/مارچ 1917ء کو جنرل ماڈ MAUD بغداد میں داخل ہوا تو اُس نے ایک عام اعلان شائع کیا جس کے الفاظ یہ تھے:۔

''ہم آپ کے شہر میں فاتحانہ حیثیت سے نہیں داخل ہوئے۔ ہم آپ کے دشمن نہیں۔ بلکہ نجات دہندہ ہونے کی حیثیت سے آپ کو آزادی دلوانے آئے ہیں۔ بغداد کے باشندوں کو جان لینا چاہیے کہ ہم ان کے ملک پر حکومت نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ان کے علماء فقہا کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہوں۔ ان کا ملک ایک مرتبہ پھر آزاد ہو۔ اور اس میں ایسے آئین وقوانین نافذ ہوں جو ان کی مقدس شریعت اور قومی روایات کے مطابق ہوں''۔

اور جنگ کے خاتمہ پر فرانس اور انگلستان کی جانب سے ایک مشترکہ منشور بلاد عرب میں شائع کیا گیا۔ جس میں نہایت بلند آہنگی سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ:۔

''یہ جنگ جو دنیا کو جرمنی کے توسیعی عزائم سے بچانے کے لیے برپا کی گئی تھی۔ اس

کے خطرات ومصائب کو مشرق تک توسیع کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ برطانیہ اور فرانس ان تمام قوموں کو جو ایک طویل زمانہ سے جوروستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں، کامل آزادی دلانا چاہتے ہیں اوران کا مقصد یہ تھا کہ ایسی وطنی حکومتیں اور ادارات قائم کیے جائیں جو ان قوموں کی اپنی رغبت وخواہش پر مبنی ہوں اور جن میں کوئی دوسرا دخیل نہ ہو''۔

ان اعلانات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اتحادیوں نے ترکی کی حکومت کا خاتمہ کرنے اور عربوں کی بھرپور حمایت حاصل کرنے کے لیے صرف دورانِ جنگ ہی نہیں جنگ کے اختتام پر بھی ایسے اعلانات اور معاہدات کیے تھے۔ جو فی الواقع عربوں کے مفاد میں تھے۔ لیکن اصل حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور تھی۔ فرانس اور برطانیہ نے 1915ء اور 1916ء میں آپس میں خفیہ معاہدات کیے۔ 1916ء کے خفیہ معاہدہ[1] جو سائیکس پیکو کے نام سے مشہور ہے، کی رُو سے یہ طے ہوا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد:۔

(۱) عراق کلیتًا برطانیہ کے قبضہ میں رہے گا۔

(۲) شام پورے کا پورا فرانسیسی سلطنت کے دائرہ میں رکھا جائے گا۔

(۳) فلسطین ایک بین الملی علاقہ ہوگا اور حیفہ اپنے بندرگاہ سمیت برطانیہ کے اثر میں رہے گا۔

(۴) باقی رہے وہ ممالک جو عراق اور سواحل شام کے درمیان واقع ہیں۔ سوان کو دو حلقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک حصہ فرانس کے زیر اثر ہوگا اور دوسرا برطانیہ کے۔

ادھر یہ معاہدات طے پا چکے تھے اور ادھر یہ حق پرست عربوں کو بانگ دہل یہ یقین دلا رہے تھے کہ وہ محض ان کے نجات دہندہ ہیں اور جنگ کے بعد انہیں ایک آزاد اور خودمختار ریاست قائم کرنے میں مدد دیں گے جس پر ان کا کسی قسم کا تسلط نہ ہوگا۔

جب عربوں نے دیکھا کہ ان لفظی اعلانات کے باوجود شام کے سواحل پر فرانسیسی فوجیں مسلط ہیں اور عراق اور فلسطین میں انگریزی فوجیں پہنچ چکی ہیں۔ تب جا کر انہیں معلوم ہوا کہ حقیقتًا ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اور یہ چال محض ترکوں اور عربوں میں نفاق ڈال کر ملک چھیننے کی خاطر چلی گئی تھی۔

---

[1] واضح رہے کہ ایسے خفیہ معاہدات دوسرے ''حق پرستوں'' یعنی اٹلی اور روس سے بھی صیغہ راز میں رکھے گئے تھے۔

جب عربوں کو ہوش آیا تو انہوں نے شام میں امیر فیصل بن حسین کے تحت ایک وطنی حکومت قائم کرلی۔ ادھر فرانس اور برطانیہ میں معاہدہ سائیکس پیکو کے باجود تقسیم غنائم میں تنازعہ کھڑا ہوگیا۔ برطانیہ دراصل اپنے طے شدہ حصے سے بہت زیادہ ہوس کرنے لگ گیا تھا۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا تنازعہ طویل ہورہا ہے۔ اور اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں وطنی حکومت زور پکڑ رہی تھی تو پھر آپس میں متحد ہوگئے اور 1920ء میں بمقام سان ریمو ایک نیا سمجھوتا کر کے ''نئی بندر بانٹ'' پر اتفاق کرلیا۔ اور دنیا کو دھوکہ دینے کی غرض سے یہ ظاہر کیا کہ یہ تینوں ممالک ان کو اقوام متحدہ کی طرف سے انتداباً دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ نہ جمعیت اقوام کو اس بات کا کوئی حق پہنچتا تھا، نہ اس وقت تک جمعیت اقوام کا کوئی اجتماع ہوا تھا۔ اور نہ ہی انتداب کے متعلق کوئی فیصلہ کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ مراحل پورے چھ ماہ بعد نہایت مکروفریب سے طے کیے گئے تھے۔

دوسری طرف اہل عراق کو تلوار کے زور سے کچلا گیا۔ جو برطانوی انتداب کا نام سنتے ہی بھڑک اٹھے تھے۔ جس زمین پر ''ظالم'' ترکوں نے ۱۴ ہزار سے زیادہ فوج کبھی نہ رکھی تھی۔ اس پر ''نجات دہندہ'' برطانیہ نے ۹۰ ہزار فوج مسلط کردی۔ اور جس زمین پر ''ظالم'' ترکوں نے سالانہ دوسو سے زیادہ عربوں کو کبھی قتل نہیں کیا تھا'' وہاں حق پرست'' برطانیہ نے ایک ہی موسم گرما میں دس ہزار عربوں کو قتل کرڈالا۔

اب برطانیہ نے اپنے ظاہری وعدوں کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ چال چلی کہ وہاں براہ راست حکومت کی بجائے ایسی نام نہاد قومی حکومت قائم کرلی جو برطانیہ کی خواہش کے تابع اور اس کے مفادات کی محافظ ہو۔ چنانچہ اہل عراق کی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے ۲۳/اگست 1922ء کو شاہ فیصل کی تخت نشینی کا اعلان کرادیا گیا اور اس کی قیمت یہ وصول کی کہ اسے ایک معاہدہ پر مجبور کیا گیا جس کی رُو سے عراق بالواسطہ مکمل طور پر برطانیہ کے اثرواقتدار کے تحت آجاتا تھا۔ اور عراقی پارلیمنٹ سے اس معاہدہ کی تصدیق وتوثیق کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ آدھی رات کو یہ مسودہ مجلس وطنی میں پیش کیا گیا۔ اور ارکان مجلس کو بستروں سے اُٹھا اٹھا کر پولیس کی معرفت بلوایا گیا اور جبراً ان سے ووٹ لے کر اعلان کیا گیا عراقی پارلیمنٹ نے معاہدہ کی توثیق کردی ہے۔

پھر ان خفیہ معاہدات کا حلقہ صرف عربوں تک ہی محدود نہ تھا۔ اتحادی آپس میں بھی وقتاً

فوقتاً ہوا کا رُخ دیکھ کر ایسے معاہدات کر لیتے تھے۔ جنہیں دوسرے حق پرستوں سے صیغہ راز میں رکھا جاتا تھا۔ بین الاقوامی ڈاکہ زنی کی یہ اسکیم شائد صیغہ راز میں ہی رہ جاتی اگر دوران جنگ روس انقلاب کا شکار نہ ہو جاتا۔ اپریل 1917ء میں جب زار کی حکومت کا تختہ الٹا اور بالشویکوں کی حکومت قائم ہوگئی تو انہوں نے سرمایہ دار حکومتوں کے گھناؤنے کردار کو بے نقاب کرنے کے لیے وہ تمام خفیہ معاہدات شائع کر دیئے۔ جو انہیں زار کی حکومت کے نہاں خانوں میں دستیاب ہوئے تھے۔ ان معاہدات کی کوئی دفعہ ایسی نہیں تھی جس میں مخالف سلطنتوں کے کسی نہ کسی علاقہ یا ان کی اقتصادی ثروت کے کسی نہ کسی وسیع علاقے کو ان "حق پرستوں" نے آپس میں بانٹنے کا فیصلہ نہ کیا ہو۔

(۲) مہلک آلاتِ جنگ کا استعمال:

جنگ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی قوت ارادی کو مفلوج کر کے اسے اطاعت پر مجبور کر دیا جائے۔ اور اس مقصد کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے اور دشمن کے مال و جان کا نقصان کم سے کم ہو۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے دریغ قتل و غارت یا دہشت گردی کے بعد بھی دشمن اطاعت پر آمادہ نہیں ہوتا۔ لہذا انسانیت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ دشمن کے جان و مال کی بربادی کو اصل مقصد نہ سمجھا جائے بلکہ اس سے حتی الامکان احتراز کیا جائے۔

لیکن موجودہ دور کے آلاتِ جنگ، اور بمبار ہوائی جہاز اس لحاظ سے انتہائی وحشیانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ نہ ہی وہ مقاتلین اور محاربین میں کوئی تمیز روا رکھتے ہیں۔ اور شاید رکھ بھی نہیں سکتے۔ ایسے وحشیانہ افعال سے بربادی و ہلاکت تو اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن کبھی کوئی علاقہ فتح نہیں ہوتا۔ اس صورت حال نے مغربی اقوام کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایسے افعال پر پابندی عائد کریں۔ چنانچہ 1868ء اور 1907ء کی کانفرنسوں میں یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ دشمن کو ایسا جانی نقصان نہ پہنچانا چاہیے جو جنگ کے مقاصد میں کوئی مدد نہ دے مگر اس کی تکالیف میں غیر معمولی اضافہ کا باعث ہو۔ اس اصول کے مطابق حسب ذیل اشیاء کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔

(۱) اشتعال پذیر اور آتش گیر مادے جن کا وزن ۱۴ اونس سے کم ہو۔

(۲) پھٹنے والی گولیاں جو جسم میں داخل ہو کر پھیل جاتی ہوں۔

(۳) زہریلی گیس[1] اور دم گھونٹنے والی گیسیں۔

(۴) بیلونوں اور ہوائی جہازوں سے پھٹنے والے گولے برسانا۔

یہ تجاویز بھی بس صفحہ قرطاس کی زینت ہی بنی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ان تمام مہلک آلات کا فریقین کی طرف سے بے دریغ استعمال کیا گیا۔ پھر دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم کے استعمال نے تو ان تجاویز کے پرخچے اُڑا دیئے۔

اسلام نے اس سلسلہ میں ایک زریں اصول بتا دیا ہے۔ کہ بے مقصد اور بلاضرورت دشمن کے جان و مال سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ محض دہشت پھیلانے کے لیے ایسے افعال کا کوئی جواز نہیں۔ اور اس اصول پر عمل درآمد کی بہترین مثال فتح مکہ ہے۔ رہا دشمن کے جدید سے جدید تر مہلک آلات کے استعمال کا مسئلہ۔ تو اسلام نے اس سلسلہ میں یہ ہدایت دی ہے کہ ایسے باہمی سمجھوتے کرنے کے بعد وہ پہل کر کے عہد شکنی کے مرتکب نہیں ہو سکتے ہاں اگر دشمن پہل کرے تو جوابی کاروائی کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ بھی اسی حد تک جس حد تک دشمن نے زیادتی کی ہو۔ اور اگر پھر بھی عفو و درگزر سے کام لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (۲/۱۹۴)

(جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔)

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ (۴۲:۴۰)

(بدی کا بدلہ بدی ہے اسی کے مثل، اور جو کوئی معاف کر دے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے:)

ایک اور مقام پر فرمایا:۔

﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (۱۶/۱۲۶)

(اگر تم سزا دو تو اتنی سزا دو جتنی تمہیں تکلیف دی گئی ہے۔ اور اگر صبر کرو تو یہ صابروں کے لیے زیادہ بہتر ہے۔)

---

[1] آج سے کئی صدیاں پیشتر مالکی فقیہہ خلیل نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ زہر میں بجھائے ہوئے تیر استعمال نہ کرنا چاہئیں۔ جلی کہتا ہے کہ زہریلا سامان کسی بھی حالت میں دشمنوں کے خلاف استعمال نہ ہونا چاہیے۔ (اسلام کا قانون جنگ و صلح ص ۱۱۲ بحوالہ کتاب الاکلیل شرح مختصر خلیل مصنفہ محمد الامیر ص ۱۶۰)

یہ ہے وہ جامع اصول جس کی مسلمانوں کی ہدایت کی گئی ہے۔ دشمن کی کارروائیاں جارحانہ ہوں یا ظالمانہ اور منتقمانہ ہر جگہ یہی اصول مدنظر رکھا جائے گا۔

(۳) مفتوحین سے سلوک:

سترھویں صدی کے آغاز تک اقوام مغرب بھی اس قدیم قدرتی حق کی قائل تھیں کہ جو شہر بزور شمشیر فتح ہو تو فاتحین کو یہ حق حاصل ہوتا ہے۔ کہ مفتوحہ شہر میں گھس کے بے دریغ قتل وغارت کریں۔ انہیں امان دینے کا بھی کوئی تصور موجود نہ تھا۔ اگرچہ جنگ سی سالہ کی وحشت وبربریت دیکھنے کے بعد یورپ کا ضمیر اسے بُرا سمجھنے لگا تھا تاہم بعد میں ہونے والے معرکوں میں اس کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ 1790ء میں ترکی اور روس میں جنگ چھڑ گئی روسی فوجیں فتحیاب ہوکر اس میں داخل ہوئیں تو انہوں نے مقاتلین وغیر مقاتلین سب کو تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ 1837ء میں فرانس نے قسطنطنیہ فتح کیا تو اس کی فوجیں مسلسل تین دن قتل وغارت میں مشغول رہیں۔ 1857ء میں انگریزی فوجوں نے دلّی کو فتح کیا تو آزادی سے قتلِ عام کا بازار گرم کیا۔

بالآخر 1899ء کی ہیگ کانفرنس میں یہ طے پایا کہ بزور شمشیر فتح ہونے والے شہروں میں قتل وغارت اور لوٹ مار نہیں کی جائے گی مگر عملاً یہ طریقہ پھر بھی بند نہ ہوا۔ 1920ء میں یورپ کی مہذب ترین سلطنتوں کے زیر سرپرستی یونانیوں نے سمرنا اور تھریس میں داخل ہوکر غیر مقاتل شہری آبادیوں کے ساتھ اسی قدیم وحشت کا مظاہرہ کیا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا قانون بڑی طاقتوں کے سامنے بالکل بے بس ہے۔ اور آئندہ بھی ایسا ہی ہونے کا امکان ہے۔ نظری اعتبار سے تو یہ قانون اسلامی قانون سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن عملاً اس کی پابندی مشکل ہے۔ کیونکہ اس قانون میں حجت بننے کی اہلیت نہیں ہے۔

(ج) موافق قوانین

(۱) غیر مقاتل افراد کے حقوق:

گروٹیوس نے اپنی تاریخی کتاب میں ایک یہ سفارش کی تھی کہ:۔

جنگ میں بطور ایک شریفانہ رعایت کے (نہ کہ بطور ایک قانون کے) بچوں، بوڑھوں،

عورتوں، پادریوں، کاشتکاروں، تاجروں اور اسیرانِ جنگ کو قتل و غارت سے محفوظ رہنا چاہیے''۔

یہ محض ایک سفارش تھی۔ جس کو فوجی گروہ نے قبول نہیں کیا۔ دو سو برس بعد تک یورپ نے اس میں کوئی ترقی نہیں کی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی جنگ آزادی میں انگریزی فوجوں نے ہولناک مظالم کیے جن کے تصور سے انسانی ضمیر کانپ اُٹھتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یورپ نے وہی طریقہ اختیار کر لیا جو آج سے چودہ سو سال قبل اسلام نے پیش کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلام اس قانون کی پابندی کو لازمی قرار دیتا ہے۔ جبکہ مغرب آج بھی اسے محض ایک شریفانہ رعایت سمجھتا ہے۔

(۲) زخمی اور بیمار افراد کی نگہداشت:

1864ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے جنیوا کے مقام پر ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کر کے بیماروں، زخمیوں اور معالجوں سے متعلق چند قوانین مرتب کیے ہیں جن کی توثیق جنیوا کی تیسری کانفرنس منعقدہ 1906ء میں جا کر ہوئی۔ یہ قوانین بھی، جنہیں مغربی اقوام نے بعد از خرابی بسیار اختیار کیا ہے۔ اسلامی قوانین کا چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھوتہ بھی عملاً بیکار ہی رہا کیونکہ پہلی جنگ عظیم میں فریقین نے ایک دوسرے کے ہسپتال جہاز سے بڑی بے دردی سے تباہ کیے۔ حالانکہ ان پر معاہدہ کے مطابق سرخ صلیب کے نشان بھی لگے ہوئے تھے۔

ہیگ کانفرنس کے مختلف سمجھوتوں کا اصل صرف یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کو بیماری یا زخم نے جنگ لڑنے سے معذور کر دیا ہے۔ ان کو علاج سے بے توجہی کے ذریعہ مزید ایذا دینا یا انہیں قتل کر دینا انسانیت کے خلاف ہے۔ بالخصوص جبکہ ان کی ایذا رسانی اور قتل سے مقاصدِ جنگ کے حصول میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب دیکھئے اسلام نے اپنی فوجوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے حریف کے اچھے یا بُرے طرزِ عمل سے بے پرواہ ہو کر اپنے ذاتی فرض کے طور پر بیماروں، زخمیوں اور ایسے تمام لوگوں پر رحم و کرم سے کام لیں جو زخمیوں کی طرح معذور ہوں۔ اور یہ حکم اس وقت دیا گیا۔ جب کہ دشمن اس طرح کے رحم کے تصور سے بھی ناآشنا تھا۔

(۳) اسیرانِ جنگ:

جنگی قیدیوں کے متعلق بھی گروٹیوس نے ہی پہلی دفعہ یہ سفارش کی تھی کہ انہیں قتل

کرنے یا غلام بنا کر بیچنے کی بجائے یا تو ان کا تبادلہ کر لیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن دوسرے اخلاقی ضوابط کی طرح اس کا اثر بھی بہت دیر بعد میں ہوا۔ 1799ء میں یورپ کے سب سے بڑے جرنیل نپولین بونا پارٹ نے یافا کی چار ہزار ترکی فوج کو، جس نے جان بخشی کا وعدہ لے کر اطاعت قبول کی تھی صرف اس لیے قتل کر دیا کہ وہ نہ تو ان کی خوراک کا انتظام کر سکا، نہ ہی انہیں مصر بھیج سکا۔ اس کے ایک صدی بعد 1896ء میں کیوبا میں ہسپانوی کپتان جنرل ویلر نے اسیرانِ جنگ کو باغی قرار دے کر قتل کرا دیا اور ہزاروں نہتے باشندوں کو قید کر کے انہیں بھوک کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ مر گئے۔

1907ء کی دوسری ہیگ کانفرنس نے بلاشبہ اسیرانِ جنگ کے لیے بہت سے مفید قانون بنائے۔ لیکن ان قوانین کی منظوری کا معرکہ اخلاقی اقدار کا احترام نہیں بلکہ خوفِ انتقام ہے اسیرانِ جنگ کو یہ مراعات محض اس لیے بخشی گئیں کہ ہر فریق اپنے اسیروں کی بھلائی چاہتا تھا۔ اس کانفرنس میں جو مراعات اسیرانِ جنگ کو دی گئیں ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

اسیرانِ جنگ شخصی قید میں نہیں بلکہ حکومت کی قید میں ہوں گے۔ حکومت انہیں نظر بند رکھے گی قیدی نہ بنائے گی۔ حکومت ان قیدیوں کے درجہ اور عہدہ کے مطابق ان سے کام لے کر انہیں معاوضہ بھی عطا کرے گی جو اس کے ملک میں رائج ہے۔ اگر کوئی قیدی جنگ میں دوبارہ حصہ نہ لینے کا حتمی وعدہ کرے تو اس کو رہا کر دینا چاہیے۔ قید کرنے والی حکومت ان کے نام، پتہ اور حالات کی تشہیر کرے گی۔ اور ان کی ڈاک کا باقاعدہ بندوبست کیا جائے گا۔ قیدیوں کو مذہبی آزادی ہوگی۔ اور وفات پر ان کی تجہیز و تکفین حکومت کی ذمہ داری ہے۔ افسروں کو بھی حکومت ان کے درجہ کے مطابق اپنے ملک میں مروجہ تنخواہ ادا کرے گی جو بالآخر خود ان کی حکومت ادا کرے گی۔ جب صلح کے بعد اسیرانِ جنگ کا تبادلہ کر لیا جائے گا۔

اب دیکھئے ان مراعات میں سے کوئی رعایت ایسی نہیں۔ جو اسلام نے قیدیوں کو نہ دی ہو۔ البتہ جو زائد مراعات اسلام نے دی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) قیدیوں پر جو خرچ ہوگا۔ وہ مغلوب حکومت کے ذمہ واجب الادا نہیں ہوتا۔

(۲) قیدیوں سے مساوی سلوک کے بجائے بہتر سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ جس کی شہادت خود دورِ نبوی کے اسیروں نے دی۔

(۳) موجودہ حکومتیں تبادلہ اور فدیہ کے بغیر قیدیوں کو رہا نہیں کرتیں۔ جب کہ اسلام نے انہیں ازراہ احسان اور بغیر لالچ کے آزاد کر دینے کی بھی ایک شق رکھی ہے۔ اور اس پر بارہا عمل بھی ہوتا رہا ہے۔ دورِ نبوی کے 90 فیصد اسیر ازراہ احسان ہی رہا کیے گئے۔

(۴) موجودہ حکومتوں نے کاغذات سے فی الواقع غلامی اور قتل کے الفاظ کو خارج کر دیا ہے۔ لیکن عملاً ان کو حیلوں بہانوں سے بے دریغ قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں یہ فریب کاری روا نہیں۔ اس کے بجائے وہ سنگین حالات میں جبکہ ان پر کئی طرح کے شدید الزامات ہوں انہیں قتل یا غلام بنانے کی اجازت دیتا ہے۔ جیسا کہ بنونضیر کے ساتھ معاملہ ہوا۔ تاہم یہ صرف اجازت ہے حکم نہیں بہتر صورت یہی ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیا جائے۔ اگر بنونضیر کا فیصلہ بھی حضور اکرم ﷺ کے اختیار میں ہوتا تو شاید آپ کچھ نرمی کر جاتے۔ لیکن یہ فیصلہ یہود کے منتخب کردہ ثالث نے کیا تھا جسے طرفین نے بخوشی قبول کیا۔

(۵) موجودہ قوانین سترہویں صدی سے شروع ہو کر بتدریج یہاں تک پہنچے ہیں۔ لیکن اسلام نے یہ قوانین اس دور میں پیش کیے جبکہ اسیرانِ جنگ سے بدتر سلوک ہوتا تھا۔ جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ خود عرب کی یہ حالت تھی کہ غزوہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر اس دور میں رہا کیا گیا جبکہ کفار قریش کے قبضہ میں بیشتر مسلمان قیدی تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے تھے۔

(۶) ان مہذب اقوام نے اسیران جنگ کو جو مراعات بخشی ہیں، اس کا جذبہ محرکہ ''خوف انتقام'' ہے۔ جبکہ اسلام علی الاطلاق قیدیوں سے بہتر سے بہتر سلوک کی تلقین کرتا ہے۔



باب ہشتم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

کسی شخص کی عظمت کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ دنیا میں اس فن کے نامور ماہرین سے اس کا تقابل کر کے دکھایا جائے۔ اس غرض کے لیے ہم مختلف ادوار کے مندرجہ ذیل تین نامور جرنیلوں کا انتخاب کرتے ہیں:۔

(۱) سکندر اعظم' یونان کا بہت بڑا فاتح اور جرنیل، اس کا دور حضور ﷺ سے نو صدی پہلے کا ہے۔

(۲) چنگیز خان۔ مشرق وسطی کا بڑا فاتح اور جرنیل، اس کا دور حضور ﷺ سے چھ صدی بعد کا ہے۔

(۳) نپولین بونا پارٹ۔ فرانس کا فاتح اور جرنیل، اس کا دور حضور اکرم ﷺ سے بارہ صدی بعد کا ہے۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان تینوں جرنیلوں کے مفصل سوانح حیات لکھ کر تقابل کریں۔ بغرض اختصار ہم ان کے کارناموں کے حالات انسائیکلو پیڈیا اُردو مطبوعہ فیروز سنز سے نقل کرتے ہیں۔ ان حالات کے علاوہ تقابل کے وقت اگر کسی تفصیل کی ضرورت پیش آئی تو وہ بحوالہ درج کردی جائے گی۔

سکندر اعظم:

(356-----323ق م) دنیا کا عظیم فاتح یونان کی ایک ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ کا بیٹا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد 336 ق م میں تخت پر بیٹھا اور آس پاس کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو فتح کیا۔ ۳۳۴ ق م میں ایران پر حملہ کرنے کا عزم کیا۔ ایک بڑی فوج لے کر ایشیا کی طرف بڑھا۔ پہلے ترکی فتح کیا۔ پھر شام کے ساحل پر قبضہ کر لیا۔ اور ایران کی بحری

طاقت کا خاتمہ کر دیا۔ مصر نے جنگ کے بغیر ہی اطاعت کر لی۔ وہاں اس نے شہر اسکندریہ کی بنیاد رکھی۔ پھر عراق کا رخ کیا۔ عراق اور ایران پر قبضہ کیا اور بادشاہ کو شکست دی۔ پھر وہ درۂ خیبر کی راہ ہندوستان میں داخل ہوا۔ ۳۲۴ ق م میں یہاں دریائے جہلم کے کنارے راجہ پورس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ سکندر پورے ہندوستان کو فتح کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا مگر اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا چنانچہ وہ دریائے سندھ اور ساحل مکران کے راستے عراق کے شہر بابل پہنچا۔ یہاں اسے بخار آیا اور وہ ۳۲۳ ق م میں عین جوانی میں فوت ہو گیا اور اس کی وسیع سلطنت بہت سے ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

پاک و ہند پر اس کے نائب بھی زیادہ عرصہ قبضہ قائم نہ رکھ سکے۔ ۳۱۷ ق م تک یہاں یونانیوں کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ پاک و ہند کی تاریخ پر اس حملہ نے کا کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑا۔

چنگیز خاں:

۱۱۶۲ء تا ۱۲۲۷ء اصلی نام تیموجن تھا۔ چنگیز لقب جس کے معنی ہیں کامل سپاہی۔ دریائے اولون کے کنارے ایک خیمہ میں پیدا ہوا۔ ابھی تیرہ برس کی عمر کا تھا کہ دیرینہ مخاصمت FEUD پر مبنی ایک لڑائی میں اس کے باپ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اُس طرح چھوٹی عمر میں چنگیز خاں کو اپنے قبیلے کی سرداری سنبھالنا پڑی۔ برسرِ اقتدار آتے ہی چنگیز خاں نے ذہانت اور فوجی چالوں سے بہرہ وری کا ثبوت دینا شروع کیا اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے باپ کا انتقام بھی لیا اور تمام منگول قبائل پر ذاتی تسلط قائم کر لیا۔ اس کے بعد لشکر کشی کا وہ دور شروع ہوا جس کے دوران میں منگول (بمعنی بہادر) فوجوں نے اس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا۔ جسے سُن کر دور دور بسنے والوں کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ چنگیز کی فوجوں کی یلغار کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1237ء میں جب اسے موت نے آن دبوچا، اس وقت اس کی سلطنت کی حدود ایک طرف دریائے والگا سے بحرالکاہل تک اور دوسری طرف سائی بیریا سے خلیج فارس تک پھیلتی چلی گئی تھیں مؤرخین کا خیال ہے کہ چنگیز کی کامیابی کا راز اس کی ماں ہولم کی تربیت اور اس کے جرنیلوں سوتیائی وغیرہ کی قابلیت میں مضمر ہے۔

نپولین بوناپارٹ:

1769ء تا 1821ء فرانسیسی جرنیل اور بادشاہ' انقلاب فرانس کے دوران سب سے پہلے کامیابی تولان کے محاصرے میں توپ خانے کی مدد سے حاصل کی۔ اس کے بعد اٹلی میں جمہوری فوج کے کماندار کی حیثیت سے پے درپے فتوحات حاصل کیں۔ اور قومی ہیرو بن گیا۔ 1797ء میں موسم خزاں میں پیرس واپس آگیا اور حکومت کا تختہ اُلٹ کر خود قونصل اول بن گیا۔ 18/ مئی 1804ء کو اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ 1805ء میں آسٹریا اور 1806ء میں جرمنی کو شکست دی۔ اپنی بے اولاد بیوی جوزیفائن کو طلاق دے کر شاہ آسٹریا کی بیوی ماری لویزا سے شادی کی 1812ء میں روس پر حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ ماسکو سے پسپا ہوتے وقت اس کی تقریباً ساری فوج تباہ ہوگئی 1813ء میں پروشیا اور آسٹریا نے روس کے ساتھ مل کر اسے شکست فاش دی۔ نپولین تخت سے دست بردار ہوگیا اور ایلیا کے جزیرے میں قید کر دیا گیا۔ مگر سو دن کے بعد وہاں سے نکل گیا۔ فرانس واپس آیا اور فوج جمع کر لی لیکن 18/جون 1815ء کو واٹرلو کے میدان میں اسے شکست ہوئی اور سینٹ ہلینا کے جزیرے میں جلاوطن کر دیا گیا۔

مندرجہ بالا ماہرین حرب جرنیلوں کا تقابل

(۱) زندگی کا صرف ایک پہلو:

جیسے مذکورہ بالا تینوں جرنیل، جرنیل بھی تھے، فاتح بھی اور بادشاہ بھی اور یہ تینوں باتیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ گویا یہ تینوں جرنیل ایک مخصوص پہلو میں نامور ہوئے۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ کی اصل حیثیت اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی ہے۔ آپ ﷺ نبی بھی تھے، شارع بھی، مزکی اخلاق بھی تھے اور جج بھی۔ سپہ سالاری آپ ﷺ کی جزوی خوبی تھی۔ اس پہلو میں بھی آپ ﷺ نے ایسے کمال کا مظاہرہ کیا کہ باقی تمام ماہرین فن آپ کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔

(۲) فنون سپہ گری سے سابقہ واقفیت:

سکندر اعظم مقدونیہ (یونان) کے بادشاہ کا بیٹا تھا اور چنگیز خاں کا پڑدادا النجہ قبائلی بادشاہ' یہ دونوں جرنیل فن سپہ گری سے آبائی طور پر آشنا تھے۔ نپولین بونا پارٹ نے خود فوج میں بھرتی ہو کر یہ فن سیکھ لیا تھا۔ مگر حضور ﷺ کا بچپن پہلے بکریاں چرانے میں، پھر کچھ عرصہ تجارت

میں اور نبوت کے بعد جوانی اہل مکہ کے ظلم سہنے میں گزری، فنون سپہ گری سے واقفیت کہاں سے پیدا ہوتی۔ ہجرت سے پہلے آپ ﷺ صادق اور امین کے ناموں سے تو مشہور تھے مگر کسی نے آپ ﷺ کو تیر انداز یا نیزہ باز کبھی نہیں کہا تھا۔ اور جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے۔ اور آپ ﷺ کو صرف فن سپہ گری کا ہی نہیں بلکہ سپہ سالاری کی ذمہ داری ادا کرنے کا موقعہ پیش آیا۔ تو آپ ﷺ نے اس میں وہ کمال دکھایا کہ دنیا حیران ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے، کہ سکندر عین نوجوانی کے عالم میں یعنی 20 سال کی عمر میں ہی کشور کشائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چنگیز 12 سال کا تھا کہ اس کا باپ لڑائی میں مارا گیا تو وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ نپولین سترہ سال کی عمر میں بھرتی ہوا۔ گویا یہ تینوں جرنیل آغاز جوانی سے فن حرب وضرب میں مشغول ہو گئے تھے۔ لیکن آپ ﷺ کو جب یہ خدمات سرانجام دینی پڑیں تو اس وقت آپ ﷺ کی عمر 54 سال تھی۔ جوانی رخصت ہو چکی تھی اور بڑھاپے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اس دور زندگی میں اس فن کو ہاتھ میں لے کر یہ کمال دکھانا بھی شاید تاریخ میں اور کہیں نہ مل سکے گا۔

(۳) سابقہ فوج:

سکندر اعظم، چنگیز خاں نپولین کے سپاہی فن سپہ گری اور اس کے نظم وضبط سے پوری طرح آشنا تھے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ کو جس قوم سے واسطہ پڑا، وہ نظم وضبط کو اپنی توہین اور آزادی میں حائل تصور کرتی تھی۔ نسلی مفاخرت ان کی گھٹی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ آپ ﷺ ہی کا کارنامہ تھا کہ آپ ﷺ نے اس قوم کے ذہن اس قدر بدل دیئے کہ جنگ موتہ ۸ ہجری میں آپ ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیا تو ان کی ماتحتی میں بڑے بڑے معزز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے سرداران قریش اس جہاد میں روانہ ہوئے۔

علاوہ ازیں آپ ﷺ کے فوجی۔ قبائلی امتیاز کی بنیاد پر ایک دوسرے کی جانوں کے پیاسے تھے۔ مگر آپ ﷺ نے ان میں ایسی ہمدردی، محبت اور اخوت[1] باہمی کے جذبات پیدا

---

[1] ایک ہندو مصنف موتی لال ماتھر اسلامی اخوت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''اب میں اس تعلیم کا نتیجہ دکھلاتا ہوں جس نے مسلمانوں کے اندر اخوت واتحاد اور محبت ومروت کا ایسا گہرا رشتہ قائم کر دیا تھا۔ جس نے چند ہی سالوں میں دنیا کی جغرافیائی تقسیم کو یکسر بدل دیا تھا اور آج بھی اس کا اثر دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ پر باقی ہے۔ یعنی دنیا کے ایک حصہ کو اسلامی ممالک کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔'' (سرور کونین ص ۴۴)

کردیے جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔ قرآن کریم اس یکجہتی کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:۔

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:103)

(اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی ہے اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔)

بلاشبہ چنگیز خاں نے بھی اپنے چچازاد بھائیوں کو ساتھ ملا کر یک جہتی پیدا کرنے میں نمایاں اہلیت کا ثبوت دیا۔ لیکن اس نے جن لوگوں کو اکٹھا کیا اور جتھہ بندی کی، ان کا مفاد مشترکہ تھا اور وہ تھا ہوس ملک گیری۔ لیکن آپ ﷺ نے جن لوگوں کو اکٹھا کیا ان کے سامنے دنیوی مفاد کے بجائے مصائب وتکالیف کے پہاڑ نظر آتے تھے۔ یہ لوگ مسلمان پہلے تھے اور فوجی بعد میں بنے۔

(۴) مادی وسائل:

سکندر اعظم جب یونان سے نکلا تو 30 ہزار کی مسلح فوج اس کے ہمراہ تھی۔ چنگیز خاں نے اپنے پڑدادا کی اولاد میں یک جہتی پیدا کرنے میں 20 سال صرف کردیے۔ اور جب وہ خوارزم شاہ کے مقابلہ میں نکلا تو بیس ہزار مسلح افواج اس کے ساتھ تھیں، نپولین کو حکومت فرانس کی تربیت یافتہ فوج 20 ہزار کی تعداد میں مہیا ہوگئی تھی۔ لیکن جب آپ ﷺ کو بدر میں پہلی جنگ لڑنا پڑی تو آپ ﷺ کے پاس کیا تھا۔ صرف تین سو افراد، وہ بھی ایسے جو یہ بھی پوری نہ جانتے تھے کہ ہمیں قریش کے قافلہ تجارت کا رُخ کرنا ہے یا کفار کے اس مسلح لشکر سے پالا پڑنے والا ہے، جو قافلہ تجارت کی حفاظت کے لیے آرہا ہے۔ پھر جب یہ حالات نے یہ فیصلہ کردیا کہ قریش کے مسلح لشکر سے مقابلہ ہوگا۔ تو ان میں سے بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جو دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ قرآن کریم نے اس منظر کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

﴿كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ. يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ

(جیسے تمہارے پروردگار نے تمہیں تدبیر کے ساتھ تمہارے گھر سے نکالا۔ اور اس وقت مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ وہ لوگ حق بات میں اس کے ظاہر ہوئے

مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴾ (۸: ۵، ۶)	پیچھے تم سے جھگڑنے لگے۔ گویا موت کی طرف جاتے ہیں اور وہ اسے دیکھ رہے ہیں۔)

اب صورت یہ ہوئی کہ ایک طرف صرف 313 آدمی ہیں جو پوری طرح مسلح بھی نہیں۔ اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ لڑنا پڑے گی تو ان میں سے اکثر دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ پھر ان کے اپنے کھانے پینے کے سامان کی قلت ہے اور سامانِ جنگ کی بھی۔

اور دوسری طرف صورت یہ ہے کہ لشکر کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا سے بھی زیادہ ہے۔ یہ سب لوگ مسلح ہو کر نکلے ہیں کہ تجارتی قافلہ کو مسلمانوں کی دست بُرد سے بچا کر لانا ہے۔ اور اسی مڈ بھیڑ میں مسلمانوں کا استیصال بھی کرنا ہے۔ لہذا ان کے ساتھ اسلحہ جنگ بھی وافر مقدار میں ہے۔ گھوڑے بھی بہت ہیں۔ فوج بہادران قریش پر مشتمل ہے۔ کھانے پینے کا سامان اتنا وافر ہے کہ روزانہ دس 10 اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔۔ پینے کو شراب بھی کافی ہے۔ اور جملہ آرام و آسائش کے سامان فراہم ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کا ایسی بے دل، نہتی اور کم تعداد کو ایسے مسلح اور کثیر دشمن سے بھڑا دینا اور پھر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے فتح حاصل کرنا ایسی مثال ہے جس کی نظیر مشکل ہے۔ اور یہ آپ ﷺ کی زندگی کا پہلا تجربہ کارزار تھا۔

(۵) فتح و شکست:

دنیا نے بارہا دیکھا ہوگا کہ ایک قلیل جماعت ایک لشکرِ جرار پر غالب آگئی۔ لیکن ان حدود و قیود کے ساتھ آپ ﷺ کا فتح پانا شاید دنیا بھر میں ایک ہی مثال ہو۔ آپ ﷺ ہی کے تربیت یافتہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنگ موتہ میں 3 ہزار مسلمانوں کے لشکر سے ایک لاکھ عیسائیوں کا منہ پھیر دیتے ہیں اور فائز المرام واپس آتے ہیں لیکن اگر حالات کی میزان میں دیکھا جائے تو جنگ بدر کی فتح اس سے زیادہ شاندار نظر آتی ہے۔ وجوہ درج ذیل ہیں!

(۱) جنگ موتہ میں پہلے مسلمانوں کے تین سپہ سالار یکے بعد دیگرے شہید ہو جاتے ہیں۔ حضرت خالدؓ کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے قلیل لشکر کو اس لشکر جرار سے بچا کر ...... پسپا ہو کر نہیں بلکہ ان کو پسپا کر کے ...... واپس لے آئے۔ دشمن کے کتنے

آدمی قتل ہوئے یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ مسلمان صرف بارہ شہید ہوئے تھے، جب کہ جنگ بدر میں 70 اساطین کفر موت کے گھاٹ اُترے اور اتنی ہی تعداد میں گرفتار بھی ہوئے۔

(۲) جنگ موتہ میں فوج پوری طرح مسلح ہو کر اور جنگ کے ارادہ سے نکلی تھی۔ جبکہ جنگ بدر کے وقت ان کو معرکہ کا یقین بھی نہ تھا اور فوج بھی نہتی تھی۔

(۳) جنگ بدر میں جس فوج نے کام کیا۔ یہ فوج اور سپہ سالار کا پہلا تجربہ تھا۔ جبکہ جنگ موتہ سے پہلے مسلمان کئی دفعہ لڑائی کا تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ اور حضرت خالد اسلام لانے سے مدتوں پہلے ایک عظیم جرنیل سمجھے جاتے تھے۔

تاہم اس تقابل سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی عظمت بحیثیت جرنیل کسی طرح کم نہیں ہوتی اسی موقعہ پر حضور اکرم ﷺ نے آپ کو "سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ"۔ کا لقب دیا تھا۔ اس جنگ میں آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ نو تلواریں ٹوٹیں تھیں۔ (بخاری کتاب المغازی۔ باب غزوہ موتہ)

فتح و شکست کے معیار پر اگر دیکھا جائے تو نپولین ہمیں ایک ناکام جرنیل نظر آتا ہے۔ بلاشبہ اس نے بہت کچھ فتوحات بھی کیں، لیکن اس کی 1807 کے بعد کی زندگی میں کئی مرتبہ ایسی شکست فاش ہوئی جس نے اس کی عظمت کا درجہ بہت کم کر دیا ہے۔ روس کے مقابلہ میں اسے شکست ہوئی جس میں اس کی بے تدبیری اور کم فہمی کی وجہ سے اس کی 5 لاکھ فوج میں نصف سے زیادہ ہلاک ہو گئی۔ پھر انگریزوں کے مقابلہ میں ''واٹرلو'' کے مقام پر ایسی ہزیمت اٹھائی کہ خود بھی گرفتار ہو گیا۔ ایک جزیرہ سینٹ میں جلاوطن کیا گیا۔ بالآخر اسی مقام پر سسک سسک کر 6 سال بعد 1821ء میں فوت ہوا گویا اس کی آخری زندگی ناکامیوں سے پُر تھی۔

اس لحاظ سے سکندر اعظم، چنگیز خاں اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک مقام پر نظر آتے ہیں۔ خالد بن ولید بھی ایسے عظیم جرنیل تھے کہ انہوں نے کم از کم اسلام کی زندگی میں شکست نہیں کھائی اور رسول اللہ ﷺ کا مقام ان سب سے بلند ہے۔ جنہوں نے زندگی بھر میں صرف دو دفعہ شکست کا منہ دیکھ کر پھر فتح میں بدل دیا۔ جنگ احد میں نقشہ جنگ میں فوری تبدیلی کے ذریعہ اور جنگ حنین میں از سرِ نو نئی ترتیب سے صف بندی کر کے دشمن کا منہ پھیر دیا۔ یہ واقعات آپ ﷺ کی عظیم حربی مہارت اور حاضر دماغی کی دلیل ہیں۔

(۶) جنگی تدابیر میں جدت:

آپ ﷺ نے ہر معرکہ میں کوئی نہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی۔ جس سے دشمن پہلے واقف نہ ہوتا۔ اور بسا اوقات یہ نئی تدابیر اس کے سامان گمان میں بھی نہ ہوتیں مثلاً:

(۱) جنگ بدر میں جنگ کے انتخاب کے علاوہ آپ ﷺ نے صف بندی اس انداز سے فرمائی۔ کہ آپ ﷺ کا لشکر اصل تعداد سے بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس تدبیر نے دشمن کے دلوں میں رُعب ڈال دیا۔

(۲) جنگ اُحد میں آپ ﷺ نے پہاڑی درہ پر قبضہ کر کے دشمن کی تدابیر کو ناکام بنا دیا۔ پھر جب مسلمانوں کی غلطی سے یہ درّہ خالی ہوگیا اور شکست کے آثار نظر آنے لگے اور آپ ﷺ نے اپنی قیام گاہ کے لیے پہاڑی پر ایک بلند مقام تجویز فرمایا۔ اور پورے عزم وثبات سے لڑائی جاری رکھی۔ بالآخر دشمن ناکام واپس لوٹ گیا۔

(۳) جنگ خندق میں آپ ﷺ نے مدینہ کے خالی حصہ کے سامنے خندق کھود کر اتحادیوں کی تمام تدابیر کو ناکام بنا دیا اور دشمن کا یہ دس ہزار کا جرار لشکر زہر کے گھونٹ پی کر ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد بالآخر ناکام واپس ہوگیا۔

(۴) جنگ خیبر میں آپ ﷺ نے غطفان اور خیبر کے درمیان رجیع کے مقام پر پڑاؤ ڈال کر دشمن کے اتحاد کا رشتہ منقطع کر دیا۔

(۵) فتح مکہ کے دوران آپ ﷺ نے رازداری Secracy نامعلوم راستوں سے سفر اور شان وشوکت کے عظیم الشان مظاہرہ سے دشمن کے تمام قویٰ کو مفلوج کر دیا اور وہ مقابلہ میں آنے کے قابل ہی نہ رہے۔

محاصرہ طائف میں آپ ﷺ نے دبابہ اور منجنیق جیسے قلعہ شکن آلات پہلی دفعہ استعمال کر کے ہوازن اور ثقیف کے ماہر تیر اندازوں کی تدبیریں ناکام بنا دیں۔

غرض ہر نئے موقعہ پر آپ ﷺ کوئی نئی تدبیر سوچ لیتے تھے جو دشمن کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی اور ان کی تدبیریں ناکام ہو جاتی تھیں۔ جنگی تدابیر میں ایسا مسلسل ارتقاء اور جدت ایسی خصوصیت ہے جس میں دنیا کا کوئی جرنیل آپ ﷺ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سپہ سالار اور فوج کے باہمی تعلقات:

رسول اللہ ﷺ کو اپنی فوج سے پوری ہمدردی تھی۔ فوج کے دُکھ سکھ اور کام کاج میں آپ ﷺ برابر کے شریک ہوتے تھے جنگ احد میں صحابہ ؓ کو دکھ پہنچا تو آپ کو بھی دکھ پہنچا اور حنین کی شکست کے آثار نظر آئے تو آپ ﷺ نے یہ نہیں کیا کہ آپ ﷺ بھی اپنی جان بچانے کی فکر کریں بلکہ میدان میں کھڑے ہو کر للکارا۔ منتشر اور پریشان صحابہ ؓ کو مجتمع کیا صحابہ کو نئی زندگی ملی جس کی وجہ سے دونوں مقامات پر جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔

ان جنگوں سے پیشتر ہجرت کے موقعہ پر آپ ﷺ اس سے بھی زیادہ مروت وایثار کا مظاہرہ فرما چکے تھے۔ مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم مل چکا تھا۔ اور وہ سب یکے بعد دیگرے مکہ سے مدینہ کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہر روز مصر ہوتے کہ حضور ﷺ بھی مدینہ چلے جائیں۔ مگر ہمیشہ یہی جواب ملتا کہ ''ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا اور مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوچ کا حکم نہیں ملا ہے''۔ آپ ﷺ کی خواہش یہ تھی کہ سب مسلمان بخیر وعافیت مدینہ پہنچ جائیں تب آپ ادھر کا رُخ کریں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس وقت مکہ کو الوداع کہا جب باقی مسلمان مدینہ پہنچ چکے تھے۔ صرف آپ ﷺ اور ابوبکر صدیق ؓ باقی رہ گئے تھے۔ اور جس رات آپ ﷺ ہجرت کے لیے گھر سے باہر نکلے تو سازشی قریشیوں کا مسلح پہرہ آپ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔

اس معیار پر نپولین بونا پارٹ کو دیکھئے۔ وہ بلاشبہ اپنے سپاہیوں کے کردار سے انفرادی واقفیت رکھتا تھا۔ فوج کے اکثر سپاہیوں کے اُسے نام تک یاد تھے۔ وہ اُن سے کام لینا بھی خوب جانتا تھا لیکن آڑے وقتوں میں اسے صرف اپنی جان بچانے کی فکر ہوتی تھی۔

مصر میں انگریزوں کے مقابلہ میں عکہ کے مقام پر اسے شکست ہوئی تو وہ اکیلا وہاں سے فرار اختیار کر کے فرانس چلا آیا۔ اسے یہ فکر لاحق نہیں ہوئی کہ اس کی فوج کس حال میں ہے۔ واٹرلو کے مقام پر اسے شکست ہوئی تو وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کی اور جہاز پر سوار ہونے کو تھا کہ گرفتار ہو گیا۔

رسول اللہ کی فوج آپ ﷺ کی صرف اطاعت گزار ہی نہ تھی جان نثار بھی تھی۔ فوج اور

سپہ سالار کے درمیان انس ومحبت اور عزت واحترام بھی موجود تھا۔ صحابہ کرام ﷺ کی اطاعت گزاری کا یہ حال تھا کہ لشکر قریش اُحد کے میدان سے کام کو نا تمام چھوڑ کر گیا تو آپ ﷺ نے صحابہ ﷺ کو ان کے تعاقب کا حکم دیا۔ اس جنگ میں ستر ممتاز صحابہ شہید ہو چکے تھے۔ زخمیوں کی تعداد کافی تھی۔ مدینہ میں گھر گھر صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ فوج جنگ کی تکان زخموں کی تکلیف اور ذہنی طور پر سخت پریشان تھی۔ اس حال میں جب آپ نے حکم دیا تو ستر صحابہ کرام ﷺ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ (بخاری، کتاب المغازی، غزوہ احد)

اب سکندر اعظم کی بات سنیے۔ وہ یلغار کرتا ہوا جب ہندوستان پہنچا تو سندھ کے راجہ پورس پر فتح پانے کے بعد وہ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک مزید ڈیڑھ ماہ میں راستہ کے علاقے فتح کرتا دریائے بیاس تک پہنچ گیا۔ وہ آگے بھی بڑھنے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے فوج کی منت سماجت کی لیکن وہ نہیں مانی۔ آخر اس نے فوج کو اس بات کا بھی لالچ دیا کہ وہ ایشیا سے حاصل شدہ دولت سب فوج میں تقسیم کر دے گا۔ لیکن فوج نے پھر بھی اپنے سپہ سالار کی اطاعت نہیں کی۔ فوج فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ دل مسرور وشادمان تھے، بے شمار دولت کا لالچ بھی دیا جا رہا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود فوج کا انکار اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سکندر کو صرف اپنی فتوحات سے دلچسپی تھی فوج سے ہمدردی نہ تھی۔ فوج کو اپنے گھروں سے نکلے ہوئے اور بال بچوں سے علیحدہ ہوئے مسلسل آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سکندر چاہتا تو پیچھے سے کمک بھی منگوا سکتا تھا، راستے میں نئی فوج بھی منگوا سکتا تھا، راستے میں بھی فوج تیار کر سکتا تھا۔ اگر وہ سپاہیوں کے احساسات کا خیال رکھتا اور ان میں سے نصف افواج کو ہی واپس وطن بھیج دیتا تو اس طرح اُسے مایوسی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔

بالآخر سکندر کو فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو بری راستے سے اور دوسرے کو بحری راستے سے وطن واپس پہنچنے کا حکم دے دیا۔ خود بحری راستے جب عراق پہنچا تو بابل کے مقام پر بخار کے عارضہ سے عین جوانی کے عالم میں مر گیا۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اس بخار کا سبب بھی اس کے آگے بڑھنے کی ہوس کی ناکامی اور فوجوں کا منہ توڑ جواب ہی تھا۔

(۸) کشور کشائی:

اگر کشور کشائی اور ملک گیری کے پہلو سے دیکھا جائے تو ہمیں سکندر اعظم کا مقام سب سے آگے نظر آتا ہے۔ جس نے ۳۲۵ ق م سے ۳۲۶ ق م میں یونان سے لے کر دریائے بیاس تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اور اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

(۱) اس نے مسلسل ۹ سال اسی ملک گیری میں صرف کیے۔ اس کی ملک گیری کی ہوس اتنی شدید تھی کہ اس نے تمام دنیا کو مسخر کرنا چاہا۔ اور اس کی یہ آرزو ناممکنات سے تھی لہٰذا وہ اس آرزو کا پانچواں حصہ بھی پورا نہ کر سکا۔ اور یہی حسرت دل میں لیے مر گیا۔

(۲) اس کا مطمح نظر صرف جہانگیری تھا۔ قبضہ کے استحکام کی طرف اس نے کم ہی توجہ دی اور جہاں بانی یا مفتوحہ علاقوں میں امن اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال تک بھی اس کے دل میں کبھی نہ آیا۔ مورخین اس کے متعلق یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ وہ بادل کی طرح آیا اور برس کر چلا گیا، یا آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح واپس چلا گیا'' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اس کے حملہ کے صرف تین سال بعد تک (یونانی یلغار کا کچھ) اثر باقی نہ رہا۔ جتنے انسانوں کو اس نے تہ تیغ کیا تھا اتنے اور پیدا ہو گئے۔ اس کا کوئی جانشین بھی اس قابل نہ تھا کہ وہ قبضہ بحال رکھ سکتا۔ لہٰذا یونانی تہذیب کا ذرہ بھر اثر ہمیں ہندوستان پر دکھائی نہیں دیتا۔

اب دیکھیے کہ اسلام کا اصل مقصد کشور کشائی نہیں بلکہ اسلامی نظام حیات کا نفاذ اور اس کی تحریک کو پروان چڑھانا ہے اور یہ مقصد کشور کشائی کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر گئے اور اہلِ مکہ آپ ﷺ کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ تب بھی اسلام مکہ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ قریش مکہ ایک حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو صلح حدیبیہ کے بعد واپس لائے تو ان کے ذریعہ تقریباً تین سو آدمی تحریکِ اسلامی میں شامل ہوئے۔ جبکہ ابھی مکہ قریش کے زیر اقتدار تھا۔

اسلام کشور کشائی کی طرف صرف اس وقت توجہ دیتا ہے جب کہ کوئی ملک یا قوم تحریک کے مقاصد میں رکاوٹ کا باعث بن رہی ہو۔ اس صورت میں بھی اس کا اصل مقصد جہانبانی ہوتا

ہے رسول اللہ ﷺ کی سپاہیانہ زندگی ۲ھ سے شروع ہو کر ۹ ہجری پر ختم ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے جو علاقہ فتح کیا وہ خیبر تھا جو ۷ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد فتح کیا گیا۔ یعنی آپ ﷺ کی سپاہیانہ زندگی کے ۷ سالوں میں سے پانچ سال بعد صرف خیبر کا محدود سا علاقہ فتح ہوا جب کہ اسلام اس وقت تک اپنی ترقی کی کئی منازل طے کر چکا تھا۔ اگر کشور کشائی ہی اسلام کا مطمح نظر ہوتا تو آپ ﷺ ابتدا ہی میں مدینہ کے مضافات کو بزور شمشیر فتح کر کے انہیں اپنی ریاست کے ساتھ ملانے کی کوشش فرماتے۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے محض کشور کشائی کوئی قابلِ تعریف فعل نہیں۔ کیونکہ فتح کے بعد ایک اسلامی حکومت پر بہت سی ذمہ داریاں آن پڑتی ہیں، دورِ فاروقی میں جب عراق و ایران کا سارا علاقہ فتح ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، "کاش! ہمارے اور فارس کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہوتا کہ نہ وہ ہم پر حملہ کر سکتے نہ ہم ان پر چڑھ کر جا سکتے۔" (الفاروق ص ۲۳۸)

جب حمص کا علاقہ مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ تو سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ہرقل کے پایہ تخت پر فوج کشی کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے کچھ فوجیں اس طرف بھیج بھی دیں۔ لیکن دربار خلافت سے حکم پہنچا کہ اس سال اور آگے بڑھنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس ارشاد کے موافق فوجیں واپس بلا لی گئیں۔" (الفاروق ص ۱۸۸)

احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے جب خراسان فتح کر لیا تو حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ خراسان اسلام کے قبضہ میں آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فتوحات کی وسعت کو چنداں پسند نہیں کرتے تھے۔ خط پڑھ کر فرمایا کہ ہمارے اور خراسان کے درمیان میں آگ کا دریا حائل ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔ احنف کے مردانہ وار حوصلوں کی اگرچہ تعریف کی اور فرمایا کہ احنف شرقیوں کا سرتاج ہے۔ تاہم جواب یہی لکھا کہ جہاں تک پہنچ چکے ہو وہاں سے آگے نہ بڑھنا۔ (ایضاً ص ۲۵۱)

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی انتہائی خواہش تھی کہ مصر کو فتح کیا جائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ آڑے آتے تھے۔ بالآخر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے اصرار پر راضی ہو گئے اور چار ہزار فوج ساتھ کر دی۔ اس پر بھی ان کا دل مطمئن نہ تھا۔ عمرو رضی اللہ عنہ سے کہا خدا کا نام لے کر روانہ ہو لیکن مصر پہنچنے سے پہلے اگر میرا خط پہنچ جائے تو الٹے پھر آنا۔ عریش پہنچے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط مل گیا۔ اگرچہ اس میں پیش قدمی سے روکا گیا تھا۔ لیکن چونکہ شرطیہ حکم تھا، عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب تو ہم مصر

کی حد میں آ چکے۔ (ایضاً ص ۲۵۳)

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی نقطہ نگاہ سے کشور کشائی کوئی اچھی بات نہیں۔ تو دَورِ نبوی کے آٹھ سالوں میں دس[1] لاکھ مربع میل کا وسیع رقبہ کیسے اسلام کے زیرِ نگیں آ گیا۔ پھر یہ وسعت دَورِ فاروقی میں پچیس لاکھ مربع میل تک کیونکر پہنچ گئی۔ جو پوری آباد دنیا کا چوتھائی حصہ بنتی ہے۔ تو اس سوال کا جواب ہم ایک عیسائی کی زبان سے پیش کرتے ہیں۔

کشور کشائی کی وجوہ:

جب رومی شکست کھا کر دمشق اور حمص وغیرہ سے نکل کر انطاکیہ پہنچے تو ہرقل سے فریاد کی کہ عرب نے تمام علاقے کو پامال کر دیا۔ ہرقل نے ان میں سے چند ہوشیار اور معزز آدمیوں کو دربار میں بلا کر پوچھا کہ "عرب تم سے زور میں، جمعیت میں اور سروسامان میں کم ہیں پھر تم ان کے مقابلے میں کیوں نہیں ٹھہر سکتے؟" اس پر سب نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ البتہ ایک تجربہ کار بڈھے نے عرض کی کہ "عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے بہت اچھے ہیں۔ وہ رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزے رکھتے ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ آپس میں ایک دوسرے سے برابری کے ساتھ ملتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پیتے ہیں۔ بدکاریاں کرتے ہیں۔ اقرار کی پابندی نہیں کرتے۔ اوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ ان کے کام میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے اور ہمارا جو کام ہوتا ہے ہمت اور استقلال سے خالی ہوتا ہے۔ (الفاروق ص ۱۸۹)

یہ تو اس بات کا جواب تھا کہ مسلمان وسائل کی کمی کے باوجود کیسے فتحیاب ہو جاتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام میں کچھ ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ کہ علاقے فتح نہ کرنے کے باوجود خود بخود فتح ہوتے چلے جاتے ہیں:

جب کوئی قوم یا ملک کسی دوسرے علاقہ کو فتح کرتا ہے تو فاتح اور مفتوح قوم میں امتیاز بدستور قائم رہتا ہے۔ مثلاً انگریز قوم نے اگر ہندوستان کو فتح کیا تو اہل ہند خواہ کتنا ہی اپنے آپ کو انگریزوں کے رنگ میں رنگ دیں۔ وہ انگریز کبھی نہیں بن سکتے۔ اور نہ ہی انہیں انگریزوں جتنے حقوق برطانیہ دے سکتا ہے۔ یہی حال جرمن، فرانس یا دوسری اقوام اور ان کے مقبوضات کا ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک تحریک ہے۔ وہ کسی قوم یا ملک کے باشندوں کا نام نہیں۔ اب دیکھئے کہ

---

[1] واضح رہے کہ اتنی قلیل مدت میں سکندر اعظم کے سوا اور کسی جرنیل نے اتنا وسیع علاقہ فتح نہیں کیا۔

اسلام عرب سے اٹھا۔ ان لوگوں نے ایران کو فتح کیا۔ اب اگر اہل ایران اپنے آپ کو عربوں سے زیادہ اسلام کے رنگ میں رنگ دیں تو یہ عربوں سے بھی زیادہ معزز بن سکتے ہیں۔ رہا حقوق کا مسئلہ تو اسلام لاتے ہی سب مسلمان ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں۔ اسلام کی یہی وہ خوبی ہے جس کی بنا پر عرب کے اکثر قبائلی علاقوں کے سرداروں کی حکومت بھی انہی کے پاس رہی اور مسلمانوں کے برابر حقوق بھی مل گئے اس طرح مفتوحہ علاقے اسلامی ریاست کے سلسلہ کی ایک کڑی تو سمجھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان میں حاکمیت اور محکومیت کا تصور پیدا ہی نہیں ہوتا۔

انہی باتوں کا اثر تھا کہ ایک صدی کے بعد اسلام نصف آباد دنیا پر پھیل گیا۔ پھر جب مسلمانوں میں اسلامی روح نہ رہی۔ اور جہاد میں دنیوی اغراض و مقاصد اور جنگ کا مقصد ہوس ملک گیری بن گیا۔ تو مسلمانوں کو شکستیں بھی ہونے کے واقعات سامنے آ گئے۔ اور فی الحقیقت اسی وقت ان کے انحطاط کا بیج پڑ چکا تھا۔

(۹) فتح کے بعد قتل و غارت:

اسلامی نقطہ نظر سے فتح کا مقصد محض فتنہ و فساد کو دُور کرنا ہوتا ہے۔ لہذا فتح کے بعد وہ قتل و غارت اور لوٹ مار، مفتوحہ شہروں کو جلانا اور کھیتوں وغیرہ کو برباد کرنا اور اس جیسے دوسرے تمام افعال کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ لیکن دنیوی اغراض کے تحت لڑنے والی قوموں کا فتح سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ مفتوحہ علاقہ کی دولت پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ اس ملک سے زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ اٹھایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس پر قبضہ کو طویل سے طویل تر مستحکم بنایا جائے۔ تاکہ فوائد مذکورہ حاصل ہوتے رہیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے وہ:۔

(۱) تمام مقاتلین کو یا تو تہ تیغ کر دیتے ہیں۔ یا غلام بنا لیتے ہیں۔ تاکہ مفتوحہ ملک کی فوجی طاقت کو کچل دیا جائے۔

(۲) تمام علاقہ کی دولت سمیٹنے کے بعد شہروں کو آگ لگا دیتے ہیں تاکہ مفتوحہ قوم معاشی لحاظ سے اتنی کمزور ہو جائے کہ وہ سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہے۔

(۳) غیر مقاتلین کا قتل عام اس لیے کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص ان کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ نہ کھڑا ہو اور قبضہ تادیر بحال رہ سکے۔

اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں۔ تو چنگیز خاں سب سے بڑا سفاک اور ظالم نظر آتا ہے۔ اس نے کوئی علاقہ فتح نہیں کیا جہاں اس نے اس وحشت و بربریت کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ مثلاً:۔

(۱) ۶۱۶ء میں جب وہ بخارا میں داخل ہوا تو باشندوں کو نکل جانے کا حکم دیا۔ جو بچے رہے قتل کیے گئے کچھ قیدی بنائے گئے۔ بخارا جیسا عظیم الشان شہر جلا دیا گیا جو صرف کھنڈر کی صورت میں باقی رہ گیا۔ (تاریخ ۴۲ حصہ دوم ص ۳۶۱)

(۲) رے کو فتح کرنے کے بعد اسے تاخت وتاراج کر ڈالا پھر ہمدان کو لیا اور قزوین کو فتح کر کے چالیس ہزار باشندے تہ تیغ کر دیئے۔ (ایضاً ص ۳۶۱)

(۳) خوارزم کو فتح کیا تو پہلے شہر کو لوٹا۔ پھر اسے ویران کیا۔ اس پر بھی جوش انتقام کم نہ ہوا تو دریا کے بند کو، جس کے ذریعہ شہر میں پانی آتا تھا، کھول دیا جس سے سارا شہر مع آبادی تہ آب ہو گیا۔ (ایضاً ص ۳۶۳)

(۴) ترمذ پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے باشندوں کو قتل کرا دیا۔ پھر ترمذ کی طرح بلخ اور طالقاں بالیاں کی آبادی کو بھی ختم کرا دیا۔ پھر اس کے بعد غزہ اور غور پر قبضہ کر کے پوری آبادی کو قتل کر دیا۔ (ایضاً ص ۳۶۴)

(۵) چنگیز خاں نے پنجاب تک جلال الدین کا تعاقب کیا۔ وہ تو ہاتھ نہ آیا اور تاتاری پنجاب اور ملتان کو تخت وتاراج کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تاتاری خراسان، فارس، آذربائیجان، ازمستان، اران، کوج اور قفچان کے سارے علاقے زیروزبر کرتے ہوئے روس کے علاقے تک پہنچ گئے۔

اب سکندر اعظم کا حال سنیے۔ جس کی قوم کو اس دور میں دنیا کی مہذب ترین قوم ہونے کا فخر حاصل تھا۔ شام کے قدیم تجارتی مرکز صور کو اس نے چھ ماہ کے سخت محاصرہ کے بعد فتح کیا۔ تو ۸ ہزار بے گناہ انسانوں کو بے گناہ قتل کیا اور ۳۰ ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ (الجہاد فی الاسلام)

ایران میں پیش قدمی کرتے وقت اس کے سپاہیوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ ملک کو تباہ کیا اور فتح حاصل کرنے کے بعد ایران کے بحری بیڑے کو تباہ کر دیا۔ پھر عراق و ایران میں جو قتل وغارت، لوٹ مار اور تباہی مچائی یہ سب واقعات تاریخوں میں محفوظ ہیں۔

اس سلسلے میں نپولین بونا پارٹ کا کردار اس ایک واقعہ سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کو ۱۷۹۹ء میں چار ہزار ترکی فوج نے اس شرط پر نپولین کی اطاعت قبول کی تھی کہ ان کی جان بخشی کی جائے۔ یہ مفتوح نہ تھی بلکہ نپولین سے امان یافتہ تھی۔ لیکن نپولین نے انہیں امان دینے کے باوجود اس بنا پر قتل کروا دیا کہ وہ ان کے لیے خوراک مہیا نہیں کر سکتا۔ نہ ہی انہیں مصر روانہ کر سکتا ہے۔

اس پہلو سے جب ہم حضور اکرم ﷺ کے کردار پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ دنیا کے تمام جرنیلوں سے بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔

(۱۰) مفتوحہ علاقوں میں نظام عدل کا قیام:

فتح کے بعد سب سے اہم مسئلہ مفتوحہ علاقہ میں نظام عدل کا قیام ہے۔ دنیوی فاتحین کے لیے یہ نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے نہ اس کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ لیکن ایک اسلامی سپہ سالار کے لیے سب سے اہم مسئلہ ہی یہ ہے۔ اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو جہاد کا مقصد ہی نظام عدل کا قیام ہے۔ اور اسلامی نقطہ نظر سے اصل کامیابی دشمن کو میدان جنگ میں شکست دینا نہیں بلکہ مفتوحہ علاقہ میں عدل وانصاف قائم کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (۲۲:۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین پر قبضہ دیں تو نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں۔ اچھی باتوں کا حکم دیں اور بُری باتوں سے روکیں گے۔)

آیت بالا میں نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق تو صرف مسلمانوں سے ہے مگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام پوری اطاعت گزار رعایا کو محیط ہوتا ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم اس فریضہ کو ادا کرنے کیلئے چار چیزوں کا اہتمام ضروری ہے۔ قیامِ امن، تعلیم، احتساب اور فحاشی کا سد باب۔

دورِ نبوی عرب کا سارا علاقہ اسلام کے زیر نگین آ چکا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے سات صوبوں میں تقسیم کیا۔ ہر صوبہ میں ایک والی مقرر کیا جاتا تھا ایک عامل اور ایک قاضی والی گورنر اور سپہ سالار دونوں کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ گویا داخلی امن اور دفاعی امور دونوں کا وہ ذمہ دار ہوتا تھا۔ عامل بیت المال کے انتظام پر مامور تھا۔ اور قاضی، جج یا صوبہ کے چیف جسٹس کے فرائض

سرانجام دیتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں مملکت اسلامیہ میں وسعت ہوئی دس صوبے بنائے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں گیارہ صوبے تھے۔ دور فاروقی میں والی کے فرائض کو دو الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ داخلی امن کے لیے محکمہ پولیس تشکیل دیا گیا۔ اور دفاع وغیرہ کے لیے محکمہ فوج۔

ایک اسلامی ریاست میں تعلیم کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ تعلیم ہی اسلامی نظریہ حیات کی روح رواں ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا تھا۔ ویسے تو آپ ﷺ ہر وقت اور ہر کسی کو تعلیم دیتے رہتے تاہم اصحاب صفہ پر آپ ﷺ کی خصوصی توجہ رہتی تھی۔ اصحاب صفہ دراصل اس دور کی یونیورسٹی تھی۔ یہ حضرات چوبیس گھنٹے مسجد نبوی میں رہ کر آپ ﷺ کی تعلیم اور کردار دونوں باتوں سے مستفیض ہوتے تھے۔ اسی یونیورسٹی سے سینکڑوں معلم، مبلغ، واعظ اور قاری تیار ہوتے جو دوسرے علاقوں میں تعلیمی فرائض سرانجام دینے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعلیم کو بہت ترقی دی اور تمام والیوں اور عاملوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ لوگوں کو کتاب وسنت کی تعلیم دیں۔ اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ایک بار فرمایا کہ اے اللہ! میں اپنے تمام علاقوں کے عاملوں پر تجھ کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے انہیں اس لیے مقرر کیا ہے کہ کتاب وسنت کی تعلیم دیں"۔ تمام افسروں کا تقرر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے کہ وہ عالم اور فقیہہ بھی ہوں۔ ملکی افسروں کی فہرست میں بڑے بڑے ممتاز علماء کے نام پائے جاتے ہیں۔

قرآن وحدیث کے علاوہ زبان وادب اور حساب وریاضی کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی۔ حساب دان تیار ہوئے حساب کے کاغذات نقشہ جات، دفاتر، محاصل کا باقاعدہ حساب اور سن ھجری کا اجراء آپ رضی اللہ عنہ ہی کے عہد میں ہوا۔

احتساب سے مراد یہ ہے کہ رعایا کے اعمال وافعال پر کڑی نظر رکھی جائے آیا اس میں دیانتداری سے کام لیتے ہیں۔ یا مکروفریب اور بددیانتی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ خود رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ منڈی تشریف لے گئے۔ گندم کا ایک ڈھیر برائے فروخت پڑا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کے اندر ہاتھ داخل کیا تو نمی محسوس ہوئی آپ ﷺ نے گندم کے مالک سے کہا۔ "یہ کیا بات ہے؟" مالک نے کہا رات شبنم کافی پڑی تو یہ گیلی ہوگئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تو پھر تم نے اسے باہر کیوں

نہیں کیا"۔ پھر فرمایا: "جس کسی نے ہم سے دھوکہ کیا اس کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں"۔

(مسلم۔ کتاب الایمان۔باب قول النبی من غش فلیس منا)

اسی طرح ایک دکان دار کو دیکھا وہ ذرا کم تول رہا تھا آپ ﷺ نے فرمایا[1] زِنْ وَارْجِحْ (تول تو ذرا جھکتا تول) یہ منڈی کی بات تھی آپ ﷺ جرنیلوں کی کارکردگی پر بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک مہم میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار بنایا۔ انہوں نے چند ایسے آدمیوں کو قتل کر دیا جنہوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے سخت برہم ہوئے اور پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ان لوگوں نے جان بچانے کی خاطر یہ کلمات کہے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا؟ "کیا تم نے ان کا دل چیر کے دیکھ لیا؟ پھر آپ ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا۔" اے اللہ! میں خالد رضی اللہ عنہ کے اس کام سے بری الذمہ ہوں۔" بعدازاں آپ نے مقتولین کا خون بہا بھی ادا کر دیا۔

(حوالہ جات پہلے دیئے جا چکے ہیں)

اور بھی ایسے کئی واقعات ہیں جنہیں احتساب کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ دورِ فاروقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ احتساب کا الگ محکمہ قائم کیا۔ فحاشی کے سدِ باب کے لیے وعید' سزائیں اور حدود سب طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔ جرائم کی روک تھام کے لیے عدالتیں قائم کی جاتی ہیں۔ پہلی عدالت خود رسول اللہ ﷺ کی ذات تھی جن کے فیصلے مسجدِ نبوی میں ہوتے تھے۔ چوری اور زنا کے کئی جرائم میں آپ ﷺ نے مجرموں کو سزائیں دیں۔

دورِ فاروقی میں قضا و عدل کا الگ محکمہ ہوا۔ جہاں انصاف مفت حاصل ہوتا تھا اور جلد بھی۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا دُرہ پکڑے بازار میں گشت کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی جھگڑا یا جرم ہوتا دیکھا۔ موقعہ پر شہادتیں لیں۔ اور اسی مقام پر سزا سنا کر اسے نافذ بھی کر دیا۔ مفت اور بلا تاخیر انصاف سے جرائم میں حیران کن کمی واقع ہوگئی۔ تجربہ شاہد ہے کہ انصاف میں تاخیر جرائم کو کم کرنے کی بجائے اس میں پیہم اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

عقیدہ آخرت اور ارکان اسلام کی ادائیگی سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ جو انسانوں کو ایسے تمام گناہوں سے رُکنے کا موثر سبب بنتا ہے جن تک قانون کی دسترس نہیں۔ اس طرح فحاشی کے

---

[1] نسائی۔ کتاب البیوع۔ باب الرجحان فی الوزن

تمام محرکات اور منکرات کا خاتمہ یا ان میں معتد بہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔

یہ ہیں ایک اسلامی مملکت کی ذمہ داریاں جو اسے مفتوحہ علاقوں میں سرانجام دینا پڑتی ہیں۔ اب بتائیے جو جرنیل فتح کے بعد خود بے گناہ شہریوں کا قتلِ عام کرتا ہو۔ لوٹ مار سے یا دوسرے طریقوں سے مفتوحہ علاقہ کی معیشت کو مفلوج کر دیتا ہو۔ فتح کے بعد فوجیوں کو مفتوحہ علاقوں کی عورتوں کی عصمت دری کی عام اجازت دیتا ہو، اور خود ان کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہو۔ وہ مفتوحہ علاقہ کی فلاح و بہبود کا خیال تک بھی دل میں لا سکتا ہے۔؟

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جنگ قادسیہ کی فتح کی خوشخبری ملی تو آپ . . . نے ایک پُر اثر تقریر فرمائی۔ جس کا آخری حصہ یہ تھا:

''مسلمانو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں غلام بناؤں۔ میں تو خود اللہ کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا بار میرے سر پر رکھا گیا ہے۔ اگر میں اس طرح کام کروں کہ تم چین سے سوؤ تو یہ میری سعادت ہے۔ اور اگر میری یہ خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو تو یہ میری بدبختی ہے۔ میں تم کو تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ لیکن باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے۔ (الفاروق ص ۲۶۷ شبلی نعمانی)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ مفتوحہ علاقوں میں اسلام کس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کی تعلیم کیا ہے۔؟

سکندر اپنے دور کی مہذب ترین قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے مفتوحہ علاقوں میں فلاح و بہبود کا کونسا کام کیا تھا؟ چنگیز کو عظیم جرنیل کے بجائے عظیم ڈاکو اور لٹیرا کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ لوگ جرنیل ضرور تھے مگر انتظامی صلاحیتوں سے عاری تھے، البتہ نپولین میں انتظامی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس نے اندرون ملک کچھ اصلاحات بھی کیں مگر مفتوحہ علاقوں میں اس کی باری ہی نہیں آئی۔ جتنے علاقے اس نے فتح کیے یا زیر اثر بنائے، اس کی ناقص جنگی پالیسی اور سیاسی تدبر کے فقدان کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس کی آخری زندگی انتہائی ناکامیوں اور مایوسیوں میں گزری۔ بالآخر گرفتار ہوا اور چھ سال بعد مر گیا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ مفتوحہ علاقوں میں قیامِ امن، انتظام و انصرام اور بدی کے استیصال کے پہلو سے اگر تمام دنیا کے جرنیلوں کو دیکھا جائے تو رسول اللہ ﷺ کی ذات ہمیں سب سے بلند نظر آتی ہے۔

(11) ایفائے عہد:

مناسب موقع دیکھ کر معاہدات کو پس پشت ڈال دینا اور موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھانا دنیا کا عام دستور ہے۔ اور دنیا کا کوئی جرنیل بھی اس معاملہ میں اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ امتیاز صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔ کہ وہ نقصان برداشت کرنا گوارا کر سکتا ہے۔ مگر عہد سے انحراف کسی قیمت پر جائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ایفائے عہد بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (۳۴:۱۷) (اپنے عہد کو پورا کرو۔ بے شک عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔)

اور نقض عہد کو ایک بدترین جرم قرار دیا ہے۔ اس موضوع پر قرآن کریم میں بے شمار آیات ہیں۔ جن کا درج کرنا یہاں ممکن نہیں۔

عہد ایک شخص کا دوسرے شخص سے ہو یا ایک شخص کا کسی قوم سے یا کسی قوم کا دوسری قوم سے۔ وہ بہر حال عہد ہے اور اس کا پورا کرنا عین فرض ہے۔ پھر جب یہ عہد کسی دوسری قوم یا قبیلہ یا ملک سے طے پا جائے تو سیاست خارجہ کی کامیابی کا انحصار اس ایفائے عہد پر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی عظمت یہ ہے کہ زندگی بھر دشمن آپ ﷺ سے بدعہدی اور غداری کرتے رہے۔ لیکن آپ ﷺ نے جوابی کاروائی کے طور پر کبھی نقض عہد کو برداشت نہیں کیا۔ یہود کی بدعہدی تو زبان زد ہے۔ انہوں نے میثاق مدینہ کی ہر ہر بار خلاف ورزی کی۔ ان کی غداریوں اور عہد شکنیوں کے واقعات بے شمار ہیں۔

دوسرے قبائل نے بھی بدعہدی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد بنو بکر کی حمایت کر کے قریش مکہ نے معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کی۔ بنو ثعلبہ نے تبلیغ اسلام کی خاطر آپ ﷺ سے آدمی طلب کیے تو آپ ﷺ نے دس عالمان دین ساتھ روانہ کیے۔ انہوں نے غداری کر کے انہیں شہید کر دیا۔ یہی کام بنو عضل وقارہ نے کیا۔ انہوں نے تبلیغ اسلام کے نام پر دس عالمان دین کو غداری سے شہید کر دیا اور بئر معونہ کا واقعہ تو بڑا ہی دردناک ہے۔ جس میں ۷۰ ممتاز قاریان اور عالمان دین کے مقابلہ میں قبیلہ رعل اور ذکوان کی جمعیت لا کر انہیں شہید کر دیا گیا۔ جس کا رسول اللہ ﷺ کو بہت ہی زیادہ دکھ ہوا۔

اب اس کے مقابلہ میں آپ ﷺ کے ایفائے عہد کے واقعات بھی سن لیجئے کہ کیسے نازک موقعوں پر آپ ﷺ نے ایفائے عہد پر اپنے ہر طرح کے مفادات کو قربان کر دیا۔

(۱) اسی بئر معونہ کے حادثہ میں ایک صحابی عمرو بن امیہ بچ نکلے لیکن بعد میں گرفتار ہو گئے۔ عامر بن طفیل، جس نے ان قاریان کو شہید کروایا تھا ...... نے عمرو رضی اللہ عنہ بن امیہ کو دیکھ کر کہا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔ لہٰذا میں یہ منت پوری کرنے کی خاطر عمرو بن امیہ کو چھوڑتا ہوں۔

عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو راستے میں اسی قاتل قبیلہ کے دو افراد مل گئے تو آپ نے ان کو قتل کر دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ حضور ﷺ ان دو آدمیوں کو امن دے چکے تھے۔ جس کا عمرو بن امیہ کو علم نہ تھا۔ اب حالات کا تقاضا یہ تھا کہ بنو عامر سے جتنی بھی ہو سکے ان کی غداری کی وجہ سے ان پر سختی برتی جاتی۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہوئے ان دونوں آدمیوں کا خون بہا ادا کر دیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۷۳)

(۲) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو حسیل رضی اللہ عنہ کسی سفر میں کفار کے ہتھے چڑھ گئے۔ انہوں نے جنگ میں عدم شرکت کا وعدہ کیا تب ان کی جان چھوٹی۔ جنگ بدر میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے واقعہ بیان کیا۔ اس وقت مسلمانوں کو ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے انہیں جنگ میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی اور فرمایا "ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے۔ ہم کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مدد درکار ہے"۔ (مسلم کتاب الجہاد والسیر باب الوفاء بالعہد)

(۳) صلح حدیبیہ کی شرائط لکھی جا چکی تھیں لیکن ابھی معاہدہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ کہ قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو کے لڑکے ابو جندل رضی اللہ عنہ قید سے فرار ہو کر پابہ زنجیر مسلمانوں کے سامنے گر گئے۔ وہ اپنے زخم دکھا دکھا کر رسول اللہ ﷺ سے التجا کر رہے تھے کہ آپ مجھے واپس نہ کیجئے، مسلمان پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، تڑپ اُٹھے۔ بیعت رضوان مکمل ہو چکی تھی۔ اس حال میں آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے محض ایفائے عہد کی خاطر ابو جندل کو واپس کر دیا۔ اور فرمایا۔ "ابو جندل رضی اللہ عنہ! صبر اور ضبط سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی

راہ نکالے گا صلح کی شرائط اب طے ہو چکیں اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے''۔ (ابن ہشام)

(۴) مکہ میں رہ جانے والے مظلوم مسلمانوں میں سے ایک عتبہ بن اسید (ابوبصیر) تھے۔ یہ بھی کفار قریش کے مظالم سے تنگ آ کر مدینہ بھاگ آئے، ساتھ ہی قریش کے دو آدمی پہنچ گئے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجئے۔ آپ ﷺ نے ابوبصیر رضی اللہ عنہ سے واپس جانے کو کہا تو انہوں نے جواب دیا۔ آپ مجھے کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ پھر مجھے کفر پر مجبور کر دیں۔ اب ایک طرف کفر کا خطرہ سامنے تھا، دوسری طرف ایفائے عہد۔ آپ ﷺ نے عتبہ سے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ اس کی کوئی راہ نکالے گا اور عتبہ کو کافروں کی حراست میں دے دیا۔ راستہ میں عتبہ نے ایک نگران کو تو قتل کر دیا۔ دوسرا مفرور ہو کر پھر مدینہ آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا۔ اور شکایت کی۔ ساتھ ہی ابوبصیر بھی آپ ﷺ کے پاس پہنچ گئے اور کہا، ''آپ ﷺ نے عہد کے مطابق مجھے واپس کر دیا تھا۔ اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔'' (طبری ج ا صلح حدیبیہ)

(۵) غرض ایسے نازک موقعوں پر آپ ﷺ کے ایفائے عہد کے واقعات بے شمار ہیں حتیٰ کہ آپ ﷺ کے دشمن بھی آپ ﷺ کی اس خوبی کا اعتراف کرتے تھے، جنگ احزاب کے موقع پر جب بنو نظیر کے سردار حی بن اخطب ؓ نے بنو قریظہ کو عہد شکنی پر برانگیختہ کیا تو بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد نے یوں جواب دیا:

((فانی لم ارمن محمد الا صدقاً ووفاءً)) (میں نے محمد کو ہمیشہ سچ کہنے والا اور وعدہ پورا کرنے والا پایا ہے۔)

کعب بن اسد کی اس شہادت کے باوجود کہ صدق اور وعدہ وفائی بہت بڑی خوبی ہے۔ جو محمد میں پائی جاتی ہے۔ جب اس کی اپنی باری آئی بالآخر عہد شکنی ہی کی۔

(طبری۔ ج ا غزوہ خندق)

پھر یہ خوبی آپ ﷺ کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ آپ ﷺ کے جانشینوں نے بھی عہد کی پوری پوری پابندی کر کے مثال قائم کر دی۔

دور فاروقی میں شام کی فتوحات کی سلسلہ جاری تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کا

محاصرہ کر رکھا تھا۔ ایک دن اہل دمشق کوئی جشن منا رہے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند جانبازوں کے ہمراہ فصیل پر کمند لگائی۔ اُوپر چڑھے اور قلعہ کے دروازے کھول دیے۔ خالدی فوج فاتحانہ انداز میں قلعہ میں داخل ہوگئی۔ اہل دمشق نے دوسری جانب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کی درخواست کردی۔ جو انہوں نے نئی صورت حال سے لاعلمی کی بنا پر قبول کرلی۔ چنانچہ محض ایفائے عہد کی خاطر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ علاقہ اہل دمشق کو واپس دے دیا۔ (تاریخ اسلام۔ حمید الدین ص ۱۳۸)

شام کی فتوحات کے دوران عیسائیوں نے صلح کے لیے اپنے قاصد جارج کو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ وہ شام کے وقت پہنچا۔ نماز باجماعت کا پرکیف منظر دیکھ کر سخت متاثر ہوا۔ بعد میں حضرت عیسیٰ کے متعلق چند سوال کیے جن کا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے شافی جواب دیا۔ نتیجتاً جارج مسلمان ہوگیا۔ اور چاہا کہ یہیں رہ جائے لیکن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے محض اس خیال سے کہ رومیوں کو بدعہدی کا گمان نہ ہو اسے مجبور کیا اور کہا کہ کل یہاں سے جو سفیر جائے گا اس کے ساتھ چلے جانا۔ (الفاروق ص ۱۹۶)

(۱۲) امان یا پناہ:

امان یا پناہ بھی ایفائے عہد ہی کی ایک قسم ہے۔ مسلمانوں کا ایفائے عہد دشمنوں میں بھی اس قدر زبان زد تھا کہ دشمن نے بعض دفعہ مسلمانوں کی کسی واقعہ سے لاعلمی سے فائدہ اٹھا کر امان حاصل کی۔ اور عظیم فائدے حاصل کیے، اور مسلمان جو پناہ دے چکے تھے، یہ جانتے ہوئے کہ ان سے مکروفریب سے امان حاصل کی گئی ہے، اپنا نقصان اٹھا کر بھی اس عہد کو پورا کیا۔

غلام کی امان:

خوزستان (ایران) کی فتوحات کے سلسلہ میں ایک مقام جندی شابور کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا ہوا تھا کہ ایک دن شہر والوں نے خود شہر پناہ کے دروازے کھول دیئے اور نہایت اطمینان سے اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ مسلمانوں کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ سبب پوچھا تو شہر والوں نے کہا کہ: ''تم ہم کو جزیہ کی شرط پر امان دے چکے ہو۔ اب کیا جھگڑا رہا۔'' سب کو حیرت تھی کہ امان کس نے دی؟ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک غلام نے لوگوں سے چھپا کر امن کا رقعہ لکھ دیا

ہے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ایک غلام کی امان حجت نہیں ہو سکتی۔ شہر والے کہتے تھے کہ ہم آزاد غلام نہیں جانتے۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ "مسلمانوں کا غلام بھی مسلمان ہے اور جس کو اس نے امان دی تمام مسلمان امان دے چکے۔"

(الفاروق ص ۲۳۱)

دھوکہ کی امان:

عراق و ایران کی جنگوں کے سلسلہ میں غارق کے مقام پر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور جاپان سالار لشکر کی فوج کا مقابلہ ہوا۔ جاپان شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ مگر جس مجاہد نے اسے گرفتار کیا تھا وہ اسے پہچانتا نہیں تھا۔ جاپان نے اس کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے عوض دو نوجوان غلام دینے کا وعدہ کر کے امان لے لی۔ اتنے میں کسی دوسرے نے اُسے پہچان لیا اور پکڑ کر سردار لشکر کے پاس لے گئے۔

ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسے دشمن کا چھوڑ دینا اگرچہ ہمارے حق میں بہت مضر ثابت ہو گا مگر ایک مسلمان اسے امان دے چکا ہے۔ اس لیے بدعہدی جائز نہیں۔ چنانچہ وعدہ کے مطابق اسے رہا کر دیا گیا۔ (تاریخ اسلام۔ حمید الدین ص ۱۳۲)

(۱۳) فراست یا دور اندیشی:

حالات جنگ (حرب۔WAR) یا میدانِ جنگ (قتال۔BATTLE) میں بعض دفعہ ایسے حالات پیش آجاتے تھے کہ جرنیل اپنی کسی مجبوری یا مصلحت کی وجہ سے صلح پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن دشمن ایسی شرائط پیش کر دیتا ہے۔ جو بظاہر توہین آمیز اور ناگوار ہوتی ہیں۔ اس وقت اپنی مصلحتوں اور شرائط کے نتائج کا صحیح موازنہ کر کے مناسب اقدام کرنا جرنیل کی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہوتی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے وقت رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ناراضگی کے باوجود کفار کی کڑی اور توہین آمیز شرائط کو کیوں قبول کیا اور اس کے نتائج کیسے شاندار رہے۔

سکندر اعظم اور چنگیز خان کو ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ان کی تمام تر زندگی مار دھاڑ

میں گزری۔ البتہ نپولین کی زندگی میں ایک مرتبہ ایسا واقعہ بھی پیش آگیا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اکتوبر ۱۸۱۳ء میں اتحادیوں نے نپولین کو لیپزگ (LAPIZG) کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی۔ جس کے نتیجہ میں جرمنی کی ریاستوں (جن کا نپولین نگران بنا ہوا تھا) سے اتحاد ٹوٹ گیا۔ ہالینڈ آزاد ہو گیا اور بویریا اتحادیوں سے مل گیا۔ نپولین کو دریائے رائن عبور کر کے فرانس کی سرحد پر آنا پڑا۔ اب نپولین کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ خود فرانس کی حفاظت کیسے ہو؟

ایسے نازک حالات میں ۱۸۱۴ء میں اتحادیوں نے نپولین کو صلح کی پیشکش کی جسے فرینک فورٹ (FRANKFORT) کی شرائط کہتے ہیں۔ اس پیشکش کی رُو سے فرانس کو اپنی اصلی اور قدرتی حدود کے اندر مقید رہنا پڑتا تھا۔ اتحادیوں نے یہ پیشکش کی تھی کہ فرانس کی سرحد ایک جانب کوہ ایلپس اور پائرنس (PYRENESS) تک ہو گی اور دوسری جانب دریائے رائن تک۔ اگر نپولین ان شرائط کو مان لیتا تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی اور اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ مگر اس وقت بھی اس کے سر پر فرانس کی وسیع سلطنت کا بھوت سوار تھا۔ لہذا اس نے ان ذلت آمیز شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحادیوں نے فرانس پر دھاوا بول دیا۔ نپولین نے گوڈٹ کر مقابلہ کیا مگر چند ہفتوں کے بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کو لڑائی بیکار ہے۔ دشمن کی فوجیں پیرس کے دروازوں تک پہنچ چکی تھیں لہذا ۶ اپریل ۱۸۱۴ء کو قصر شاہی سے ایک اعلان جاری کیا جس کی رُو سے وہ فرانسیسی تخت سے دست بردار ہو گیا۔ اور اتحادیوں نے اسے جزیرہ ایلبا میں بھیج دیا۔ (جدید تاریخ یورپ۔ ایم شمس الدین)

اگر اس وقت نپولین غرور و نخوت کے بجائے دور اندیشی سے کام لیتا تو اسے یہ بُرے دن دیکھنا نصیب نہ ہوتے۔

(۱۴) تربیت یافتہ جانشین:

کسی جرنیل کی عظمت کا پہلو یہ بھی ہے کہ اپنے سالاروں کی تربیت کیسے کرتا ہے۔ اور اپنے بعد کتنے اور کیسے جانشین چھوڑ کر جاتا ہے؟ اس لحاظ سے سکندر اعظم کو دیکھئے تو اس کے جانشینوں میں ہمیں صرف سلوکس کا نام نظر آتا ہے۔ جس نے ایشیا میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کو پائیداری نصیب نہ ہو سکی۔ چنگیز نے اپنے مفتوحہ علاقے اپنے چار بیٹوں میں تقسیم کر دیئے۔ چنگیز ہی کا ایک پوتا ہلاکو خاں تھا۔ جس نے بغداد کو فتح کرنے کے بعد وہ مظالم ڈھائے کہ

دادا کی وحشت وبربریت کو بھی مات کر دیا۔

نپولین کی ۱۸۰۷ء سے بعد کی زندگی، ناکامیوں اور مایوسیوں کی پُر درد داستان بن گئی لہٰذا وہ اپنے سالاروں کی کیا تربیت کرتا؟

اب رسول اللہ ﷺ کے جانشینوں کا حال سنیے۔ ان میں سے ایک خالد بن ولید ہیں۔ جنہوں نے:

☆ جنگ موتہ میں تین ہزار فوج سے دشمن کی ایک لاکھ فوج کا منہ پھیر دیا۔

☆ عراق وایران کا بیشتر اور شام کا نصف حصہ فتح کیا۔

☆ اسلام لانے کے بعد زندگی بھر کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا، آپ رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ میدان جنگ میں شہادت نصیب ہو مگر یہ آروز پوری نہ ہوئی۔

☆ خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ لوگ سمجھنے لگ گئے تھے کہ فتح اور خالد رضی اللہ عنہ بن ولید لازم وملزوم ہیں۔

☆ خالد رضی اللہ عنہ کا کردار اتنا بلند تھا کہ عین معرکہ حق وباطل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے معزولی کا حکم ملتا ہے تو کسی قسم کا ملال لائے بغیر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح کی ماتحتی میں ہی جوش وخروش سے جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔

پھر ان میں سے ایک خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو دربار خلافتؒ میں بیٹھ کر تمام جنگوں کے نقشے خود تیار کرتے تھے۔ سپہ سالاروں کے بارے میں بڑی دور اندیشی سے کام لیتے اور انہیں مسلسل ہدایات جاری کرتے رہتے تھے۔ ان سے کام لینا جانتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کے حکم سے سرتابی کرے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے دور میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود سپہ سالار اعظم تھے۔

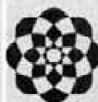
پھر ان میں سے ایک حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے شام کا بہت سا علاقہ بھی فتح کیا۔ جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مزید پیش قدمی سے روکتے ہی رہے۔ لیکن آپ نے کسی نہ کسی حیلے بہانے ان کی اجازت لے کر پورے مصر کو فتح کر ڈالا۔ اور فاتح مصر کہلائے۔

پھر ان میں سے ایک ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہیں جن کی عظمت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے مدبر سیاست دان نے خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کو معزول کر کے سپہ سالاری کا

تاج انہیں پہنایا اور جنہوں نے شام کی فتوحات میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ان میں سے ایک سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ جو قادسیہ کو فتح کرنے کے بعد مدائن کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ راہ میں دریائے دجلہ پورے زور و شور سے بہہ رہا تھا دشمن نے پُل توڑ کر بے کار کر دیا اور کشتی بھی موجود نہیں تھی۔ سب سے پہلے آپ نے بے تکلف دریا میں گھوڑا ڈال دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی فوج بھی دریا میں داخل ہوگئی دریا مواج اور زخار تھا۔ لہریں اور موجیں آ آ کر گھوڑوں سے ٹکراتی تھیں۔ لیکن مسلمان رکابوں میں رکابیں ملائے باتیں کرتے دریا کے اس پار تک چلے گئے۔ جب ایرانیوں نے یہ صورت حال دیکھی تو سمجھے کہ یہ انسانی ہمت سے بالاتر کوئی چیز ہے اور دیواں آمدند! دیواں آمدند (یعنی دیو آ گئے) کہتے ہوئے بھاگ نکلے۔

غرض کہاں تک شمار کیا جائے۔ انہی جرنیلوں میں مغیرہ بن شعبہ بھی ہیں، عقبہ بن موسیٰ بھی، طارق بن زیاد فاتح اندلس بھی اور محمد بن قاسم فاتح سندھ بھی، اور ان سب جرنیلوں کی نمایاں خوبی رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا اثر ہے کہ جونسا علاقہ فتح کیا، وہاں امن اور عدل و انصاف کا نظام قائم کیا، رعایا کی فلاح و بہبود کا پورا خیال رکھا۔ ان سے معاہدات کی پابندی کی اور وہاں علم و تہذیب کی روشنی فروزاں کر کے ان کو اپنا ہمدرد اور دوست بنایا ہے۔ اپنے دشمن پیدا نہیں کیے۔ مسلمانوں کے دشمن اس وقت پیدا ہونے لگے۔ جب مسلمانوں نے خود جہاد کی رُوح کو ختم کر کے اسے عام دنیوی جنگوں میں بدل دیا۔ پھر اس کے نتائج بھی وہی ہونا چاہئیں تھے۔ جو عام دنیوی جنگوں سے پیدا ہوتے ہیں۔



باب نہم

چند ضمنی مباحث

اسلام اور بانی اسلام پر چند اعتراضات کا جائزہ

(۱) اشاعتِ اسلام اور تلوار

مستشرقین کا یہ پروپیگنڈہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ کہ ''اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے''۔ اور اس اعتراض کے کافی وشافی جواب بھی دیے جا چکے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراض نہ عقلی اعتبار سے درست ہے نہ نقلی اعتبار سے۔ مزید برآں تاریخی واقعات بھی اس اعتراض کے تائید کی بجائے تردید کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر سا جائزہ پیش کریں گے۔

(۱) اسلامی تعلیمات کی کسوٹی پر:

نقلی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ نظریہ اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

ارشاد باری ہے۔

﴿لا اکراہ فی الدین۔﴾ (۲۵۶:۲) (دین میں کوئی جبر نہیں۔)

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

﴿افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین۔﴾ (۹۹:۱۰) (کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ مومن ہو جائیں۔)

اللہ تعالیٰ عوام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

﴿فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر﴾ (۲۹:۱۸) (جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔)

ایسی واضح ہدایات کی موجودگی میں کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس حکم کی خلاف ورزی کی ہوگی اور ان واضح احکام کے بعد کسی کو اسلام لانے پر

مجبور کیا ہوگا۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

﴿وان احد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلام الله ثم ابلغه مأمنه -﴾ (اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کلام اللہ سن لے پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچادو۔) (۶:۹)

غور فرمایئے کہ تلوار یا دباؤ کے استعمال کا اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا ہے۔ جب ایک مشرک کسی مسلمان کی پناہ میں آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے مجبور کرو یہاں تک اسلام لے آئے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اسلام کی تبلیغ پورے طور پر کردو۔ ماننے نہ ماننے یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ پھر اگر وہ نہیں مانتا تو بھی تمہیں اس پر زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے بجائے تمہیں یہ چاہیے کہ ایسی صورت میں اسے کسی محفوظ مقام پر پہنچادو۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام اسبق ایک عیسائی تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ کیونکہ آدمی سمجھدار اور ہوشیار تھا۔ آپ نے اسے یہ بھی کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ ہم مسلمانوں کے کام میں تم سے مدد لیں گے۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ آپ اسے کوئی اچھا منصب عطا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب اس پر اسلام پیش فرماتے تو وہ انکار کر دیتا اور آپ لا اکراہ فی الدین کہہ کر چپ ہوجاتے۔ (الجہاد فی الاسلام ص ۱۶۳)

(۲) عقل کی کسوٹی پر:

عقلی اعتبار سے یہ مفروضہ اس لیے غلط ہے۔ کہ تلوار کے زور سے کسی سے کوئی بات منوائی نہیں جاسکتی اور اگر بجبر و اکراہ کوئی شخص ایک بات مان بھی جائے تو اسے اس بات پر قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مسلمان ہوئے۔ وہ دل جان سے اسلام کے فدائی اور شیدائی بن گئے۔ بلاشبہ کچھ لوگ مرتد بھی ہوئے۔ لیکن ان کا شمار ایک فی ہزار بھی نہیں۔ اور یہ تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

اگر تلوار کے ذریعہ کوئی بات منوائی جاسکتی ہے۔ تو قریش مکہ نے حضور اکرمؐ اور دوسرے مسلمانوں سے اپنی بات کیوں نہ منوالی۔ جبکہ انہوں نے اپنی ایڑی چوٹی کا زور بھی صرف کرلیا تھا یا

جن مشہور فاتحین نے بہت سے علاقے فتح کیے۔ ان میں سے کوئی ایسا بھی مفتوح علاقہ بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جس نے فاتح قوم کے نظریات کو محض تلوار کے زور سے دل جان سے تسلیم کر لیا ہوگا۔

تاریخی حقائق کی کسوٹی پر:

اگر تلوار کے ذریعہ اسلام پھیلنے کے نظریہ کو درست سمجھ لیا جائے تو مندرجہ ذیل سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔

(۱) ابتداءً جو لوگ مسلمان ہوئے اور ۱۳ سال تک مکہ میں ظلم وستم کی چکی میں پستے رہے انہیں کون سی تلوار نے مسلمان کیا تھا؟

(۲) مدینہ پہنچ کر جنگ بدر کے میدان میں مسلمانوں کے پاس کون سی تلوار تھی؟ تلوار اگر تھی تو وہ قریش کے پاس تھی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جنگ بدر تک کے چودہ سال میں صرف ۳۱۳ مجاہدین اسلام سامنے آتے ہیں لیکن ایک سال بعد جنگ احد میں یہ تعداد سات سو تک جا پہنچتی ہے۔ یعنی ایک سال میں تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ اضافہ کون سی تلوار نے کیا تھا؟

(۳) جنگ احد میں بھی تلوار دشمن کے پاس تھی جو تعداد میں چار پانچ گنا بھی تھا اور مسلح بھی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تلوار والوں سے بہت سی تعداد مسلمانوں سے آملتی ہے۔ اور دو سال بعد جنگ خندق کے موقعہ پر مجاہدین کی تعداد ۳ ہزار یعنی جنگ احد سے چار گنا ہو جاتی ہے۔

(۴) صلح حدیبیہ میں تلوار کا مسئلہ ہی سامنے نہیں آیا۔ لیکن مسلمانوں کی جمعیت میں لاتعداد اضافہ ہو گیا۔

(۵) یہودیوں سے جو جنگیں ہوئیں ہیں۔ ان میں بھی تلوار یہودیوں کے پاس تھی۔ جیسا کہ ان کا اپنا بیان ہے۔ ان کی مشہور جنگ خیبر تھی۔ جس میں مسلمان صرف چودہ سو تھے اور یہود ۱۰ ہزار۔ اس کے نتیجہ میں بھی بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

(۶) فتح مکہ میں یہی صورت حال پیدا ہوئی۔ قریش مکہ کو عام معافی تو مل چکی تھی۔ پھر انہیں اسلام لانے پر کون سی تلوار نے مجبور کیا۔

(۷) محاصرہ طائف میں محاصرہ اُٹھا لینے کے بعد اہل طائف کو اسلام لانے کی کیا مجبوری آگئی تھی؟

مندرجہ بالا پہلوؤں پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ یہ مفروضہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ لیکن ایک حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور وہ یہ کہ ''اسلام نہایت کثرت سے پھیلا ہے''۔ اب ہمیں ایسے اسباب تلاش کرنے چاہییں۔ جو اس کثرت اشاعت کا باعث بنے۔ ہمارے خیال میں یہ اسباب اسلام کی ذاتی خصوصیات ہیں۔ جن میں سے چند ایک کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

اشاعت اسلام کے اسباب

(۱) معاشرتی مساوات:

کوئی شخص یا کوئی قوم جس وقت اسلام لاتی ہے۔ اسی وقت سے اسے سابقہ مسلمانوں کے سے جملہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو کثرت اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ بنی۔

جرمن قوم اگر کوئی علاقہ فتح کرے۔ تو مفتوحہ قوم کتنا ہی جرمن قوم جیسا اپنے عادات و اطوار کو ڈھال لے۔ اور اپنے آپ کو فاتح قوم کے رنگ میں رنگنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔ پھر بھی وہ جرمن قوم میں شمار نہیں ہو سکتی اور نہ ہی جرمن قوم اسے اپنی قوم جیسے اور جتنے حقوق عطا کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ یہی حال دوسری فاتح اور مفتوح قوموں کا ہے۔ لیکن مسلمان اگر کسی علاقہ کو فتح کریں۔ اور مفتوحہ علاقہ اسلام لے آئے تو فاتح و مفتوح کے درجہ میں چنداں فرق نہیں رہتا۔ مفتوحہ علاقہ اسلامی سلطنت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس پر نہ کوئی جزیہ نہ خراج اور نہ ہی حکمران کی تبدیلی غرضیکہ اسلامی حکومت ایسے مفتوحہ علاقے میں کسی قسم کی انتظامی تبدیلی نہیں کرتی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حکمران اپنے ذاتی اوصاف کی بنا پر اسلامی حکومت میں پہلے سے بھی زیادہ معزز بن جائے۔ اور ہمیں تاریخ سے ایسے کئی واقعات مل جاتے ہیں۔ کہ کئی حکمرانوں اور قوموں نے اسلام اسی وجہ سے قبول کیا تھا۔

یزدگرد کے مقدمۃ الجیش کے سالار کا نام سیاہ تھا۔ یزدگرد نے تین سو بڑے بڑے

رئیس اور پہلوان اس کے ہمراہ کیے کہ اصطخر کی طرف جا کر اسلامی فوج کا مقابلہ کرے جب اسلامی فوجیں تستر پہنچیں تو سیاہ اپنے سرداروں کے ساتھ ان اطراف میں مقیم تھا۔ ایک دن اس نے تمام ہمراہیوں کو جمع کر کے کہا کہ ''ہم لوگ جو پہلے کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ (عرب) ہمارے ملک پر غالب آ جائیں گے۔ اس کی روز بروز تصدیق ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ خود اسلام قبول کرلیں''۔ چنانچہ اسی وقت سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

(فتوح البلدان ص ۳۷۴)

یہی صورت حال شام اور مصر کے اطراف میں بھی تھی۔ اور لوگ عہد فاروقی میں کثرت سے مسلمان ہوئے۔ جو کہ اسلام کی فیوض و برکات کی وجہ سے مسلمان ہوئے تھے۔ تلوار کے زور سے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو بھی مسلمان نہ بنا سکے۔ دوسروں کو کیسے بنا سکتے تھے؟

اسی معاشرتی مساوات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام ذات پات میں تمیز کا قائل نہیں۔ نہ گورے کو کالے پر کچھ فوقیت ہے، نہ عربی کو عجمی پر بلال رضی اللہ عنہ حبشی کو امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ''سیدنا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ مسجد میں آقا و غلام گورے اور کالے، نچلی اور اونچی ذات والے، امیر اور غریب سب ایک ہی صف میں ایک ہی حیثیت سے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اسلام کو شرف حاصل رہا ہے کہ پہلے بھی اور آج بھی معاشرہ کا نچلے درجہ کا طبقہ، جسے اونچے درجے کا طبقہ عموماً دھتکار دیتا ہے، ہمیشہ اسلام کے دامن میں آ کر پناہ لیتا رہا ہے۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے۔ اخبارات میں ایک خبر جو اس طرح کے عنوان سے شائع ہوئی تھی:۔

''جنوبی بھارت میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے مظالم سے تنگ آ کر ۱۳۰۰ نے اسلام قبول کرلیا''۔ (نوائے وقت۔ ۴/ جولائی ۱۹۸۱ء)

بتایئے ان ہریجنوں کو کون سی تلوار نے اسلام لانے پر مجبور کیا تھا؟ پھر ۱۵/ جولائی کو اسی اخبار نوائے وقت میں ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا ''مجھے تکلیف ان لوگوں کے اسلام لانے پر نہیں بلکہ اسباب پر ہے؟

اور یہ ''اسباب'' جن پر وزیر اعظم صاحبہ کو افسوس ہوا۔ وہ تو ان کے مذہب کا جزو لاینفک ہیں۔ ہندو مت برہمن کو تو بالاتر مخلوق سمجھتا ہے لیکن شودر کو انسان بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ شودر برہمن کا پیدائشی غلام ہے۔ اور غلامی کا یہ پھندا کسی صورت اس کی گردن سے اتر نہیں

سکتا"۔ انہی "اسباب" کو اسلام نے ختم کیا۔ اور انہی اسباب کے خاتمہ کی وجہ سے اسلام ہر دور میں پھیلتا رہا اور ہندوستان میں بھی پھیلا۔

اب یہاں سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ ان ہریجنوں نے ہندومت کی ذات پات کے اس انسانیت کش تقسیم سے تنگ آ کر آخر اسلام ہی کیوں قبول کیا۔ کوئی دوسرا مذہب کیوں نہ قبول کر لیا۔ اس بات کا جواب نوائے وقت ۳۱/ جولائی ۱۹۸۱ء کی مندرجہ ذیل خبر سے آپ کو مل جائے گا۔ خبر کا عنوان ہے "پانڈیچری میں ڈیڑھ ہزار برہمن مسلمان ہو گئے۔"

"پانڈیچری۔ ۳۰/ جولائی (ن۔ا) ہریجنوں کے لیڈر مسٹری کرشنا مورتی نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اخباری نمائندوں کو بتایا کہ عیسائی مذہب قبول کرنے سے سماجی حیثیت بلند نہیں ہوتی۔ لیکن مسلمان ہونے سے ہمارا سماجی مرتبہ بڑھ جاتا ہے۔ ہمارا یہ فیصلہ حتمی ہے اور اس میں کوئی سیاسی مصلحت نہیں ...... واضح رہے کہ اس سے قبل تامل ناڈو کے موضع میناکشی پورم میں ہریجنوں نے اجتماعی طور مذہب اسلام قبول کر لیا ہے"۔ (نوائے وقت۔ حوالہ مذکور۔ ص ۸)

(۲) قانونی مساوات:

قانونی مساوات سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ کا کوئی ممتاز سے ممتاز فرد حتی کہ صدر مملکت بھی قانون کی دسترس سے بالاتر نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے۔ جو اسلامی ریاست کے علاوہ اور کہیں پایا جانا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس ریاست میں اقتدار اعلیٰ اللہ کی ذات ہے۔ باقی سب لوگ ایک ہی سطح پر اس کے محکوم اور اطاعت گزار بندے۔ ایک دفعہ خود حضور اکرم ﷺ نے اپنے آپ کو پیش کر کے یہ اعلان کر دیا۔ کہ "جس کسی نے مجھ سے کوئی بدلہ یا قصاص لینا ہو وہ آج لے سکتا ہے"۔ پھر جب آپ ﷺ کے قبیلہ قریش کی ذیلی شاخ کی ایک عورت فاطمہ مخزومی نے چوری کی تو آپ ﷺ سے اس جرم کی سزا موقوف کرنے کی سفارش کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

"پہلی امتوں کی ہلاکت کا سبب ہی یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی کمزور جرم کرتا تو اسے سزا دیتے اور اگر شریف وہی جرم کرتے تو ان کی سزا موقوف کر دی جاتی یہ تو فاطمہ مخزومی کی بات ہے۔ خدا کی قسم! اگر میری اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنھا بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا"۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب مقام النبی بمکۃ زمن الفتح)

خلافت راشدہ کے عہد میں کئی بار ایسا ہوا۔ کہ خلیفہ وقت کو مدعی یا مدعا علیہ کی صورت میں عدالت میں پیش ہونا پڑا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اکثر فیصلہ ان کے خلاف صادر ہوا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے انتخاب کے بعد خطبہ جو ارشاد فرمایا۔ اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں۔ ''تمہارا کمزور میری نگاہوں میں قوی ہے۔ اور قوی میری نگاہوں میں کمزور ہے''۔ جس کا مطلب واضح الفاظ میں یہ تھا۔ کہ تمام قانونی طاقتیں کمزور کے ساتھ ہیں جب تک کہ اسے ظالم سے اس کا حق نہ دلوا دوں اور طاقتور کو قانون کی طاقت سے ظلم سے روکنے کی پوری کوشش کروں گا۔

چنانچہ ان خلفاء نے ایسا نظام عدالت رائج کیا جہاں مفت اور بلا تاخیر انصاف حاصل ہوتا تھا۔

''دور فاروقی میں شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے حضرت معاذ بن جبل کو رومیوں کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ شہنشاہ کا دربار اور اس کی شان وشوکت دیکھ کر آپ نے فرمایا:''

''تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر وہ زنا کرے تو اس کو درے لگائے جائیں گے۔ چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں، وہ پردے میں نہیں بیٹھتا۔ اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا۔ مال و دولت میں اس کو ترجیح نہیں''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے دور خلافت میں ان کی اپنی زرہ چوری ہوگئی۔ جو آپ نے ایک یہودی کے پاس دیکھ لی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کیا کہ یہودی سے اپنی زرہ چھین کر اسے کیفر کردار کو پہنچا دیتے۔ بلکہ قاضی شریح کی عدالت میں اس یہودی پر دعویٰ دائر کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گواہ ان کے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے غلام تھے۔ قاضی شریح نے آپ کا مقدمہ صرف اس بنا پر خارج کر دیا کہ یہ شہادتیں اسلامی ضابطہ عدل کے تقاضے پورے نہیں کرتیں۔ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں اور غلام کی شہادت اپنے آقا کے حق میں ناقابل قبول ہے۔ حالانکہ عدالت کو خوب معلوم تھا کہ مدعی اور گواہ سب عادل اور ثقہ ہیں لیکن عدل کا تقاضہ یہی تھا کہ مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

یہ صورت حال دیکھ کر یہودی نے زرہ بھی واپس کر دی اور خود بھی مسلمان ہوگیا۔

غور فرمائیے۔ اس یہودی کو اسلام لانے پر کس بات نے مجبور کیا تھا؟ اور یہ بھی سوچیے کہ کیا وہ اکیلا ہی مسلمان ہوا ہوگا؟ اور یہ بھی کہ مسلمان ہوا تو اس نے زرہ کیوں واپس کر دی؟ ایسے واقعات دراصل انفرادی نتائج کے حامل نہیں ہوتے بلکہ ایک جہان کے افکار و نظریات میں تلاطم برپا کر دیتے ہیں۔

(۳) کردار کی پاکیزگی:

ہمارے خیال میں اشاعت اسلام کا تیسرا بڑا سبب مسلمانوں کے کردار کی بلندی اور پاکیزگی ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کا سب سے بڑا ذریعہ تبلیغ ان کا اپنا عمل و کردار تھا۔ ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے پاک تھی۔ دشمن ان کے کردار کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

دمشق اور حمص میں شکست کے بعد عیسائی انطاکیہ پہنچے اور وہاں جا کر ہرقل شہنشاہ روم سے فریاد کی کہ اہل عرب نے تو تمام شام کو پامال کر دیا۔ ہرقل نے ان میں چند تجربہ کار اور معزز آدمیوں کو دربار میں بلا کر کہا کہ "عرب تم سے زور میں، جمعیت میں ساز و سامان میں الغرض ہر لحاظ سے کم ہیں۔ پھر تم ان کے مقابلے میں کیوں نہیں ٹھہر سکتے؟ اس پر سب نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ اس پر ایک تجربہ کار بڈھے نے عرض کی کہ:۔

"عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں۔ وہ رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزے رکھتے ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کے ساتھ ملتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پیتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ ان کے کام میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے۔ اور ہمارا جو کام ہوتا ہے وہ ہمت اور استقلال سے خالی ہوتا ہے"۔

(الفاروق ص ۱۸۹)

اس بڈھے عیسائی کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ پھل پک کر تیار ہو چکا ہے اور عنقریب اسلام کی جھولی میں جانا چاہتا ہے۔ محمد بن قاسم سندھ اور ملتان کے علاقہ میں تھوڑی ہی مدت رہا۔ وہ عظیم جرنیل ہونے کے علاوہ جہاں بانی کی صفات سے بھی مالا مال تھا۔ ہندو حکومت اور سندھی بت پرستوں سے مذہبی رواداری نے سندھیوں کے دلوں کو کچھ اس طرح موہ لیا تھا کہ جب محمد بن

قاسم سندھ سے واپس گیا تو یہی سندھی اس کی تصویریں بنا بنا کر اپنے پاس رکھتے تھے۔ وہ اسے رحمت کا فرشتہ سمجھتے تھے۔ پھر جب انہیں محمد بن قاسم کی دردناک موت کا حال معلوم ہوا تو سارے ملک نے سوگ منایا۔ (تاریخ اسلام۔ حمید الدین ص ۳۰۸)

یہ سندھی لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ پھر آخر وہ کیا چیز تھی۔ جس نے انہیں محمد بن قاسم کا اس قدر گرویدہ بنا دیا تھا۔ محمد بن قاسم نے بھی انہیں مسلمان بنانے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود از خود اسلام کے قریب تر آ رہے تھے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمان ہو گئے تھے۔ کیا یہ تلوار کا کرشمہ تھا؟

(۴) معاملات کی صفائی:

اسلام میں اکل حلال کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ جائز و ناجائز کی بڑی تفصیل کرتا اور ناجائز ذرائع سے کمائے ہوئے مال کو حرام قرار دیتا ہے۔ لین دین اور معاملات کی صفائی بالخصوص ایسے حالات میں ایک امتحان بن جاتی ہے۔ جب کہ کسی محنت یا حق کا معاوضہ تو پیشگی وصول کیا جا چکا ہو۔ اور اس حق یا محنت کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کا اختیار بھی کلیتاً معاوضہ وصول کرنے والے کے ہاتھ میں ہو۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص یا ادارہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں تمیز کرتا ہے، تو وہ فی الواقع قابل تعریف ہے۔ اور دوسرے لوگ اس کے کردار کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شام کی فتوحات کے سلسلہ میں کچھ جنگی مصلحتوں کے پیش نظر مسلمانوں کو حمص سے واپس جانا پڑا مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اہلیان حمص سے جزیہ وصول کر چکے تھے اور ان کی دفاعی حفاظت قبول کر چکے تھے آپ نے ان لوگوں کو اکٹھا کر کے کہا۔ ''ہم کو جو تعلق تمہارے ساتھ تھا۔ وہ اب بھی ہے، لیکن چونکہ اس وقت تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے اس لیے جزیہ جو خدمت کا معاوضہ ہے۔ تم کو واپس کیا جاتا ہے''۔ چنانچہ کئی لاکھ وصول شدہ رقم واپس کر دی گئی۔

عیسائیوں پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہو کہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ خدا تم کو واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے کہا۔

''تورات کی قسم! جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے اور ہر جگہ چوکی کا پہرہ بٹھا دیا۔'' (الفاروق ص ۱۹۱)

اب دیکھئے یہودی حمص پر عیسائیوں کا قبضہ گوارا نہیں کر سکتے اور ان پر مسلمانوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ عیسائی خود بھی ہرقل کے بجائے مسلمانوں کے چلے جانے پر آنسو بہاتے ہیں۔ تلوار کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب ان لوگوں کے دلوں کو کس چیز نے مسحور کر دیا تھا؟

(۵) عفوو درگزر:

جب کسی دشمن پر پوری طرح قابو پا لیا جائے۔ اس وقت اس کے جرائم سے چشم پوشی کر کے اسے معاف کر دینا بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ یہ بھی اشاعت اسلام کے اسباب میں سے ایک بڑا اہم سبب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ:۔

(۱) غزوہ ذات الرقاع سے واپسی پر ایک بدو درخت سے لٹکی ہوئی تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا۔ جب کہ آپ ﷺ سو رہے تھے۔ آپ ﷺ اُٹھے تو اس بدو نے، جو کہ آپ ﷺ کے دشمن قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، کہا۔ اب تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے کہا۔ ''میرا اللہ'' یہ سنتے ہی اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ تلوار ہاتھ سے گر گئی۔ آپ ﷺ نے تلوار سنبھال لی۔ بعد ازاں اسے معاف کر دیا (یہ واقعہ تفصیل سے گزر چکا ہے) اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ خود ہی مسلمان نہیں ہوا بلکہ اس کا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا۔ اشاعت اسلام کا یہ کام اس وقت ہوا جب تلوار نے اپنا کام چھوڑ دیا تھا۔

(۲) صلح حدیبیہ کے وقت ابتدائی سفارتی بات چیت کے دوران چند نوجوانان قریش ۲۰۰ کی جمعیت اکٹھی کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ جنہوں نے مسلمانوں سے شکست کھائی اور وہ گرفتار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے خیر سگالی کے طور پر ان سب کو چھوڑ دیا۔ صلح حدیبیہ میں بھی توہین آمیز شرائط قبول کر کے لڑائی پر صلح کو ترجیح دی جس کا اثر یہ ہوا کہ بے شمار قبائل از خود مسلمان ہو گئے۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

(۳) فتح مکہ کے دوران آپ ﷺ نے اپنے ازلی دشمنوں پر پوری طرح قابو پا لینے کے بعد عام معافی کا اعلان کیا۔ تو اس کا اثر یہ ہوا کہ اسلام اتنی تیزی سے پھیلا کہ اس سے پہلے

اس کی مثال نہیں ملتی۔

یہ اور ایسے کئی دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سختی، جبر یا تلوار وہ کام کبھی نہیں کر سکتی جو نرمی اور عفو و درگزر سے از خود سر انجام پا جاتا ہے۔

قول فیصل

مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ اور بھی کئی باتیں ہیں۔ جو اسلام کی اشاعت کا باعث بنیں۔ لیکن بایں ہمہ حقیقت یہی ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کو بھی ایک گونہ ضرور تعلق ہے۔ گو یہ دسواں حصہ ہی کیوں نہ ہو۔ معاندین اسلام جو اس بات پر سارا زور صرف کر دیتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، وہ بھی ایک انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔ دوسرا گروہ اس الزام کی مدافعت میں سارا زور اس بات پر صرف کرتا ہے۔ کہ اسلام کی اشاعت محض اس کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر ہوئی۔ ہمارے خیال میں اسلام کے حامیوں کا یہ گروہ بھی دوسری انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ مانا کہ اسلام میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن ان خوبیوں کو آشکار کرنے اور ''حق'' کو بروئے کار لانے کے لیے بھی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قوت اسلام کو تلوار کے ذریعہ مہیا ہوئی اگر اشاعت اسلام میں تلوار کا کچھ بھی حصہ نہ تھا تو جہاد کی ترغیب کیوں دی گئی۔

اشاعت اسلام میں تلوار کا حصہ:

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ (۱) امر بالمعروف (۲) نہی عن المنکر۔ امر بالمعروف کو ماننا یا انکار کر دینا مخاطب کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے کو عقیدۂ توحید یا آخرت یا اسلام لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اور وہ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ تو اس پر جبر کیا جا سکتا ہے۔ نہ تلوار سے ڈرایا دھمکایا جا سکتا ہے۔ اور جہاں تک نہی عن المنکر کا تعلق ہے۔ تو یہ فریضہ تلوار کے سوا پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام محض عقائد و نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید قانون ہے۔ جو مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا اور اس قانون کے نفاذ کے لیے قوت چاہتا ہے۔ اگر کسی جگہ ظلم ہو رہا ہو۔ زنا، چوری، ڈاکہ، قتل و غارت کی وارداتیں ہو رہی ہوں۔ لوگوں کا امن و چین غارت ہو رہا ہو۔ تو اسلام حرکت میں آئے گا اور تلوار ہاتھ میں لے کر اس کی اصلاح کرے گا خواہ یہ علاقہ مشرکین کا ہو یا اہل کتاب کا اور خواہ اس میں مسلمان ہی رہتے ہوں۔

حضور ﷺ کی مکی زندگی میں چونکہ اسلام کے پاس قوت نہیں تھی۔ لہذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں طرح کے کام زبانی تبلیغ سے سرانجام دیئے جاتے رہے۔ قرآن جیسا معجزانہ کلام، حضور اکرم ﷺ کا سا بلند کردار، آپ ﷺ کے جان نثاروں کی قربانیاں خود حضور اکرم ﷺ کا اپنی جان تک تبلیغ میں کھپا دینا۔ اور بہترین طریق تبلیغ، ان سب طرح کی کوششوں کے باوجود یہ تو نہ ہو سکا کہ قریش مکہ ایمان لے آتے۔ بے شک وہ اسلام کی حقانیت کے دل سے معترف ہو چکے تھے۔ لیکن اسلام ضابطہ اور کچھ پابندیاں بھی عائد کرتا تھا جو انہیں گوارا نہ تھیں۔ انہیں اپنے بعض مفادات سے بھی دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ جس کے لیے وہ قطعاً تیار نہ تھے۔ جو مزے انہیں اپنی خود پسند اور بے ضابطہ زندگی میں حاصل ہو رہے تھے۔ اسلام لانے کی صورت میں ان میں سے اکثر سے دست بردار ہونا پڑتا تھا۔

تلوار کا کام فقط یہ ہوتا ہے کہ وہ بگڑی ہوئی طبیعتوں کو راہ راست پر لے آتی ہے۔ وہ ہدایت کے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کر دیتی ہے۔ پھر جو طبائع نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ ان کے لیے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور جب تک معصیت اور ظلمت کے یہ پردے چاک نہ ہوں۔ تبلیغ خواہ کتنی ہی دل نشیں انداز میں ہو غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر تلوار کا اشاعت اسلام میں کچھ حصہ نہ ہوتا تو حضور اکرم ﷺ کو مکہ سے ہجرت کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی۔

تلوار کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ تبلیغ کے بیج کے لیے زمین کو نرم کر دیتی ہے۔ اسلام کی تلوار نے حق کی دشمن اور باطل قوتوں کا قلع قمع کر کے اسلام کے بیج کے لیے زمین کو ہموار اور نرم بنا دیا۔ اسلام کے بیج میں اتنی اہلیت اور قوت ہے کہ اگر اسے فضا سازگار میسر آ جائے تو پھل پھول کر تناور اور سدا بہار درخت بن سکتا ہے۔

(۲) جہاد فی سبیل اللہ اور عام جنگوں میں فرق

مستشرقین نے یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی ہے کہ عام دنیا کی جنگوں اور جہاد میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں کا مقصد کشور کشائی اور اپنی ہمسایہ قوموں کو مفتوح بنا کر ان سے مالی مفاد حاصل کرنا ہے۔ اس دلیل کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ سونا اور پیتل ایک ہی چیز ہے۔ کیونکہ دونوں چیزیں دھات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا رنگ بھی ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام میں کشور کشائی مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات نظام عدل کا قیام ہے۔ یہ نظام عدل بعض دفعہ کشور کشائی کے بغیر بھی میسر آ جاتا ہے۔ اور کشور کشائی کے بعد بھی یہ قائم نہ ہو۔ تو اسلامی نکتہ نظر سے ایسی فتح کا کوئی جواز نہیں۔ اگر ہم ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے۔ جہاد اور عام جنگیں، اپنے مزاج، مقاصد، طریق کار، انجام کار اور نتائج غرض ہر بات میں ایک دوسرے سے مختلف اور مباین ہیں جس کی وضاحت اس کتاب میں جا بجا مناسب مقامات پر پیش کی جا چکی ہے۔ ذیل میں ہم انہیں یک جا طور پر پیش کرتے ہیں۔

(۱) مقاصد کا فرق:

دنیا میں ہمیشہ یہی چلا آیا ہے کہ بھائی بھائیوں کی مدد میں لڑے ہیں۔ قبیلے قبیلوں کی حمایت، خاندان خاندانوں کی حفاظت کیلئے حتیٰ کہ اہل ملک، ملک کی حمایت وحفاظت میں جانیں دیتے رہے ہیں۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی قوم یا ملک کے ذاتی مفادات یا سیاسی مفادات کو دنیا میں پیدا شدہ کسی بھی واقعہ سے آنچ آنے لگی۔ تو وہ لڑائی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی ذات کو یا اپنے ملک کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے مفادات کو آنچ نہ بھی آئے تو بھی وہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم دوسروں کو مفتوح بنا کر سربلند ہو اور دنیا میں اپنا نام پیدا کرے۔ دنیا میں جب بھی اور جہاں بھی کوئی جنگ ہوئی، انہیں میں سے کسی ایک مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ لیکن اسلام ان تینوں مقاصد میں سے کسی کو بھی درست تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ وہ جنگ کا مقصد صرف یہ قرار دیتا ہے کہ دنیا سے فتنہ وفساد کا خاتمہ ہو اور اللہ کا بول بالا ہو۔ فتنہ وفساد کا خاتمہ اگر جنگ کیے بغیر ہو سکتا ہے تو جنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب دیکھئے کہ قرآن کریم نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہاں سرے سے کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں۔ جنگ نہیں ہوئی تو پھر فتح کیسی اور فتح مبین کیسی؟ یہ صلح اس لحاظ سے فتح مبین قرار دی گئی کہ فتنہ وفساد کو ختم اور نیست و نابود کرنے کے لحاظ سے جتنے شاندار نتائج اس صلح سے ہوئے۔ اگر جنگ برپا ہو جاتی اور اس میں مسلمانوں کو فتح بھی حاصل ہو جاتی تو اس کے ایسے شاندار نتائج متوقع نہ تھے۔

پھر جس طرح بدن کے کسی پھوڑے کے زہر سے باقی بدن کو بچانے کے لیے اس کا اپریشن ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کے فتنہ پرداز عناصر کے زہر سے باقی معاشرہ کو بچانے کے لیے اور اس فسادی گروہ کا قلع قمع کرنے کے لیے جنگ کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر کی چیر پھاڑ کی وجہ سے اسے کوئی ظالم یا درندہ صفت نہیں کہتا کیونکہ اس کا مقصد بگاڑ کی بجائے اصلاح ہوتی ہے۔ اس طرح اسلام صرف فتنہ وفساد کے خاتمہ کے لیے جنگ کو جائز بلکہ ضروری قرار دیتا ہے۔ اور یہ انسانیت کی بہبود کیلئے برپا کی جاتی ہے۔ پھر جس طرح ڈاکٹر فی نفسہ مریض کا ہمدرد، خیر خواہ اور اس کے لئے رحم کے جذبات رکھتا ہے بعینہ اسلام فی نفسہ ایک صلح پسند دین ہے۔ جنگ سے وہ حتی الامکان گریز کرتا ہے مگر جہاں اس کے بغیر چارہ نہ رہا ہو صرف اسی وقت اسے ضروری سمجھتا ہے۔

(۲) طریق کار میں فرق:

دنیا کی عام جنگوں میں جنگ جیتنے کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اندھا دھند کشت وخون، شبخون، بے دریغ بمباری، دشمن کی املاک کی بربادی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عہد شکنی کرنا اور خفیہ معاہدات یہ سب کچھ مقصد کے حصول کے لیے جائز سمجھے جاتے ہیں۔ اگر افواج سے اخلاق یا کسی ضابطہ جنگ کی پابندی کا ذکر کیا جائے تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ بھلا جنگ کا ضابطہ اخلاق سے کیا تعلق؟ ضابطہ اخلاق سے کوئی بات طے نہ ہونے سے ہی تو جنگ برپا ہوتی ہے۔ پھر جنگ کے دوران اس ضابطہ اخلاق کے کیا معنی؟ لیکن اسلام مجاہدین کو جنگ لڑنے کا مکمل ضابطہ پیش کرتا ہے۔ اور اس پر کاربند رہنے کی سختی سے ہدایت کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے ایسی جنگ جس میں اس کے مقررہ ضابطہ کی پابندی نہ کی گئی ہو، جہاد فی سبیل اللہ نہیں کہلا سکتی۔ پھر اس ضابطہ اخلاق کا بھی اصل الاصول یہ ہے کہ دشمن کا جانی یا مالی نقصان صرف اس حد تک جائز اور درست جس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ اور یہ نقصان بھی ان حدود وقیود کے تحت ہو۔ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

انجام کار جنگ کا فرق:

فتح کے بعد بالعموم فاتح اقوام دشمن کے شہر کو نذر آتش کر دیتی ہیں۔ قتل عام کا بازار گرم کرتی ہیں۔ اور جوش انتقام میں ہر طرح سے وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ لیکن اسلام ایسی تمام حرکات کو گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ اگر اصل مقصد فتنہ وفساد کا خاتمہ تھا۔ جو فتح کے ذریعہ حاصل ہو گیا۔ اب اس کے بعد ایسی حرکات کا کوئی جواز نہیں۔ جنگ کے بعد ایسا فتنہ وفساد اسلامی

مقصد جنگ کے اصل مقصد کے عین متضاد ہے۔

فتنہ وفساد کا خاتمہ ہی تو جنگ کا اصل مقصد ہے۔ اگر جنگ کے بعد بھی یہ فتنہ کھڑا ہو جائے تو جنگ کرنا ہی بے مقصد اور عبث فعل بن جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عام دنیا کی جنگیں فتنہ وفساد اور ظلم کے وجود کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے نتیجہ میں فتنہ وفساد ہی لاتی ہیں۔ جبکہ اسلام میں جنگ ایسی جنگوں کو ختم کرنے کے لیے لڑی جاتی ہے۔ انتقامی کاروائیوں سے اس لیے روکا گیا ہے کہ وہ آئندہ کسی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

نتائج میں فرق:

جنگ وجدال کے نتیجہ میں انسان اپنے دشمن بدخواہ اور حاسد تو پیدا کر لیتا ہے۔ دوست اور جاں نثار ساتھی پیدا نہیں کر سکتا۔ تلوار کا زخم نفرت اور عداوت ہی پیدا کرتا ہے محبت اور ہمدردی عطا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مفتوح قوم کو جس وقت بھی اپنے پاؤں پر سنبھلنے کا موقعہ ملتا ہے تو وہ فاتح قوم سے انتقام لینے کی تیاریاں شروع کر دیتی ہے۔ اور اس طرح دنیا میں فتنہ وفساد کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔

لیکن اسلامی جنگوں کے نتائج اس سے برعکس نکلتے ہیں۔ یہاں دشمن کے بجائے دوست اور ہمدرد پیدا ہوتے ہیں نفرت کی بجائے عقیدت اور محبت بڑھتی ہے۔ طائف کا محاصرہ اٹھانے کے بعد وہ لوگ انتقام کے موقع کی تلاش نہیں کرتے بلکہ فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔ صلح حدیبیہ کی بظاہر توہین آمیز شرائط کے باوجود اور قدرت رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی صلح جویانہ پالیسی خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جیسے عظیم جرنیلوں کے ذہنوں کے رخ موڑ دیتی ہے۔ اور وہ اسلام کے سچے خدمت گزار بن جاتے ہیں۔ سہیل بن عمرو جو قریش مکہ کے نمائندہ اور صلح حدیبیہ کے ایک فریق تھے، اسی واقعہ سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوتے اور خطیب اسلام کہلاتے ہیں۔ فتح مکہ میں فتح کے بعد صرف اہل مکہ ہی اس ''اخلاقی ضرب'' سے اسلام کے ہمنوا نہیں ہو جاتے۔ بلکہ تمام قبائل عرب اسلام قبول کر کے اس کی قوت میں اضافہ کا سبب بن جاتے ہیں۔ بتائیے کہ دنیوی جنگ نے بھی کبھی ایسے نتائج پیدا کیے ہیں؟

دور نبوی ﷺ کی تمام جنگوں میں سے صرف غزوۂ خیبر اور غزوۂ مکہ پر کشور کشائی کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ باقی جنگیں یا دفاعی مقاصد کے لیے لڑی گئیں یا سرحدوں کی حفاظت کے

لیے۔

اسلام کو کشور کشائی سے جس قدر رغبت ہے۔ یہ تفصیل بھی باب ۶ زیر عنوان کشور کشائی کے تحت گزر چکی ہے۔ اسی طرح اس اعتراض کی بھی وضاحت پیش کی جا چکی ہے کہ کیا مسلمانوں نے بھی عام دنیا کی طرح مالی منفعت حاصل کرنے کے لیے کشور کشائی کی تھی۔ مفتوحہ علاقوں سے مالی منفعت کے حصول کا مسئلہ یوں سمجھیے۔ کہ ایک دنیا دار بھی دنیا کماتا ہے۔ جس میں وہ حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر ہر وہ حربہ استعمال کرتا ہے جس سے وہ دنیا کا مال حاصل کر سکے اور ایک دیندار تمام شرعی پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر دنیا کماتا ہے۔ دنیا کا مال پہلے شخص کو بھی مل جاتا ہے۔ جو اس کا مقدر ہوتا ہے۔ اور دوسرے کو بھی جو اس کا مقدر ہوتا ہے۔ اس مقام پر حصول مال میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے شخص کا کمایا ہوا مال بھی دنیا داری نہیں بلکہ عین دین سمجھا جائے گا۔ بالکل یہی صورت حال عام دنیوی مقاصد کے تحت لڑی جانے والی جنگوں میں جہاد فی سبیل اللہ کے بعد تحصیل مال کی ہے۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے۔ اسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

(۳) اسلام اور جنگ جوئی

اسلام پر تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام نے جہاد کو فرض قرار دے کر ایک مستقل جنگ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ لہٰذا اسے ایک امن پسند مذہب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عرب قبائل ہمیشہ آپس میں برسر پیکار رہتے تھے۔ اسلام نے آ کر صرف یہ تبدیلی پیدا کی کہ ان جنگ جو قبائلیوں کا رخ اندرونی خلفشار باہمی جنگوں سے ہٹا کر بیرونی دنیا کی طرف موڑ دیا۔ لیکن ان کی جنگجوئی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ جیسے وہ اسلام لانے سے پیشتر برسر پیکار رہتے تھے ویسے اسلام لانے کے بعد رہے۔

انہیں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ:۔

﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ (۲:۱۹۱) (ان (کفار و مشرکین) کو جہاں پاؤ قتل کرو)

علاوہ ازیں اسلام ایک عالم گیر سلطنت کا داعی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ (۲:۱۹۳) (اور ان سے اس وقت تک لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔)

لہٰذا اسلام نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دارالسلام جہاں اسلامی حکومت قائم ہو۔ اور دوسرے دارالحرب۔ جہاں غیر مسلم حکومت ہو۔ آسان الفاظ میں یوں کہیے کہ ایک حصہ عالم اسلام ہے۔ اور دوسرا عالم جنگ۔ دارالاسلام پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دارالحرب یا غیر مسلموں سے برسرِ پیکار رہ کر انہیں دارالاسلام میں شامل کرتا چلا جائے۔

یہ ہے ان عقلی اور نقلی دلائل کا خلاصہ جن سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اسلام کوئی امن پسند یا صلح جو مذہب نہیں بلکہ اپنے مزاج کے لحاظ سے ہر وقت برسرِ پیکار رہنا چاہتا ہے۔

پیشتر اس کے کہ اس اعتراض کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جائے مندرجہ ذیل دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے:۔

(۱) مشرکین اور اہل کتاب کا فرق:

جیسا کہ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے کہ اہل کتاب کے سامنے تین شرطیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلی یہ کہ وہ اسلام لائیں۔ اگر یہ نامنظور ہو تو وہ

(۲) اطاعت گزار بن کر دارالاسلام میں رہیں اور جزیہ یا اس کی متبادل کوئی صورت قبول کریں۔ اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو پھر

(۳) جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

لیکن مشرکین کے لیے اطاعت گزار بن کر رہنے کی بھی کم از کم حجاز میں گنجائش نہیں۔ ان پر تین ہی شرائط پیش کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کے آغاز میں مذکور ہے یعنی (۱) اسلام قبول کر لیں اگر یہ منظور نہ ہو تو (۲) دارالاسلام چھوڑ کر چلے جائیں اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو پھر (۳) جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ گویا ان کے لیے شرط نمبر ۲ اطاعت گزار بن کر رہنے کی بجائے حجاز چھوڑ کر چلے جانے کی ہے۔

مشرک کی عام تعریف یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ کسی کتاب کا قائل نہ ہو۔ اور خدا کے متعلق واضح عقیدہ نہ رکھتا ہو۔ اس وضاحت سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اسلام کی نظر میں تمام غیر مسلم ایک سطح پر نہیں۔ وہ اہل کتاب سے نسبتاً نرم رویہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن مشرکین

کے معاملہ میں سخت ہے۔ مندرجہ بالا دونوں آیات (جو کہ ایک ہی طویل آیت کے ٹکڑے ہیں) مشرکین سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس سختی کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک تحریک ہے۔ جو فتنہ کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کی نظر میں چونکہ سب سے بڑا فتنہ شرک ہے لہٰذا شرک کو ختم کرنا اس کا اولین مقصد ہے۔ گویا شرک کی موجودگی ہی جنگ کے لیے آئینی دستاویز ہوتی ہے۔

(۲) اقامت پذیری:

بلحاظ توطن دارالاسلام کی تین اقسام ہیں:۔

(۱) حرمین یعنی حرم مکہ اور حرم مدینہ۔ ان مقامات میں صرف مسلمان ہی رہ سکتے۔ اہل کتاب یا مشرک یہاں اقامت اختیار نہیں کر سکتے۔

(۲) جزیرہ العرب یا حجاز۔ اس میں اہل کتاب معاہد کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ جب تک کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہیں۔ ہاں اگر بغاوت یا جنگ کریں تو انہیں دارالاسلام کے کسی دوسرے مقام میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مشرکین کو اس خطہ میں برداشت نہیں کیا گیا۔

(۳) باقی دارالاسلام میں اہل کتاب تو اطاعت گزار بن کر پوری آزادی سے رہ سکتے ہیں۔ لیکن مشرکین کو گوارا ہونے کی حد تک برداشت کیا گیا ہے کہ وہ جزیہ دے کر اس علاقہ میں رہ سکتے ہیں۔ (اسلام کا قانون جنگ و صلح ص ۱۵۸)

مشرکین پر سختی کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ لوگ ہر وقت اسلام پر کسی آفت کے پڑنے اور اندریں صورت بدعہدی کے منتظر رہتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ توبہ میں اعلان کر کے ان کو چار ماہ سوچنے کی اجازت دی اور ان سے طے شدہ معاہدات کو کالعدم قرار دے دیا۔ اگر یہ اقدام نہ کیا جاتا تو حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد اٹھنے والا ارتداد کا فتنہ شاید دس گنا زیادہ طاقت سے ابھرتا۔ اور اسلام کی تاریخ بھی کوئی اور ہی رنگ اختیار کرتی۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم اصل اعتراض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جس کا پہلا حصہ ہے کہ اسلام میں جو جنگ جو قبائلی داخل ہوئے تھے۔ اسلام نے صرف ان کا رخ بیرونی دنیا کی طرف پھیر دیا تھا۔ لہٰذا ان کی جنگجو فطرت میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ اعتراض کئی وجوہ سے غلط

ہے۔

سابقین الاوّلین کی امن پسندی:

پہلی وجہ یہ ہے کہ بیشک عرب کے اکثر قبائل فطرتاً جنگجو واقع ہوئے تھے۔ لیکن ان کے سب افراد جنگجو نہیں تھے۔ بلکہ ان مین کثیر طبقہ ایسا بھی تھا۔ جو اس قتل و غارت کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ وہ کمزور تھے، نہتے تھے۔ معاشرہ میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ فطرتاً بھی قتل و غارت اور ظلم و فساد سے نفرت کرتے تھے۔ پھر اشرار میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا۔ جو صلح و امن پسند تھا اور قتل و غارت اور ظلم و جبر سے نفرت کرتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے حلف الفضول کے واقعہ میں اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔ ایسے ہی لوگ ابتداءً اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ چونکہ قتل و غارت اور ظلم و فساد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے ختم کرنے کی صورت صرف یہی تھی کہ ایسے شر پسندوں کا جنگ کے ذریعہ قلع قمع کیا جائے لہذا جب کمزور مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت ملی تو بہت سے لوگوں کو یہ بات ناگوار تھی۔ ارشاد باری ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ۔﴾ (۲۱۶:۲) (تم پر جنگ فرض کی گئی ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔)

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ۔﴾ (۳۸:۹) (مومنو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تم زمین پر گرے جاتے ہو۔)

اور دورِ نبوی کی سب سے پہلی جنگ بدر مسلمانوں کی ''جنگ جوئی'' کی کیفیت اس انداز میں بیان کی گئی ہے:

﴿كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ (جیسا تمہارے پروردگار نے تمہیں تدبیر کے ساتھ تمہارے گھر سے نکالا اور اس وقت مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ وہ لوگ حق بات میں اس کے ظاہر ہونے کے

وَهُمْ يَنظُرُونَ ۝﴾ (۸:۶۵) بعد تم سے جھگڑنے لگے گویا موت کی طرف دھکیلے جانے لگے ہیں۔ اور وہ موت کو سامنے دیکھ رہے ہیں۔)

اور رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ:۔

((يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ۔)) (۸:۶۵) (اے نبی ﷺ! مومنوں کو جہاد کی ترغیب دو۔)

ان تمام آیات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کم از کم جنگ بدر تک کے اکثر مسلمان جنگ سے نفرت کرتے تھے۔ اور اسے ناگوار سمجھتے تھے۔ یہی لوگ اسلام کا ابتدائی اور قیمتی سرمایہ تھے۔ اگر یہ لوگ فطرتاً جنگ جو ہوتے تو ان احکامات وارشادات کی کیا ضرورت تھی؟ اصل بات یہی ہے۔ اسلام کے یہ ابتدائی جاں نثار صلح جو اور امن پسند تھے۔ ظلم وفساد کے خاتمہ کے لیے جب ان پر جنگ جیسا ''ناگوار فریضہ'' عائد کر دیا گیا تو انہوں نے اسے طوعاً وکرہاً سرانجام دیا۔

جارحانہ اقدامات؟

اس بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ جنگ جو لوگ ہمیشہ وہی کہلائے جا سکتے ہیں۔ جو جارحانہ اقدامات کریں۔ اس معیار پر غور کرنے کے لیے ہمیں دور نبویؐ کی جنگوں کے اسباب پر سرسری نظر ڈالنا ہوگی۔

(۱) غزوۂ بدر، احد اور احزاب خالص مدافعانہ جنگیں تھیں۔

(۲) غزوۂ خیبر اور غزوۂ مکہ دشمن کی طرف سے عہد شکنی کی وجہ سے پیش آئیں۔

(۳) سریہ موتہ اور غزوۂ تبوک، سفیر کے قتل اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے پیش آئیں۔

(۴) غزوۂ حنین (اوطاس اور طائف) میں دشمن نے خود للکارا تھا۔ اور مسلمانوں کو جس بے سروسامانی کی حالت میں یہ جنگ لڑنا پڑی اس کی کیفیت بھی ملاحظہ فرما لیجئے:۔

فتح مکہ کے فوراً بعد ہوازن اور ثقیف کے جنگجو اور تیر انداز قبائل نے مقابلہ کی ٹھانی اور ایک بڑے لشکر کو حنین کے مقام پر لا ڈالا۔ عورتیں اور بچے بھی ہمراہ لے آئے کہ کسی کو بھاگنے کا خیال ہی پیدا نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کو مجبوراً جن حالات میں یہ جنگ لڑنا پڑی وہ یہ ہیں کہ آپؐ نے عبداللہ بن ربیعہ سے۔۔۔۔۔ جو ابو جہل کے ماں جائے بھائی تھے۔۔۔۔ تین ہزار درہم قرض لیے

(مسند احمد ج ۴ ص ۳۶) اور صفوان بن اسید جو کہ ان کا رئیس اعظم تھا اور ابھی تک اسلام نہیں لایا تھا۔ اس سے اسلحہ جنگ مستعار لیا۔ اس نے سو زر ہیں اور اس کے لوازمات پیش کیے۔

(موطا۔ ابوداؤد۔ باب الضمانۃ)

(۵) یہود سے جو غزوات ہوئے۔ مثلاً غزوہ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سب یہودیوں کی عہد شکنی اور کھلی بغاوت کے نتیجہ میں پیش آئے تھے۔

غور فرمالیجئے کہ ان میں کون سی جنگ کو جارحانہ جنگ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب:

دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحیں فی الواقع فقہائے اسلام نے وضع کی ہیں۔ لیکن انہیں عالم اسلام اور عالم جنگ کے معنوں میں پیش کرنے میں کئی مغالطے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:۔

(۱) اسلام غیر مسلموں کے سارے علاقے کو "عالم جنگ" قرار نہیں دیتا۔ ہم چوتھے باب میں واضح کر آئے ہیں کہ غیر جانبدار ممالک سے جنگ کی اجازت نہیں۔ یعنی ایک ایسی مسلم حکومت جو امن و امان سے رہتی اور رہنا پسند کرتی ہے۔ اس سے لڑائی کا کوئی جواز نہیں۔ خواہ وہ حکومت اہل کتاب کی ہو یا مشرکین کی۔ ارشاد باری ہے:۔

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝﴾ (۸:۶۰)

(اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے منع نہیں کرتا۔ جو تم سے دین کے سلسلہ میں نہیں لڑتے۔ اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔)

اس آیت میں غیر جانبدار ممالک سے لڑائی سے منع ہی نہیں کیا گیا بلکہ بہتر سلوک کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔

گویا "دارالحرب" دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک غیر جانبدار علاقہ جو فی الحقیقت دارالحرب نہیں ہے۔ دوسرے حربی علاقہ جہاں جنگ کا امکان ہے۔

(۲) حربی علاقہ میں ایسے ممالک بھی ہو سکتے ہیں جن سے صلح و تجارت وغیرہ کے معاہدات

طے پائے ہوں۔ اور ان کی مدت صلح عموماً دس سال ہوتی ہے۔ جب تک ایسے ممالک بغاوت یا بدعہدی نہ کریں ان سے جنگ کا کوئی امکان نہیں۔ نہ ہی اس کی اجازت ہے۔

(۳) اس کے بعد جو ممالک بچ جائیں وہ فی الواقع ''دارالحرب'' ہیں لیکن اس پر بھی ''حالات جنگ'' کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ حالات جنگ اور چیز ہے اور خطرہ جنگ اور چیز اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے آج کل روس اشتراکیت کا علمبردار ہے اور امریکہ جمہوریت اور سرمایہ کاری کا۔ یہ دونوں قسم کے نظریات چونکہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لہٰذا ان دونوں ملکوں میں جنگ کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عین ممکن ہے۔ کہ ان دونوں ممالک میں ایک طویل مدت تک حالات جنگ پیدا نہ ہوں۔

یہی صورت حال پاکستان اور بھارت کی ہے۔ پاکستان دو قومی نظریہ کا علمبردار ہے اور بھارت ایک قومی نظریہ کا حامی ہے نظریات کے اس تضاد نے ہر وقت جنگ کا خطرہ پیدا کر دیا ہے لیکن حالات جنگ مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں حالات جنگ صرف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کوئی ملک اپنے حقوق سے تجاوز کرنا چاہتا ہے۔ جو حریف ملک کے لیے ناگوار ہوتے ہیں۔ مثلاً روس اپنا حق سمجھتا ہے کہ گرم پانی تک اس کی رسائی ہو۔ لہٰذا افغانستان، پاکستان اور ایران وغیرہ پر اس کا تسلط قائم ہونا چاہیے۔ لیکن حریف ممالک روس کے اس ''حق'' کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ روس نے افغانستان میں اپنا یہ حق استعمال کرنا شروع کر دیا تو جنگ چھڑ گئی۔ اور پاکستان اور ایران کے لیے حالات جنگ پیدا ہو گئے۔

مغربی اقوام کے نزدیک طاقت ہی سب سے بڑا حق ہے۔ ان کے نزدیک جنگ کے آغاز کے لیے جو مقدس حقوق جائز سمجھے گئے ہیں۔ ان کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ انہی حقوق میں سے کسی ایک حق کا استعمال کر کے وہ حالات جنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن اسلام اس طرح کے حقوق کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس وقت تک حالات جنگ پیدا نہیں ہو سکتے جب تک ان صورتوں میں سے کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ جن کی تفصیل باب چہارم میں پیش کی جا چکی ہے۔ اسلام میں لڑائی کے جواز کا عام قانون ظلم اور فتنہ استحصال ہے۔ کوئی ملک اسلامی

ریاست پر چڑھ کر آ جائے اور سرحدوں پر یورش کرے یا سفارتی آداب کی خلاف ورزی کرے۔ یا مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے روکے تو یہ سب ظلم اور فتنہ کی مختلف شکلیں ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی ملک اشاعت اسلام میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے یا صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ان پر مظالم ڈھاتا ہے تو اس طرح حالات جنگ پیدا ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی۔ کہ اسلام صرف مدافعانہ جنگ ہی کا قائل نہیں۔ بلکہ وہ ظلم وجور کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے خواہ یہ ملک کے اندر ہو یا باہر۔ اب اسے کوئی مصلحانہ جنگ کہہ لے یا جارحانہ جنگ۔ اسلام نے بہر حال جنگ کرنے اور اس سے رک جانے کے اصول متعین کر دیئے ہیں اور مسلمانوں کو انہیں اصولوں پر کاربند رہنا لازم ہے۔

(۴) پیغمبر اسلام ﷺ پر اعتراضات کا جائزہ

اسلام پر چند بڑے بڑے اعتراضات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم چند مزید اعتراضات کا جائزہ لیں گے جو پیغمبر اسلام پر کیے گئے ہیں:۔

(۱) لوٹ مار کا سبق:

سب سے پہلے اور اہم اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ تجارتی قافلوں کی ناکہ بندی کرتے اور انہیں لوٹنے کے لیے دستے روانہ کرتے رہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ خود مسلمانوں کو لوٹ مار کا سبق دیتے رہے۔

اس اعتراض کا جواب ہم مناسب مقام پر پیش کر چکے ہیں۔ تاہم قارئین کی سہولت کے لیے دوبارہ چند اشارات پیش کیے جاتے ہیں:۔

(۱) اگر آپ ﷺ کا مقصد محض لوٹ مار سکھلانا تھا۔ تو قریش کے قافلہ ہی کی ناکہ بندی کیوں کی گئی۔ تجارتی قافلے تو یمن سے بھی جاتے تھے اور نجد سے بھی پھر عراق اور شام کی طرف بھی آتے تھے۔ مدینہ سے بھی یہودیوں کے تجارتی قافلے جاتے تھے۔ اگر محض لوٹ مار کا مقصد ہوتا تو دوسرے قافلوں سے کیوں کبھی تعرض نہ کیا گیا۔

(۲) آپ نے کوئی ایسا دستہ روانہ نہیں کیا۔ جنہیں لوٹ مار کا حکم دیا گیا ہو۔ یا مسلمانوں نے کبھی قریش کے کسی تجارتی قافلہ کو لوٹا ہو۔ لے دے کر یہ سریہ نخلہ کا ایک واقعہ ایسا ملتا

ہے۔ جسے بھیجا تو تفتیش احوال کے لیے گیا تھا مگر اس دستہ کے امیر عبداللہ بن جحش ؓ کے سامنے ایک تجارتی قافلہ آ گیا تو آپ نے از خود اس پر حملہ کر کے اسے لوٹا۔ پھر جب مال غنیمت حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو آپ ﷺ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور عبداللہ بن جحش ؓ کو سخت سرزنش بھی کی کہ اس نے وہ کام کیوں کیا جس کا اسے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ (اس کی تفصیل اپنے مقام پر گزر چکی ہے۔)

(۳) دشمن کے اسباب ثروت کی ناکہ بندی کر کے اس پر کاری ضرب لگانا جنگی تدابیر میں سے ایک اہم تدبیر ہے۔ جسے ہر ملک اور ہر قوم استعمال کرتی ہے۔ اور کامیاب جرنیل کی ایک دانشمندی کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ کامیاب طریقہ سے ناکہ بندی کر کے دشمن کی اصل قوت (سرمایہ) پر کاری ضرب لگائے تو پھر اسلام اور بانی اسلام ہی کو مطعون کرنے کا کیا جواز ہے؟

(۴) عتبہ بن اسید ؓ نے فی الواقع مقام عیص پر ایک جتھہ بنا کر قریش کے تجارتی قافلوں کو لوٹا بھی تھا۔ لیکن یہ صورت حال صلح حدیبیہ کی شرط نمبر ۲ کے نتیجہ میں پیش آئی تھی۔ جس کی ذمہ داری سے آپ بری الذمہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش نے خود مدینہ جا کر حضور اکرم ﷺ سے درخواست کی تھی کہ شرط نمبر ۲ کو منسوخ قرار دیا جائے چنانچہ بعد میں قریش کو اس ''مصیبت'' سے نجات مل گئی۔

(نووی شرح مسلم۔ کتاب الجہاد باب صلح حدیبیہ)

(۲) دوسرا اعتراض' خفیہ سازشیں:

رسول اللہ ﷺ پر دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے دشمنوں کو خفیہ سازشوں کے ذریعہ مکر و فریب سے کام لے کر ختم کرا دیتے تھے حالانکہ وہ ''معاہد'' تھے۔ مثال کے طور پر کعب بن اشرف اور ابو رافع کا نام پیش کیا جاتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب بھی زیر عنوان گوریلا جنگ (باب نمبر ۲) میں دیا جا چکا ہے۔ مختصر اشارات دوبارہ درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) یہ لوگ معاہد ضرور تھے۔ لیکن بغاوت کے جرم نے ان کے معاہد کی حیثیت کو ختم کر دیا۔

بغاوت کے علاوہ اور کئی طرح کے جرائم میں ملوث تھے۔ مسلمانوں کے دشمنوں کو برانگیختہ کرنا۔ مسلمانوں کی تضحیک اور تمسخر اُڑانا۔ بانی اسلام کو گالیاں دینا ان لوگوں کا شعار تھا۔ ان حرکات سے معاہدہ از خود ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے جرائم کے علاوہ اکیلا جرم بغاوت ہی ایسا ہے جسے کوئی حکومت معاف نہیں کرتی۔

(۲) آپ کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل' ابوسفیان' امیہ بن خلف وغیرہ تھے۔ جنہوں نے مدینہ میں بھی پانچ سال تک یلغار کی اور آپ ﷺ کو چین نہ لینے دیا۔ لیکن انہیں آپ ﷺ نے خفیہ طریقہ سے ٹھکانے لگانے کے متعلق کبھی نہ سوچا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ کھلے دشمن تھے۔ لیکن یہود کے مندرجہ بالا افراد زیرزمین سازشیں کرتے اور کھلے میدان میں آنے سے احتراز کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی شرارتوں سے نجات کا ذریعہ یہی ہوتا ہے۔ کہ انہیں جانباز فورس کے سپرد کر دیا جائے۔ جو جس طرح بھی بن پڑے ان کو ٹھکانے لگا دیں۔ ہر حکومت کے لیے ایسی کاروائی ناگزیر ہوتی ہے۔ اور اس میں ہر طرح کے فکر و تدبر کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ ایسے گوریلا سپاہیوں اور اسی طرح جاسوسوں کے لیے عام قانون یہ ہے کہ اگر وہ گرفتار ہو جائیں تو انہیں ''اسیران جنگ'' کی سی مراعات حاصل نہیں ہوتیں۔ اور اگر مارے جائیں تو متعلقہ حکومت اس کی باز پرس نہیں کر سکتی۔

(۳) یہ لوگ معاہد ضرور تھے۔ مگر ان کے انفرادی جرائم کی سزا پوری قوم کو نہیں دی جا سکتی تھی۔ کہ ان سے کھلم کھلا اعلان جنگ کیا جاتا۔ جبکہ ان کی قوم انہیں ایسی حرکات سے منع کرنے سے قاصر ہو۔ لہٰذا اس انفرادی اقدام کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

(۴) یہ الزام بھی سراسر غلط ہے کہ آپ ﷺ نے خود سازشیں تیار کر کے جانبازوں کو مکر و فریب سکھا کر انہیں اس مہم پر آمادہ کیا تھا۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لیے محمد بن مسلم نے خود اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ ''اجازت دیں جو چاہوں کہہ لوں''۔ تو آپ ﷺ نے اس کی اجازت دے دی۔

اس اجازت سے خفیہ سازشیں تیار کرنے یا مکر و فریب کے سکھانے کا پہلو کیسے نکل سکتا ہے؟ اس طرح ابورافع کو ٹھکانے لگانے کے لیے عبداللہ بن عتیق رضی اللہ عنہ نے خود اپنی خدمات پیش کی

تھیں۔ ان صحابہ ؓ نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے جو تدبیر بھی اختیار کی وہ ان کی اپنی اختراع تھی۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے ان صحابہ نے اس مہم کو سر کرنے میں خدع فی الحرب سے کام ضرور لیا ہے۔ دغا سے کام نہیں لیا۔ خدع اور دغا کا فرق ہم جنگی نقشہ میں تبدیلی کے عنوان کے تحت واضح کر چکے ہیں۔

(۳) تیسرا اعتراض' عہد شکنی:

یہ اعتراض براہ راست بانی اسلام پر نہیں البتہ خلفائے راشدین پر کیا جاتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے خیبر کے یہود کو خیبر میں قیام پذیر رہنے کا معاہدہ کیا لیکن حضرت عمر ؓ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے انہیں جلا وطن کر دیا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کر کے انہیں وہیں رہنے کی اجازت دی مگر حضرت عمر ؓ نے انہیں وہاں سے جلاوطن کر دیا۔

جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے یہ درست ہے۔ معترضین کی ہوشیاری کا کمال یہ ہے کہ وہ یہودیوں کے خیبر سے' اور عیسائیوں کے نجران سے اخراج کا واقعہ بیان کر کے اسے عہد شکنی کی مثالوں کے طور پر تو پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن جن وجوہ کی بنا پر انہیں جلا وطن کیا گیا انہیں بیان نہیں کرتے۔

اس اعتراض کی اصل وجہ اس کے بغیر کچھ نہیں کہ معترضین بھی یہودی اور عیسائی اقوام ہیں۔ اور جن لوگوں کو جلاوطن کیا گیا وہ بھی یہودی اور عیسائی اقوام ہیں۔ اور جن لوگوں کو جلاوطن کیا گیا وہ یہودی اور عیسائی تھے ورنہ ان کا جواب تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے۔

خیبر کی فتح کے بعد یہود سے اس شرط پر صلح پر ہوئی تھی کہ وہ علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں گے اور ان کی جان بخشی کر دی جائے گی۔ معاہدہ طے پا جانے کے بعد یہود نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ''آپ ﷺ ہم کو یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کر لیں۔ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے خوب واقف ہیں''۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی یہ درخواست بھی قبول کر لی۔ اور نصف بٹائی پر اصل معاہدہ کے تحت یہ عارضی سمجھوتہ بھی طے پا گیا۔ جس میں واضح طور پر یہ الفاظ درج تھے۔

نقر کم ما اقر کم الله۔ (بخاری۔ کتاب الشروط۔ باب اذا اشترط فی المزارعة) جب تک اللہ تعالیٰ تم کو یہاں رکھے گا ہم بھی تم کو رہنے دیں گے۔

گویا یہود کو خیبر میں رہنے دینا مسلمانوں کا اختیاری معاملہ تھا۔ لہٰذا کسی وقت مسلمان بغیر کسی وجہ کے انہیں نکال دیتے تو تب بھی عہد شکنی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم چند ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کی بنا پر یہود کا اخراج ضروری ہو گیا تھا۔ مثلاً :۔

(۱) اس واقعہ معاہدہ کے چند دن بعد یہود نے آپ کو زہر دینے کی سازش کی۔ یہ واقعہ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے) آپ ﷺ نے یہود کا یہ جرم معاف کر دیا۔ اور صرف کھانے میں زہر ملانے والی مجرمہ عورت کا قصاص کے طور پر قتل کیا گیا۔ (غزوہ خیبر)

(۲) اس کے بعد دوسری سازش یہ تھی کہ ایک مسلمان حضرت عبداللہ بن سہیل بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کو خفیہ طریقہ سے قتل کر کے انہیں نہر میں ڈال دیا اور اس کا خون بہا خود رسول اللہ ﷺ نے بیت المال سے ادا کر دیا لیکن یہود کو کوئی سزا نہ دی گئی۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دور فاروقی میں اپنی مملوکہ زمین کو دیکھنے خیبر گئے۔ تو یہودیوں نے انہیں سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا۔ جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ (فتوح البلدان ص ۳۱، ابن ہشام ص ۷۸)

ایسی معاندانہ کاروائیوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ طلب کی جس میں بالاتفاق یہود کے اخراج کا فیصلہ طے پایا۔ اس کے باوجود انہیں خالی ہاتھ نہیں نکالا گیا بلکہ جو کچھ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ بیت المال سے دیا گیا۔ یہاں تک کے کجاوا باندھنے کی رسیاں بھی حکومت کی طرف سے مہیا کی گئیں۔ (بخاری۔ کتاب الشروط)

اسی طرح نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ ہوا اس کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں :۔

لهم مافی هذه الصحيفة جوار الله وذمة النبی ابداً حتی یاتی امر الله مانصحوا واصلحوا فی ماعليهم۔ (کتاب الخراج ص ۴۱، فتوح البلدان ص ۶۷)

ان کے لیے جو کچھ عہد نامہ میں ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی پناہ اور محمد نبی ﷺ کی دائمی حفاظت ہے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم آئے اور وہ خیر خواہ رہیں اور جو کچھ ان کے ذمہ واجب ہے اسے ٹھیک ادا کرتے رہیں۔

گویا اس عہد نامہ کی دو شرائط تھیں۔

(۱) وہ حکومت اسلام کے وفادار رہیں گے۔

(۲) وہ مقررہ جزیہ ٹھیک طور پر پر ادا کرتے رہیں گے۔

لیکن ان لوگوں نے اس صلح نامہ کی پہلی شرط کی خلاف ورزی شروع کردی۔ امن وامان کی برکات کی وجہ سے ان کے جان و مال میں بہت ترقی ہوئی ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اور انہوں نے گھوڑے اور اسلحہ جمع کرنا شروع کردیا۔ (کتاب الخراج ص ۴۲)

اب صورت حال یہ پیدا ہوگئی کہ ایک طرف اسلامی حکومت کے قلب کے بالکل نزدیک تھے۔ دوسری طرف حبشہ کی عیسائی حکومت سے ساز باز کرنا شروع کردی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے بغاوت سخت نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی اور ان کی تیاری کا ثبوت بہم پہنچ چکا تھا۔ ان خطرناک حالات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف یہ کیا کہ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ یعنی نجران یمن سے نجران عراق میں منتقل کردیا۔ ان کی زمینوں کے بدلے انہیں زمینیں دی گئیں۔ دو سال کا جزیہ بھی معاف کردیا گیا اور سفر کی جملہ سہولتیں بھی بہم پہنچائی گئیں اور متعلقہ افسران کو یہ حکم دیا گیا کہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ (کتاب الخراج ۴۱)

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ ان سے عہد شکنی کی ہی نہیں گئی۔ نہ ہی انہیں کوئی سزا دینا مقصود تھا۔ بلکہ اس نقل مکانی سے مقصد صرف اسلامی حکومت کی حربی اور سیاسی پوزیشن کی حفاظت تھی۔ اور یہ ایک ایسا اقدام ہے جو ہر حکومت اپنی مصلحتوں کو دیکھ کر اختیار کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔ خواہ منتقل ہونے والے افراد "معاہد" ہوں یا اس کی اپنی ہی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔

غیر مسلموں کا اعتراف حقیقت

((الفضل ما شهد به الاعداء -)) (بزرگی وہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کریں-)

جہاں بہت سے متعصب مستشرقین اور معاندین اسلام نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر ناروا الزامات عائد کیے ہیں وہاں کچھ ایسے حقائق پرست غیر مسلم بھی ہیں جنہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی خوبیوں کا برملا اعتراف کیا ہے۔ ذیل میں ہم چند ایسے ہی حقیقت شناس لوگوں کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں:۔

(۱) نامور مستشرق جان ڈیوڈ پورٹ اپنی کتاب ''قرآن اور محمد سے معذرت'' کے دیباچہ میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''اس کتاب کے لکھنے کا ناچیز لیکن مخلصانہ مقصد یہ ہے کہ محمد ﷺ کی سوانح حیات کو جھوٹی تہمتوں اور ناروا الزامات سے پاک کیا جائے۔ اور آپ ﷺ نے مخلوق عالم کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ کیا ہے۔ اسے اچھی طرح آشکارا کیا جائے۔ بعض مصنفین نے تعصب کے جوش میں توحید پرستی کے محافظ کی نیک نامی کو جو دھبہ لگایا ہے۔ اس قسم کی غلطی کر کے صرف یہی ظاہر نہیں کیا ہے کہ ان میں خود شرافت و انسانیت اور علم و تحقیق کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے بلکہ انہوں نے انصاف پسندی کے خلاف بھی کام کیا ہے''۔

''محمد ﷺ کی صداقت کی بین دلیل یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ آپ ﷺ پر ایمان لائے وہ آپ ﷺ کے عزیز ترین دوست اور اعزہ تھے۔ جو آپ ﷺ کی عادات و خصائل سے بخوبی واقف تھے اور باوجود جستجو کے انہیں آپ ﷺ میں کوئی ایسی برائی یا خامی نظر نہیں آئی جو ایک بناوٹی اور دھوکہ باز شخص میں ہو سکتی ہے۔ رسول خدا کی زندگی میں اگر کہیں ذرا سا بھی الجھاؤ ہوتا تو جو لوگ آپ ﷺ سے اس قدر قریب تھے وہ ضرور آگاہ ہوتے۔ (سرور کونین ص ۱۶۴-۱۶۵)

(۲) ہندوستان چرچ بمبئی کے پادری فادر ولیم اسلام کے قانون صلح و جنگ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:۔

''دنیا داری کو سب نے برا کہا لیکن پیغمبر اسلام نے اس فرق کو ختم کر دیا اور بتایا کہ دنیا داری بھی دینداری ہے۔ بشرطیکہ احکام الٰہی کے مطابق ہو۔ جنگ عام طور پر بری سمجھی جاتی ہے مگر اسلام نے جنگ کے لیے اعلیٰ اصول پیش کیے۔ ''جنگ میں ہر کام جائز ہے''۔ کے اصولوں کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ اسلام کے نام لیوا رات کے راہب اور دن کے شاہسوار ہو کر مرتے تھے''۔ (ایضاً ص ۱۶۷)

(۳) لیک اور مستشرق ولیم ارونگ، حضور اکرم ﷺ کی فاتحانہ شان کو دوسرے فاتحین سے یوں ممتاز کرتے ہیں:۔

''فوجی فتوحات نے آپ ﷺ میں کبھی غرور پیدا نہیں کیا۔ جب آپ ﷺ انتہائی طاقت ور ہو چکے تھے۔ اس وقت بھی آپ ﷺ کے اخلاق عادات اور طرز زندگی میں وہی سادگی

تھی۔ جو آپ ﷺ کی مصیبت کے زمانے کی زندگی میں تھی۔ دنیوی زندگی کے لوازمات کا آپ ﷺ کے مبارک دل میں کبھی خیال بھی نہیں گزرا۔ آپ ﷺ کی کسی بھی جگہ آمد کے وقت اگر آپ ﷺ کے استقبال میں کوئی غیر معمولی شان پیدا کی جاتی تھی تو وہ آپ ﷺ کو ناگوار ہوتی تھی۔ اگر آپ ﷺ کسی عالمگیر حکومت کے خواہاں تھے تو وہ تھی زمین پر خدا کی حکومت اور اخلاص کی حکومت۔

(۴) ایک ہندو مسٹر آر۔ سی۔ داس نوع انسانی پر بانی اسلام کے احسانات کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

''شری رام چندر جی مہاراج' بھگوان کرشن' گورونانک جی' حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سب روحانی بادشاہ ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ان میں ایک روحانی شہنشاہ بھی ہے جس کا مقدس نام حضرت محمد ﷺ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ریفارمر نے آکر دنیا میں بہت کچھ کیا ہے۔ مگر حضرت محمد (ﷺ) نے دنیا پر اس قدر احسانات کیے ہیں۔ جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ اگرچہ ہر مذہب کے لوگوں نے آپ ﷺ کے متعلق اچھی رائے دی ہے۔ مگر چند ایک ہندوؤں کے نام کا اظہار کرتا ہوں جو حضرت محمد ﷺ صاحب کے مشن کی خوبیوں کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ جیسے سروجنی نائیڈو' لاجپت رائے' مہاتما گاندھی' مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور پنڈت موتی لال نہرو وغیرہ۔

(۵) کیا اسلام بذریعہ تلوار تھا؟ کے موضوع پر رسالہ ''ست اپدیش'' کے ایڈیٹر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:۔

''عام خیال یہ ہے کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا ہے۔ مگر ہم اس رائے سے موافقت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ زبردستی کی وجہ سے جو چیز کسی ظالم کو دی جاتی ہے وہ جلد ہی ظالم سے واپس بھی لے لی جاتی ہے۔ اگر اسلام کی اشاعت جبر کے ساتھ کی گئی ہوتو آج اسلام کا نام ونشان باقی نہ رہتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام دن بدن ترقی کر رہا ہے کیوں؟ یہ اس لیے کہ بانی اسلام کے اندر روحانی شکتی تھی۔ منش ماتر (بنی نوع انسان) کے لیے پریم تھا۔ آپ کے اندر محبت اور رحم کا ایک جذبہ کام کرتا تھا اور نیک خیالات کی طرف آپ رہنمائی کرتے تھے''۔ (ایضاً ص ۱۷)

(۶) اسی موضوع پر ایک اور ہندو مصنف پروفیسر رام دیو بی اے' یوں رقمطراز ہیں:۔

''شروع میں حضرت محمد ﷺ صاحب کے صرف تیس معاون اور مددگار تھے۔ ان کی جاتی ''قریش'' ان کی مخالف تھی۔ آخر محمد ﷺ صاحب نے ان میں جادو کی بجلی بھر دی۔ وہ بجلی جو انسانوں کو دیوتا بنا دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ بجلی راجوں' مہاراجوں میں نہیں بھری تھی بلکہ عام لوگوں میں بھری تھی۔ یہ غلط ہے کہ اسلام محض تلوار سے پھیلا ہے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے لیے کبھی تلوار نہیں اٹھائی گئی۔ اگر کوئی مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج ہی کسی مذہب کو پھیلا کر دکھا دے''۔ (ایضاً ص ۱۷۶)

(۷) اور اسی موضوع پر خود مہاتما گاندھی اشاعت اسلام کے اسباب کا یوں تجزیہ فرماتے ہیں:۔

''سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے میرے اس عقیدے میں پختگی اور استحکام آ گیا کہ اسلام نے تلوار کے بل پر رسوخ حاصل نہیں کیا بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی انتہائی بے نفسی عقود و مواثیق کا انتہائی احترام اپنے رفقاء و متبعین کے ساتھ گہری وابستگی' جرات اور بے باکی' اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ اور اپنے مقصد و نصب العین کی حقانیت پر کامل اعتماد' اسلام کی کامیابی کے تحقیقی اسباب تھے۔ یہ خصائص ہر رکاوٹ اور ہر مشکل کو اپنی ہمہ گیر رو میں بہا کر لے گئے''۔ (ایضاً ص ۱۷۸)

(۸) ایک اور ہندو مصنف' بابو برج بہاری لال بی اے ایل بی ''اسلام اور خونریزی'' کے موضوع پر اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:۔

''آنحضرت ﷺ کی شان میں ناواقفیت یا شرارت سے یہ کہنا کہ آپ ﷺ کی تعلیم قتل اور خونریزی کی تعلیم تھی بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ جس شخص کا دل ننھے ننھے بچوں کے رونے سے بے قرار و بے چین ہو جائے۔ جو ہزاروں گالیاں سن کر بھی اپنی نگاہ نیچی رکھے' جو فتح مکہ کے دن صبر و تحمل اور رحم و رواداری کا وہ بے مثل مظاہرہ کرے جس کی نظیر فاتحین عالم کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے۔ یعنی اپنے بدترین دشمنوں کو بھی قابو میں لانے کے بعد معاف کر دے۔ جو ظلم و تعدی کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرے۔ سب کچھ غریبوں اور مفلسوں پر نچھاور کرے' جو خود اپنے ہاتھوں سے غیر مسلموں کی خدمت گزاری کرے اور ان کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئے۔ غیر مسلموں کے وفود اور سفارتوں کا استقبال کرے اور اپنی مسجد میں ایک غیر مسلم کی پھیلائی ہوئی گندگی کو اپنے برگزیدہ ہاتھوں سے صاف کرنے میں بھی دریغ نہ کرے کیا اس کی شان میں ایسا کہنا

جا سکتا ہے؟ (ایضاً ص ۱۷۷)

(۹) ایک مستشرق ڈاکٹر برنگھم' کے نزدیک اشاعت اسلام کے اسباب درج ذیل ہیں:۔

''مجھ کو کسی وقت بھی خیال نہ ہوا کہ اسلام کی ترقی تلوار کی مرہون منت ہے۔ نہیں بلکہ اسلام کی کامیابی رسول اللہ ﷺ کی سادہ و بے لوث زندگی' ایفائے عہد' اصحاب و پیروؤں کی غیر معمولی حمایت' توکل خدا اور ذاتی جرأت و استقلال سے وابستہ ہے''۔ (ایضاً ص ۶۲)

(۱۰) ایک اور مستشرق پروفیسر باسورتھ اسمتھ اپنی کتاب ''محمد اینڈ محمڈن ازم'' میں فساد فی الارض کے خاتمہ کے لیے اسلام اور بانی اسلام کے متعلق اپنے خیالات کو یوں قلمبند کرتے ہیں:۔

''وہ جس طرح ایک مذہب کے پیشوا تھے' اسی طرح ایک حکومت کے سب سے بڑے مدبر تھے۔ وہ قیصر اور پوپ کا مجموعہ تھے۔ ان کے پاس باڈی گارڈ نہ تھے۔ کوئی محل نہ تھا۔ تاہم ان کے ہاتھ میں ساری قوت تھی .... بلا شک حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہیں اگر پوچھا جائے کہ افریقہ بلکہ کل دنیا کو مسیحی مذہب نے زیادہ فائدہ پہنچایا یا اسلام نے؟ تو جواب میں اسلام ہی کہنا پڑے گا۔ اگر محمد ﷺ کو قریش ہجرت سے پہلے (خدانخواستہ) شہید کر ڈالتے۔ تو مشرق مغرب دونوں ناکارہ رہ جاتے۔ اگر آپ ﷺ نہ آتے تو دنیا کا ظلم بڑھتے بڑھتے اس کو تباہ کر دیتا۔ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو یورپ کے تاریک زمانے دو چند بلکہ سہ چند تاریک تر ہو جاتے۔ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو انسان ریگستانوں میں پڑے بھٹکتے پھرتے۔ جب میں آپ ﷺ کی جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ ﷺ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ اور آپ ﷺ کے تابعدار غلاموں نے' جن میں آپ ﷺ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی' کیا کیا کارنامے دکھائے تو مجھے آپ ﷺ سب سے برتر اور اپنی نظیر آپ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

(۱۱) اسلامی نقطہ نظر سے جنگ اور فتح کے نصب العین پر ایک انگریز مضمون نگار کیمرتین کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ یہ مضمون روزنامہ جنگ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا:۔

''پیروان اسلام نے صرف ایک صدی میں ایران' عراق' شام' فلسطین' مصر' مراکش' سپین اور سندھ فتح کر لیا تھا۔ اگر نصب العین کی بلندی اور مقصد کی درخشندگی' کمال قیادت کا معیار بن سکتی ہے تو پھر محمد ﷺ کے مقابلہ میں کسی اور رہنما کو قطعاً پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ﷺ ایک

عظیم مفکر بلند پایہ خطیب اور بے نظیر مقنن تھے۔ آپ ﷺ نے شہروں اور قلعوں کے ساتھ ساتھ کروڑوں دلوں کو بھی فتح کیا اور تقریباً بیس ممالک میں اسلامی بادشاہت قائم کی۔ لاؤ ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو جن سے انسانی عظمت کو ناپا جا سکتا ہے۔ اور پھر اس سوال کا جواب دو کہ کیا محمد ﷺ سے کوئی بڑا انسان ہو سکتا ہے۔

(۱۲) ایک ہندو مصنف ''جناب بی ایس رندھاوا (ہوشیار پور) پیغمبر اسلام پر اعتراض کرنے والوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

''بانیان مذاہب میں سے سب سے زیادہ ناانصافی اور ظلم اگر کسی پر کیا گیا ہے تو بانی اسلامؐ پر کیا گیا ہے اور متعصب مورخین نے کوشش کی کہ پیغمبر اسلام کو ایک خونخوار اور بے رحم انسان کی شکل میں پیش کیا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کو ان سے نفرت دلائی جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ پر تنقید کرنے والوں نے اسلامی تاریخ اور بانی اسلام ﷺ کی سیرت کا صحیح طور پر مطالعہ کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کہ بلکہ سنی سنائی اور بے بنیاد باتوں ہی کو سرمایہ بنا کر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اگر ایسے لوگ اسلامی روایات کو سمجھ لیتے اور سچائی کے اظہار کے لیے اپنے اندر کوئی جرأت وہمت پاتے تو یقیناً اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوتے''۔ (ایضاً ص ۳۷)

(۱۳) رانا بھگوان داس' رسول اللہ ﷺ کی بہترین سیاست کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں جن میں انہوں نے عظیم فاتحین کا تقابل بھی پیش کیا ہے۔

''بنی نوع انسان کے مسائل صلح و جنگ اور معاہدات امن کے علاوہ انسانی معاشرہ کی خوشحالی کا دارومدار فاتح کے تدبر پر ہے۔ تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں کہ فاتحین کی خون آشامی اور وحشت بربریت' بالادستی وبرتری' نیز عسکری قوت کے اندوہناک مظاہروں سے مفتوحہ علاقوں پر تسلط تو حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن تسخیر قلوب مفتوحین کے اقدام معجز نما کے بغیر اصولوں کی کامرانی اور مقاصد کی جاودانی ممکن نہیں ہے۔ بلاشک فاتح کی شان امتیازی' سطوت سیاسی اور شوکت اقتدار کے جابرانہ دبدبہ' سفاکانہ طریقے' لوٹ کھسوٹ اور خونریز فسادات سے حکمرانی کی جھوٹی عظمت کو برقرار تو رکھا جا سکتا ہے لیکن ظلم واستبداد سے پیدا شدہ جذبہ اشتعال اور نفرت وانتقام کی آتشیں چنگاریوں کو شعلہ بداماں ہونے سے نہیں روکا جا سکتا اور فاتحانہ سفاکی اور درندگی وبہیمت کی وجہ سے انتہائی قلیل عرصہ میں فاتحانہ جلال کے فلک بوس قصر زمین پر آ رہے ہیں۔ جب ہم

مشہور فاتحین کی فقید المثال فتح مندیوں اور فاتح اقوام کی کارفرمائیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقائق واشگاف ہوتے ہیں کہ فاتح میں شان رحمت کے مفقود ہونے اور کامران اقوام کی سفاکیوں کے باعث بہت جلد عظمت فتح کا پرچم پارہ پارہ ہو جاتا ہے اولاد آدم کے اولین عہد عظمت میں' اقوام مشرق کی داستان عروج وزوال کے مطالعہ سے واضح ہے کہ دارائے ایران کی عظیم کشور کشائیاں ہوں' سکندر اعظم کی ذی شان کامرانیاں ہوں یا فاتحین چین کی وسیع فتوحات ہوں۔ فارس روم کا جبر وتشدد ہو یا اہل چین اور آریائی قوموں کی استبدادیت ہو۔ اس نے فاتحین کے ایوانات عظمت و جلالت کو مسمار کر دیا ہے''۔

''لیگ آف نیشنز کے بعد عالمی جنگ کی غارت گری' انسانی حقوق کے چارٹر اور اس کے بعد ہمارے اس دور میں اقوام متحدہ کی موجودگی میں کوریا کی خونریزی' اسکندریہ پر بمباری' فلسطین میں اسرائیلی بہیمت' افریقہ میں الجزائر اور کانگو کی لرزہ خیز خون آشامیاں' کشمیر میں بھارت کا جبر واستبداد اس حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں کہ موجودہ دور کی طاقتور حکمران قومیں تعلیمات محمدیہ سے غافل ہیں اور اس غفلت کے باعث دنیا جہنم زار ہوتی جا رہی ہے مساعی امن کے باوصف امن ناپید ہو گیا ہے''۔

''بلاشک اگر دنیا کے حکمران فاتح مکہ کے مقدس درس عالی پر عمل پیرا ہوتے تو اولاد آدم کے لیے یہ دنیائے ارضی بہشت بریں ہو جاتی۔ حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ میں فاتحین عالم کو فقید المثال درس دے کر نوع انسان پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ اور آج بھی صرف یہی طریق محمدی امن عالم کا ضامن ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے قدیم ترین دشمنوں' قتل کی سازش کرنے والوں اور مدینہ طیبہ پر چڑھ کر آنے والوں کو معاف کر کے اہل مکہ کے دلوں کو مسخر کر لیا اور مفتوح قوم میں ذرا بھی جذبہ انتقام پیدا نہ ہو سکا۔ یہی اسوۂ حسنہ آج بھی دنیا کی طاقتور قوموں اور بااختیار حکمرانوں کے لیے معیار عمل ہے۔ (ایضاً ص ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶)

(۱۴) آخر میں ہم جارج برنارڈ شاہ کے اس تبصرہ پر اقتباسات کو ختم کرتے ہیں:۔

''آنے والے سو سال میں ہماری دنیا کا مذہب اسلام ہو گا۔ مگر یہ موجودہ زمانے کا اسلام نہ ہو گا۔ بلکہ وہ اسلام ہو گا جو عہد محمد رسول اللہ کے زمانے میں دلوں' دماغوں اور روحوں میں جاگزین تھا''۔ (ایضاً ص ۱۵۰)

انسان کامل

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اپنے مسلمان استاد سے کسی گفتگو کے دوران کہا کہ میں آپ کے پیغمبر ﷺ کو دنیا کا سب سے بڑا کامل انسان سمجھتا ہوں۔ استاد نے دریافت کیا کہ تم کیسے پیغمبر اسلام کو کامل ترین سمجھتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ مجھے آپ ﷺ کی زندگی میں بیک وقت اس قدر متضاد اور متنوع اوصاف نظر آئے جو کسی ایک انسان نے دنیا کی تاریخ میں یکجا کر کے نہیں دکھائے۔ مثلاً:۔

- ☆ بادشاہ ایسا کہ ایک پورا ملک اس کی مٹھی میں ہو اور بے بس ایسا کہ خود اپنے آپ کو بھی اپنے قبضے میں نہ جانتا ہو بلکہ اللہ کے قبضہ میں سمجھتا ہو۔
- ☆ دولت مند ایسا کہ خزانے کے خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اس کے دارالحکومت میں آرہے ہوں اور محتاج ایسا کہ مہینوں اس کے گھر چراغ نہ جلتا ہو اور کئی کئی وقت اس پر فاقے[1] سے گزر جاتے ہوں۔
- ☆ سپہ سالار ایسا کہ مٹھی بھر نہتے آدمیوں کو لے کر ہزاروں غرق آہن[2] فوجوں سے کامیاب لڑائی لڑا ہو۔
- ☆ صلح پسند ایسا کہ ہزاروں پر جوش جاں نثاروں کی ہمرکابی کے باوجود صلح[3] کے کاغذ پر بے چون و چرا دستخط کر دیتا ہو۔
- ☆ شجاع ایسا کہ ہزاروں کے مقابلے میں تن تنہا[4] کھڑا ہو اور نرم دل ایسا کہ انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے نہ بہایا ہو۔
- ☆ باتعلق ایسا کہ عرب کے ذرہ ذرہ کی اس کو فکر، بیوی بچوں کی اس کو فکر، غریب و مفلس کی اس کو فکر، خدا کو بھولی ہوئی دنیا کو سدھارنے کی اس کو فکر غرض سارے سنسار کی اس کو فکر ہو اور بے تعلق ایسا کہ اپنے خدا کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو اور اس کے سوا ہر چیز اس کے لیے بے معنی ہو۔

---

1. بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت کی طرف اشارہ ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ دو دو ماہ گزر جاتے ہمارے گھر میں چولہا نہ جلتا اور فقط دو کالی چیز کھجور اور پانی پر گزر اوقات ہوتی تھی۔
2. جنگ بدر احد کی طرف اشارہ ہے۔
3. صلح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے۔
4. جنگ حنین کا ایک منظر۔

☆ اس نے کبھی اپنی ذات کے لیے اپنے برا کہنے والوں سے بدلہ نہیں لیا اور اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کی اور ان کا بھلا چاہا لیکن خدا کے دشمنوں کو اس نے کبھی معاف نہ کیا۔ حق کا راستہ روکنے والوں کو ہمیشہ جہنم کی دھمکی دیتا اور عذاب الٰہی سے ڈراتا رہا۔

☆ عین اس وقت جب اس پر ایک تیغ زن سپاہی کا دھوکہ ہوتا ہو اور وہ ایک شب[1] زندہ دار زاہد کی صورت میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

☆ عین اس وقت جب اس پر کشور کشا فاتح[2] کا شبہ ہو وہ پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔

☆ عین اس وقت جب ہم اس کو شاہ عرب کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں وہ کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے چٹائی پر بیٹھا درویش نظر آتا ہے۔

☆ عین اس وقت جب اطراف عرب سے آ کر اس کے صحن مسجد میں مال و اسباب کا انبار لگا ہوتا ہے۔ اس کے گھر میں فاقہ کی تیاری ہو رہی ہے۔

☆ عین اس عہد میں جب لڑائیوں کے قیدی[3] مسلمانوں کے گھروں میں لونڈی غلام بن کر بھیجے جا رہے ہیں۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا ابنت رسول اللہ ﷺ اپنے ہاتھوں کے چھالے اور کندھوں کے نشان دکھا کر جو چکی پینے اور مشکیزہ بھر کر لانے کی وجہ سے پڑ گئے تھے۔ ایک غلام کی خواہش کرتی ہیں تو آپ ﷺ انہیں واپس موڑ دیتے ہیں۔

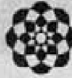
☆ عین اس وقت جب آدھا عرب آپ ﷺ کے زیر نگین آ چکا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ دربار نبوت میں حاضر ہو کر کاشانہ نبوت[4] کا جائزہ لیتے ہیں۔ آپ ﷺ ایک کھردری چٹائی پر آرام فرما رہے ہیں۔ جسم مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں اور دوسری طرف پانی کا مشکیزہ لٹک رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ حالت دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سبب دریافت ہوتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ''یا رسول اللہ ﷺ! اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ... ہوگا۔ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ ﷺ اس حالت میں ہیں''۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ''عمر! کیا

---

1. جنگ بدر کے موقع پر آپ نے ساری رات اللہ کے حضور دعا و استغفار اور تضرع میں گزار دی
2. عدی بن حاتم کے ایمان لانے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔
3. یہ قیدی فتح خیبر کے بعد آئے۔ 4. واقعہ ایلاء کے دوران جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے

تم اس بات پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت''۔

(محمد رسول اللہ ﷺ ص ۱۰۹، ۱۱۰۔ بحوالہ خطبات مدارس از سید سلیمان ندوی بعنوان ''جامعیت'')



تمت بالخیر

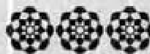
کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	پبلشر
1	قرآن کریم، فتح الحمید، مرآۃ القرآن، تفہیم القرآن، تفسیر شبیر احمد عثمانی، تفسیر مظہری، روح المعانی، تفسیر خازن، تفسیر کبیر		
2	بخاری شریف	امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ	
3	صحیح مسلم	امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیریؒ	
4	نسائی شریف	ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائیؒ	
5	ابوداؤد	سلیمان بن اشعث سجستانیؒ	
6	مشکوٰۃ شریف	ولی الدین محمد بن عبداللہؒ	
7	مسند احمد	امام احمد بن حنبلؒ	
8	تاریخ الامم والملوک (طبری)	حافظ ابن جریرؒ	
9	البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیرؒ	
10	سیرت ابن ہشامؒ		
11	کتاب الخراج	امام ابو یوسفؒ	
12	رحمۃ للعالمین (حصہ دوم)	قاضی سلیمان منصور پوریؒ	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	پبلشر
13	سیرۃ النبی (حصہ اول و پنجم)	شبلی نعمانیؒ	ناشران قرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور
14	الفاروق	شبلی نعمانیؒ	مدینہ پبلشنگ کمپنی بند روڈ کراچی
15	الجہاد فی الاسلام	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	اسلامک پبلیکیشنز لاہور
16	محسن انسانیت	نعیم صدیقیؒ	اسلامک پبلیکیشنز لاہور
17	رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی	ڈاکٹر حمید اللہ	
18	The Battle Fields of Prophet Mohammad	ڈاکٹر حمید اللہ (پی ایچ ڈی ڈی لٹ لندن)	حذیفہ پبلیکیشنز آرام باغ کراچی
19	رسول اللہ ﷺ میدانِ جہاد میں	احسان بی اے	پاک پبلشرز لمیٹڈ کراچی
20	مسلمانوں کا نظام حکمرانی (اردو ترجمہ)	ڈاکٹر حسن ابراہیم (پی ایچ ڈی ڈی لٹ لندن)	اشاعت لمیٹڈ کراچی
21	اسلام اور قانون جنگ و صلح	مجید خدوری (اردو ترجمہ غلام رسول مہر)	مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور
22	جہاد	بریگیڈیر گلزار احمد	مکتبہ المختار گلستان کالونی راولپنڈی
23	غزوات مقدس	مولانا عنایت اللہ وارثی	مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور
24	رہبر کامل	مولانا عبدالمجید سوہدروی	مسلمان کمپنی سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	پبلشر
25	ہسٹری آف یورپ (حصہ اول)	پروفیسر شمس الدین	نذر سنز' لاہور کراچی
26	تاریخ ملت (جلد ششم' حصہ دوم)	مفتی انتظام اللہ شہابی	ندوۃ المصنفین دہلی
27	ماہنامہ محدث (رسول مقبول نمبر)	چند متعلقہ مضامین	ماڈل ٹاؤن' لاہور
28	انسائیکلو پیڈیا (اردو)		فیروز سنز لمیٹڈ' لاہور
29	عالمی معلومات	زاہد حسین	فیروز سنز لمیٹڈ' لاہور
30	سرور کونین ﷺ اغیار کی نظر میں	بشیر احمد سعید	کتاب مرکز' بازار فاروق گنج' گوجرانوالہ
31	محمد رسول اللہ ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں	محمد حنیف یزدانی	مکتبہ نذیریہ' لاہور۔
32	انسان کامل	ڈاکٹر خالد علوی	یونیورسٹی بک ایجنسی

اور دیگر متفرق کتب



مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ کی دیگر تصنیفات

تیسیر القرآن (اردو) : سلفی منہج کے عین مطابق، منکرین حدیث اور دیگر عقائد باطلہ کا مکمل رد، اور تمام آیات کی صحاح ستہ کی صحیح احادیث کی روشنی میں تفسیر۔ (4 جلدیں)

مترادفات القرآن: مترادفات القرآن کے ذیلی فرق کو مستند کتب لغت اور قرآنی آیات سے واضح کیا گیا ہے۔اس موضوع پر قرآن کریم کی اردو میں پہلی لغت ہے۔

آئینہ پرویزیت: پرویزیت کے جواب میں ایک مدلل اور لاجواب کتاب ہے۔

شریعت وطریقت: تصوف کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے، نیز وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول کیا ہے؟ اور طریقت کا باطنی نظام کیا چیز ہے؟ اور کیا طریقت شریعت کے تابع ہے یا اس کے متوازی اور اس سے متصادم ایک الگ دین ہے؟

الشمس والقمر بحسبان: اس کتاب میں علم ہیئت، ہجری اور عیسوی تقویم میں دن معلوم کرنے کے طریقے اور 622ء (1ھ) سے لے کر 2522ء (1680ھ) تک کی تقابلی تقویم پیش کی گئی ہے۔

خلافت وجمہوریت: جمہوریت عصر حاضر کا سب سے بڑا بت ہے۔کتاب وسنت سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام اور جمہوریت دو متضاد چیزیں ہیں جن میں اتحاد ناممکن ہے۔

تجارت کے احکام ومسائل: لین دین کے معاملات میں کئی ایسے امور شامل ہو گئے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں اکل حلال کی اہمیت واضح کرنے کے بعد دور حاضر کے جدید معاشی مسائل پر کتاب وسنت کی روشنی میں محاکمہ کیا گیا ہے۔

عقل پرستی اور انکار معجزات: قرآن مجید میں مذکور معجزات کا عقل کی بنیاد پر رد کرنے والوں کی تاویلات اور ان کے عقائد پر بحث کی گئی ہے۔

عذاب قبر اور سماع موتیٰ: متعلقہ موضوع پر نہایت اہم اور معلوماتی کتاب ہے۔مختلف مکاتب فکر کے افکار ونظریات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

احکام ستر وحجاب: اس کتاب میں تہذیب حاضر کا پس منظر، ستر وحجاب کا فرق، چہرہ اور ہاتھوں کا پردہ اور مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات پر بحث کی گئی ہے۔

اسلام میں دولت کے مصارف: اس میں زائد از ضرورت دولت کی جائز اور ناجائز صورتیں نیز جاگیرداری کی کہاں تک گنجائش اور مزارعت کن صورتوں میں جائز ہے، کی تفصیل ہے۔

ناشر: مکتبۃ السلام سٹریٹ 20 وسن پورہ لاہور
فون: 7280943

www.ircpk.com

Designed & produced by: DARUSSALAM Ph: 042-7240024 - 7232400